فکر و تحقیق

داغ دہلوی نمبر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

فکر و تحقیق

سہ ماہی

جلد ۹ — شمارہ ۴

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۶

مدیر

رشمی چودھری

مشیر

مخمور سعیدی

معاون مدیر

ڈاکٹر رئیس احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language
Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. IX October,November, December 2006 Issue-4

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا علمی و تحقیقی جریدہ

فکر و تحقیق

داغ دہلوی نمبر

اس شمارے کی قیمت : 25روپے
زرِ سالانہ : 100روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے : 200روپے

طابع اور ناشر : ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی
فون:26103938, 26103381

مدیر : رشمی چودھری
مشیر : مخمور سعیدی
معاون مدیر : ڈاکٹر رئیس احمد
کمپوزنگ : بہلول احمد، قومی اردو کونسل

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سجے۔ کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی110006 میں چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

ہماری چند اہم مطبوعات (تاریخ)

کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
اتحاد سے انتشار کی طرف: کلونیل اودھ کے قصبات (H.B.&P.B)	مشیر الحسن/مسعود الحق	460.00
ارتھ شاستر	چانکیہ/شان الحق	109.00
اکبر سے اورنگ زیب تک (دوسری طباعت)	ڈبلیو ایچ مورلینڈ/جمال محمد صدیقی	93.00
انقلاب فرانس	جے. ایم. تھامسن/محمود حسین	140.00
انقلاب 1857 (تیسری طباعت)	مرتب: پی. سی. جوشی	75.00
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا (دوسری طباعت)	محمد اطہر علی/امین الدین	126.00
ایک معلم کی زندگی (حصہ اول تا دوم)	عبدالغفار مدھولی	252.00
آثار الصنادید جلد۔ 1 تا 3 (P.B.)	خلیق انجم، مرتبہ	482.00
آثار الصنادید جلد۔ 1 تا 3 (H.B.)	خلیق انجم، مرتبہ	717.00
آزادی	جان اسٹورٹ مل/سعید انصاری	52.00
تاریخ آصفی	مرزا ابوطالب/ثروت علی	58.00
تاریخ تحریک آزادی ہند (حصہ اول تا چہارم)	تاراچند/محمد عدیل عباسی، غلام ربانی تاباں، ہاشم قدوائی	794.00
تاریخ تعلیم ہند	جے. پی. نائک/سید نور اللہ	111.00
تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب	72.00
تاریخ ٹیپو سلطان	محب الحسن/حامد اللہ افسر	120.00
تاریخ جہانگیر (دوسری طباعت)	بینی پرشاد/رحم علی الہاشمی	90.00
تاریخ شاہجہاں (دوسری طباعت)	بناری پرشاد سکسینہ/سید اعجاز حسین	109.00
تحریک خلافت (دوسری طباعت)	قاضی محمد عدیل عباسی	65.00
تذکرۃ البلاد و الحکام	میر حسن علی کرمانی/شیخ احمد شریف شفیع	126.00
تزک جہانگیری (جلد اول)	ہنری بیورج/اقبال حسین	165.00
جامع تاریخ ہند	محمد حبیب/خلیق احمد نظامی	306.00
جامعہ کی کہانی	عبدالغفار مدھولی	140.00
جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی	مشیر الحسن/مسعود الحق	114.00
جدید ہندوستان 1885-1947	سمت سرکار/مسعود ہاشمی	314.00

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت، تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

ہماری بات

داغ اپنے زمانے کے نہ صرف مقبول ترین شاعر تھے بلکہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک دبستاں کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ غالب نے کہا ہے:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

داغ کا نالۂ شوق ان کی شاعری تھی جس کا شہرہ ہندوستان بھر میں ہوا اور ملک کے کونے کونے سے اس فن کے طلبگاروں نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد، جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے، پانچ ہزار تک بتائی گئی ہے۔ ان کے ایک ممتاز شاگرد نوح ناروی جو داغ کی وفات کے بعد ان کے جانشین بھی کہلائے، اس تعداد کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہیں، ان کی معلومات کی رو سے، ان کے استاد کے شاگردوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ یہ تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی استادی کے مرتبے پر فائز ہوئے اور ان سے بھی فنِ شعر کے نو آموزوں میں کسبِ فیض کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال اور سیماب جیسے شعرا کو بھی داغ سے نسبتِ تلمذ رہی۔ ان کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ کہا ہے اس میں انھیں جہان آباد (دلی) کا آخری شاعر قرار دیا ہے:

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اور سچ بھی ہے کہ ان کے بعد دلی کی سرزمین نے ایسا کوئی شاعر پیدا نہیں کیا جو ان کی خالی جگہ پر کر سکتا۔

داغ شاعری کی ان تمام اصناف پر قادر تھے، جو ان کے زمانے میں مروج تھیں۔ دلی کی تباہی پر انھوں نے شہر آشوب بھی لکھے، اپنے سرپرستوں کی شان میں قصیدے بھی کہے، تاریخی قطعات بھی ان سے یادگار ہیں، رباعیاں بھی ان کے ذخیرۂ کلام میں موجود ہیں لیکن ان کی پہلی پہچان بنی ان کی غزل اور

دوسری حیثیت ملی ان کی مثنوی کو جو "فریادِ داغ" کے تاریخی نام سے مشہور و مقبول ہوئی اور کلکتے کی منی بائی حجاب سے ان کے معاشقے کی یادگار ہے۔

داغ کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت جذبے کی سچائی اور اظہار کی بے تکلفی ہے۔ ان کی غزل فکری عنصر سے یکسر خالی نہیں، کم کم ہی سہی لیکن ان کی سوچ انھیں زندگی کے ان مظاہر تک لے جاتی ہے جن کا سامنا ایک فکرمند انسان ہی کر سکتا ہے۔ یہ فکرمندی ان کے ہاں مشاہدے کی راہ سے آئی۔ لڑکپن سے عمر کے آخری مراحل تک انھوں نے ایسے بہت سے نشیب و فراز دیکھے جو کسی بھی زندہ انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھے۔ داغ شاید طبعاً عافیت پسند اور آرام طلب تھے، اس لیے دیر تک یا دور تک گرد و پیش کی ناہمواریوں کا مشاہدہ کر سکنے کی سکت ان میں نہیں تھی، گھبرا کر جلد ہی وہ خارجی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے گوشۂ عافیت میں سمٹ آتے تھے۔

داغ کا گوشۂ عافیت زنانِ بازاری کی صحبتیں تھیں۔ ان صحبتوں میں وہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر کے حدیثِ لب و رخسار بیان کرنے بیٹھ جاتے اور اس بیان میں ایسی ایسی ندرتیں پیدا کرتے کہ سننے والے جھوم اٹھیں۔ دراصل جب انھوں نے شعور کی آنکھیں کھولیں وہ ہمارے تہذیبی زوال کا دور تھا، ملک کا سیاسی اور سماجی شیرازہ بکھر چکا تھا، مقامی طاقتیں باہم دست و گریباں تھیں جس کا فائدہ اٹھا کر ایک بیرونی طاقت ہر شعبۂ حیات پر اپنا اثر و اقتدار قائم کر چکی تھی۔ اس اثر و اقتدار کو آخری بار 1857 میں جنرل بخت خاں نے للکارا تھا اور بوڑھے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کی ترغیب دی تھی مگر یہ آخری کوشش بھی شکست انجام ہوئی اور بالآخر پورے ہندوستان پر غیر ملکی تسلط قائم ہو گیا۔ ہندوستان کی یہ سپر اندازی صرف سیاسی نہیں تھی، اس کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے اور دھیرے دھیرے پورا معاشرہ نجی عافیت اور آرام کے ان گوشوں کی تلاش میں منہمک ہو گیا جو اسے میسّر آ سکتے تھے — داغ اس معاشرے کے ایک نمائندہ فرد تھے۔ ان کی اور ان کی شاعری کی اس معاشرے نے جو پذیرائی کی اس کی وجہ یہی تھی۔ جس دور میں یہ معاشرہ زندہ تھا اس کے عمومی ذہنی میلانات اور ذوقی

ترجیحات کو سمجھنے میں داغ کی شاعری ہماری مدد کرسکتی ہے۔(اسی دور میں سرسید اور حالی بھی پیدا ہوئے مگر وہ بیرون دہلی کے تھے، اس جاگیردارانہ نظام کا حصہ نہیں تھے جس کی نمائندگی داغ کرتے ہیں، اسی لیے انھیں حالات کو اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور انھوں نے انھیں ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی) جذبے کی سچائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی بے تکلفی اور زبان کی سادگی اور سلاست، ایسی سادگی اور سلاست جیسے کسی خوش خرام ندی کا بہاؤ، داغ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے جس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

مثنوی ''فریادداغ'' بھی، جیسا کہ اوپر کہا گیا، داغ کے عاشقانہ مزاج ہی کی ودیعت ہے اور کلکتے کی ایک ڈیرے دار طوائف سے ان کے معاشقے کی روداد پر مبنی ہے۔اردو میں سیکڑوں مثنویاں کہی گئی ہیں اور ان میں بعض مثنویوں کو شہرت و مقبولیت بھی ملی ہے۔میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اور دیاشنکر نسیم کی گلزار نسیم تو اردو ادب کے ہر طالب علم نے سبقاً سبقاً بھی پڑھی ہیں۔لیکن ہماری اکثر مثنویاں عام انسانوں سے سروکار نہیں رکھتیں۔اکثر مثنویوں کا ماحول یا تو ماورائی ہے، ان میں خیالی باتیں کہی گئی ہیں یا پھر ان میں شہزادوں اور شہزادیوں کی جھوٹی سچی داستانیں بیان ہوئی ہیں۔بیشک یہ داستانیں دلچسپ ہیں اور ان میں ان ادوار کی مجلسی زندگی کی عمدہ تصویر کشی بھی کی گئی ہے، جن ادوار میں یہ کہی گئیں ہیں، اسی لیے ہم انھیں آج بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں لیکن اگر ہم ان میں اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی تلاش کریں تو شاید ہمیں مایوسی ہوگی۔''فریاد داغ'' کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ایسے کرداروں کی داستانِ معاشقہ ہے جو اس زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور اسی فضا میں سانس لیتے ہیں جس فضا میں آپ اور ہم زندہ ہیں۔ یہ داغ کا کمال ہے کہ انھوں نے اپنی اس سرگزشتِ عشق کو دیوؤں اور پریوں یا شہزادوں اور شہزادیوں کی قیاسی کہانیوں سے زیادہ دلچسپ بنادیا ہے۔شاید اس کے لیے انھیں کوئی شعوری کوشش بھی نہ کرنی پڑی ہو کہ یہ ان کے دل کی آواز تھی اور اقبال نے کہا ہے:

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

داغ کی شاعری کی وہ شہرت اور مقبولیت آج نہیں ہے جو ان کی زندگی میں تھی کیونکہ آج وہ لوگ اس دنیا میں نہیں جو ان کے مخاطب تھے لیکن ان کی شاعرانہ اہمیت اور ان کی شاعری کی فنی قدر و قیمت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ وہ ان معنوں میں بڑے شاعر نہیں ہیں، جن معنوں میں مثال کے طور پر ہم میر، غالب یا اقبال کو بڑا شاعر کہتے ہیں لیکن اردو کے اہم شاعروں میں ہمیشہ ان کا شمار ہوگا اور یہ اعزاز بھی کچھ کم نہیں ہے۔

"فکر و تحقیق" کا زیر نظر شمارہ داغ کی پیدائش کے سو سال مکمل ہو جانے کے بعد انھیں خراج عقیدت بھی ہے اور ان کے فکر و فن کی تفہیم و تحسین کی ایک تازہ کوشش بھی۔ اس خصوصی اشاعت میں، جس کی ضخامت عام شماروں سے تقریباً ڈیڑھ گنی ہے، جہاں ایسے مضامین شامل ہیں جو داغ کی شخصیت، شاعری اور ان کے سوانحی کوائف پر نئی روشنی ڈالتے ہیں وہیں کچھ مضامین ان کے ان شاگردوں کا تعارف کراتے ہیں جنھیں اپنے استاد کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ ہم ان تمام فاضل مضمون نگاروں کے تہ دل سے شکرگزار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر مضامین لکھنے کی زحمت کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے نمبر کی ترتیب کے دوران میں مفید مشوروں سے نوازا اور اپنا قیمتی مضمون بھی مرحمت فرمایا۔

(ادارہ)

شمس الرحمٰن فاروقی

داغ دہلوی

داغ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں عام ہیں، اور ان کا چراغ بھی آج ذرا مدھم ہی جلتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم داغ پر نظر ثانی کریں۔ کیا عجب کہ آج کی یہ فی البدیہہ گفتگو، جس کے پیچھے داغ کے بارے میں کچھ غور وفکر بھی ہے، داغ پر نظر ثانی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

داغ کے بارے میں مشہور بات تو یہ ہے کہ وہ بہت خوش قسمت تھے۔ نظام حیدرآباد نے ان کا دامن دولت اور عزت سے بھر دیا۔ یہ بات صحیح ہے بھی اور نہیں بھی۔ حیدرآباد پہنچنے کے پہلے داغ پر خاصی مالی تنگی تھی۔ اور 1888 میں جب وہ پہلی بار حیدرآباد گئے تو سال سوا سال ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بے نیل مرام واپس ہوئے، کہ کامیابی کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تھی۔

دوسری بار 1890 میں بھی جب وہ وارد حیدرآباد ہوئے تو مہینوں تک التفات سلطانی کی راہ دیکھتے رہے۔ پھر اوائل 1891 میں رات کو نو ساڑھے نو بجے چوبدار نے آکر ایک سربمہر لفافہ دربار کا فرستادہ پیش کیا۔ لفافہ کھولا تو اس میں نظام کی غزل تھی، اور یہ حکم کہ اصلاح کے ساتھ واپس کرو۔ کیوں کہ وہاں تو یہ تھا کہ غزل بھیجی اور فوراً اصلاح کرو، اور اصلاح بھی ایسی جو مطلوب طبع ہو۔ خیر، داغ کے سوکھے دھانوں پر پانی پڑا۔ انھوں نے بڑا شکر ادا کیا، نظام کا بھی اور اللہ کا بھی۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کو تنخواہ وار بننے میں بہت دن لگے۔ ساڑھے چار سو روپے ماہوار مشاہرہ بالآخر نظام نے مقرر کیا۔

اواخر 1891 سے البتہ داغ کے عروج اور قدر دانی کا آغاز ہوتا ہے۔ نظام نے تنخواہ کے ماہانہ ہزار روپے کر دیے اور پھر یہ کہا کہ 1889 سے لے کر اب تک کی ہزار روپے تمھارے محسوب کیے گئے ہیں اور وہ سب تم کو ادا کیے جائیں گے۔ پھر تنخواہ بڑھ کر سترہ سو روپے ہوئی۔ 1893 کے آخر میں خطاب خانی و بہادری ملا۔ ناظم یار جنگ کہلائے، پھر دبیر الدولہ، فصیح الملک، بلبل ہندوستاں،

جہاں استاد کے القاب سے مفتخر کیے گئے۔

اب داغ واقعی بڑی شان سے رہتے تھے۔ ان کا حال لکھا ہے ایک صاحب نے کہ وہ نظام کے کیمپ میں، داغ سے ملنے گئے۔ ظاہر ہے کہ بڑا کیمپ ہے، بادشاہ کا معاملہ ہے۔ اس میں جگہ جگہ پہرے ہیں، جگہ جگہ خیمے لگے ہیں، جگہ جگہ سوار ہیں، روک ٹوک ہے۔ سپاہی ہر جگہ پوچھتے ہیں، کون ہو، کہاں جا رہے ہو۔ پوچھتے پوچھتے وہ ایک بہت بڑے خیمے میں لے جائے گئے۔ معلوم ہوا وہ ante room یا waiting room قسم کا خیمہ ہے۔ نہایت آراستہ پیراستہ۔ ہر طرف قالین، صوفے، جھاڑ فانوس۔ وہاں بٹھائے گئے۔ کچھ دیر بعد داغ سے ملاقات ہوئی۔ بہت ہی خوبصورت آدمی تھے، سیاہ رنگ کے تھے، لیکن بے انتہا دلکش چہرہ۔ چہرے پر وجاہت بھی بہت تھی۔ ان کے ملاقاتی نے لکھا ہے جیسے عرب سے کوئی شخص چلا آ رہا ہے۔

بڑا ہی وجیہ چہرہ، بڑا زبردست۔ تو سنہ 1905 میں انتقال ہوا ان کا۔ امیر مینائی کے آخری زمانے میں امیر مینائی کو حیدرآباد بلوایا انھوں نے، امیر مینائی پہنچے وہاں، مگر بیمار ہی بیمار رہے۔ ایسا اتفاق رہا۔ امیر مینائی سے ان کی بہت دوستی تھی۔ امیر مینائی کے علاوہ جلال اور حالی سے بھی بہت دوستانہ تھا۔ خیر امیر وہیں آ کے مر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔ لیکن داغ پانچ سال اور جیے۔

داغ کا معاملہ وہ ہے جس کو اردو میں کہتے ہیں "بد اچھا بدنام برا" اور انگریزی میں کہتے ہیں He has had a bad press. کہ ان کے ساتھ شروع سے ہی ناانصافی ہم لوگ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ تو وجہ یہ بھی ہوئی کہ ان کے استاد تھے ذوق، اور ذوق کا بھی کچھ اس عہد کے شروع سے ہی ستارہ گردش ہی میں رہا۔ اور ایک بات غور طلب یہ بھی ہے کہ جو پہلے شاعر تھے پہلے زمانے کے یعنی متقدمین اور متاخرین، وہ تو عام طور پر بڑے شاعر مانے گئے۔ وہ تو دور تھے ہم سے، لہٰذا دوری کے رومانی فائدے کی وجہ سے ہم نے ان کو بڑا شاعر مان لیا، جیسے بھی مانا، لیکن مان لیا۔ لیکن جو سامنے کے شاعر تھے، جنھیں نئے زمانے کے لوگوں نے دیکھا تھا، ان کے ساتھ قدامت کا رومان بھی نہ تھا۔ مثلاً داغ، امیر، جلال وغیرہ پر نئے نقادوں نے بڑی سخت پابندیاں رکھیں۔ وہ نئے خیالات کے شاعر ہیں

کہ نہیں، اور نئے سوالات کو سلجھانے میں ہمارے معاون ہیں کہ نہیں، وغیرہ۔ دیکھا گیا کہ یہ لوگ تو وہی گل وبلبل، شراب وساقی، قفس وصیاد کی بات کر رہے ہیں۔ لہٰذا فیصلہ یہ دیا گیا کہ یہ لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں۔

اور داغ کو تو ان کی غیر معمولی مقبولیت نے بھی بہت نقصان پہنچایا۔ سارے ملک میں وہ مقبول تھے اور ان کے شاگرد گیارہ سو کے قریب تھے، جہاں تک کہ لوگ بتاتے ہیں۔ یہ خیال اس زمانے میں زور پکڑ رہا تھا کہ عوامی مقبولیت کے معنی ہیں شاعر کا پست ہونا، اور کم تر درجے کے لوگوں کے ہی لیے مناسب ہونا۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ داغ بہت حسن پرست آدمی ہیں، بہت عیاش آدمی ہیں۔ چنانچہ نیاز فتح پوری نے لکھا کہ نوجوانی کا زمانہ ان کا قلعے میں گزرا، اور وہ وہاں جلد جوان بھی ہو گئے۔ بقول نیاز قلعے کا ماحول تو محض عیاشی اور رندی واوباشی کا ماحول تھا۔ داغ نے جوانی کی ہوس کاریاں بھی شروع کر دیں، اور عشق کی جو کسک ہونا چاہیے وہ ان کو پہنچی ہی نہیں۔ تو ان کا سارا کلام محض لفظی کارروائی ہے۔ اس میں کوئی سچائی اور گہرائی نہیں۔ چکبست نے لکھا کہ ارباب نشاط کے پیغمبر یعنی طوائفوں کے پیغمبر ہی کہے جا سکتے ہیں داغ، اور اس وقت سے یہی بات عام طور پر کہی جاتی ہے۔ آج بھی یہی کہا جاتا ہے۔ داغ کے بارے میں بات کریں گے تو پہلا جملہ یہی کہیں گے کہ داغ کا کلام طوائفیں گاتی ہیں۔ لیکن آپ یہ غور کریں اگر کسی شخص کا کلام مقبول ہے کسی طبقے میں، تو اس سے اس کے کلام کا عامیانہ پن ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بات ان کے زمانے میں تھی ضرور کہ بس داغ کا کلام مقبول تھا، تو سب ہی لوگ داغ کا کلام پڑھتے تھے۔ تیسری اور چوتھی دہائی کی تنقید نے لیکن یہ ایک فرضی خیال مقرر کر لیا کہ شاعر کو چاہیے کہ وہ باطنی اور داخلی حالات بیان کرے وہی کہے جو اس پر گزرتی ہے، اور عشق کی گہرائی، سنجیدگی اور سوز، درد اور جلن کا بیان کرے۔ داغ کی زندگی کے حالات کی روشنی میں نیاز وغیرہ نے یہ خیال عام کیا وہ محض چلبلے اور کھلنڈرے شاعر ہیں۔ سچ پوچھیے تو چلبلا اور کھلنڈرا ہونا کوئی گندی بات نہیں، لیکن ہمارے بزرگ نقادوں نے، مثلاً حسرت موہانی نے دعویٰ کیا کہ غزل کے شاعر کو "غیر سنجیدگی" سے

پرہیز کرنا چاہیے۔

اور جو داغ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بہت سے بہت یہ کہا کہ فصاحت بہت ہے ان کے کلام میں، زبان بڑی اچھی لکھتے ہیں، با محاورہ لکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صرف ایک جملہ لکھا ہے۔ انھوں نے جو داغ کا ایک انتخاب چھاپا تھا 1946 میں، اس میں صرف یہ لکھا کہ داغ محاورہ یوں لکھ دیتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ محاورہ لکھ گیا ہے، یعنی اتنی بے ساختگی ہے محاورہ لکھنے میں۔ لیکن اور کوئی خوبی داغ کی انھوں نے نہیں بتائی۔ جب کہ غالب جیسے شخص کو داغ سے بے انتہا محبت تھی، غالب کو داغ کا کلام بہت پسند تھا۔ ذوق کے مرنے کے بعد، ذوق مرے ہیں 1854 میں، اس وقت سے لے کر جب تک داغ دلی میں رہے، وہ غالب کے یہاں آیا جایا کرتے تھے اور غالب ہمیشہ ان سے اپنی غزلوں پہ غزلیں کہلاتے تھے کہ اس پر غزل کہہ کے لا بھائی۔ تو بہت سی غزلیں، نمایاں ہو گئیں/ پنہاں ہوگئیں، یار ہوتا / انتظار ہوتا، یہ سب غزلیں غالب کی زمینوں میں داغ نے کہی ہیں اور غالب نے کہلائیں ان سے۔ پھر رام پور کے نواب سے جب تعلق تھا داغ کا تو داغ نے غالب کی بڑی سفارشیں بھی کی ہیں اور بعض مشکلوں کو ان کی حل بھی کیا ہے۔ تو اب سوچیے کہ غالب ایسا آدمی جو اتنی قدر کر رہا ہے داغ کی تو ظاہر ہے بے وجہ نہ رہا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ہم لوگوں نے بھلا دیا اور یہ گمان کر لیا کہ داغ کی شاعری محض سطحی اور اوپر ہی اوپر کی شاعری ہے۔ محض چوما چاٹی، کھلواڑ ہے۔ اس میں بہت ہوا تو محاورہ ہوگا، فصاحت ہوگی، وغیرہ۔

یہ ایک تصور ہے جو ان دنوں عام ہو گیا ہے۔ مثلاً اس وقت داغ کا کوئی کلیات بازار میں نہیں ہے۔ اور دیوان بھی، جو ان کے زمانے میں چھپے تھے الگ الگ کر کے، اب وہ بھی نہیں ملتے۔ صرف "گلزار داغ" پاکستان میں چھپا تھا، وہ بھی اب out of print ہے۔ آج کسی کے پاس شاید ہی داغ کے چاروں دیوان ہوں گے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ داغ کی شاعری سنجیدہ مطالعے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن فن شعر میں ان کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پہلی بات نظر آتی ہے کہ وہ شاعری کے بارے میں بے انتہا سنجیدہ تھے۔ یہ محض ایک کتھا ہے کہ وہ feeble minded تھے، کھلواڑ کرتے تھے یا بیٹھے

بیٹھے ٹھلا شعر کہتے گئے ہیں جن میں کبھی معشوق کو چٹکی لے لی، کبھی رنڈی کو جان من کہہ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ شاعری کے فن کے بارے میں بڑا سنجیدہ رویہ رکھتے تھے۔

داغ نے اپنے شاگردوں کے لیے جو نظم لکھی ہے "پند نامہ" اس سے ان کا صحیح مزاج معلوم ہوتا ہے۔ چاہے آپ ان کے خیالات سے اتفاق نہ کریں۔

مثلاً یہ کہ دیکھو بھائی محاورے کو مقدم رکھو استعارے پر۔ یہ نہیں کہ استعارے کی خاطر محاورے کو بگاڑ دو۔ یا حرفوں کو دباؤ مت۔ یا اس طرح کی بہت سی باتیں انھوں نے لکھیں۔ لیکن بنیادی بات یہ کہ ان باتوں میں ان کے زمانے کی شاعری کے اصول سب بیان کر دیے گئے۔ ان سے آپ متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ سب سنجیدہ طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جوش صاحب کا "پند نامہ" ہے مجاز پر۔ اس کو پڑھیے، فضول لفاظی ہے اور اس میں کچھ نہیں۔

ہاں سنبھل کر لطافتوں کو برت
ٹوٹ جائے کہیں نہ کوئی پرت

بے شک شعر اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ہے کیا؟ شاعری کی لطافت سے کیا مطلب ہے؟ اور لطافتوں کی پرتیں کیا ہوتی ہیں۔ یہ پرت کیسے ٹوٹ جاتی ہے؟ شاعر کے لیے کوئی عملی نصیحت نہیں، محض لفاظی ہے۔ ہاں شراب پینے کے بارے میں نصیحت ہے کہ دن میں نہ پیو، رات کو پیو۔ رات بہتر ہے دن سے۔

دن بہادر کا بان بیر کی رتھ
رات چمپا کلی انگوٹھی نتھ

یہ شعر اور بھی مزیدار ہے۔ لیکن اس سے دن یا رات کے تقابلی مطالعے کا کون سا حق ادا ہوتا ہے؟ لیکن جوش صاحب کے پند نامے کی اتنی شہرت ہوئی، اور داغ کا جو "پند نامہ" ہے اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ حالانکہ داغ کے "پند نامہ" میں سنجیدہ باتیں ہیں، شاعری کی باتیں ہیں۔ امیر سے ان کی بہت دوستی تھی۔ اگر امیر اور داغ کی خط و کتابت آپ پڑھیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ایسے ایسے خط لکھے ہیں

امیر نے کہ مثلاً آپ کی غزل پڑھی، بہت اچھی لگی۔ مگر معلوم ہوتا ہے دکن میں جا کر آپ کی زبان خراب ہوگئی۔ فلاں فلاں لفظ غلط لکھا ہے آپ نے، یا فلاں فقرہ خلاف محاورہ ہے۔ کئی شعروں میں تو امیر نے بے محابا اعتراض کیے ہیں۔ آپ نے بالکل غلط لکھا ہے، صحیح نہیں ہے، مناسب نہیں ہے۔ اور داغ نے جواب دیا ہے بہت ہی مہذب طریقے سے۔ دونوں ہم عمر تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ داغ کی پیدائش 1831 کی ہے، امیر کی پیدائش 1828 کی۔ دونوں غالب کے ماننے والوں میں تھے۔ غالب ان کے ممدوح، وہ غالب کے ممدوح۔ تو داغ نے جواب لکھا ہے، بڑی سنجیدگی سے جواب لکھا ہے کہ آپ نے صحیح فرمایا ہے۔ میں آپ کی بات تسلیم کرتا ہوں ایک آدھ جگہ جواب دیا ہے کہ ایسے نہیں ویسے بھی درست ہے۔ لیکن انھوں نے پتھر نہیں مارا ہے، نہ برا مانا ہے۔

لہٰذا شعر کے فن کے بارے میں داغ اور کچھ بھی ہوں یا نہ ہوں، لیکن وہ سنجیدہ شاعر ضرور تھے اور یہ کہنا کہ وہ کھلنڈرے، بچکانہ قسم کے شاعر تھے، درست نہیں۔ مجھ سے کبھی کبھی لوگ پوچھتے ہیں، خاص کر نئے لوگ، کہ کیا پڑھوں شاعری سیکھنے کے لیے۔ تو جہاں میں اور شاعروں کا نام لیتا ہوں ان میں سب سے پہلے داغ کا نام لیتا ہوں۔ بعض لوگ حیرت بھی کرتے ہیں کہ داغ کا کلام کیوں پڑھواتے ہو۔ اس میں بھلا کیا ہوگا؟ تو میں ان کو بتاتا ہوں کہ اس میں بہت کچھ ہے۔

یعنی ایک طرح سے داغ کو آپ Poet's Poet کہہ سکتے ہیں کہ ہر طرح کی شاعری ان کے یہاں موجود ہے۔ وہ فارسی آمیز شاعری جو غالب سے منسوب ہے، وہ جس میں کہ خیالات کی بڑی پیچیدگی ہے، محاورے کی شاعری، عشق کے تجربات کی شاعری، گہری شاعری زمانے کے حالات پر، انسانی تصورات پر شاعری۔ تو، ایسا نہیں کہ داغ کوئی معمولی شاعر تھے۔ داغ کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی، جیسا کہ میں نے عرض کیا اس لیے ہوئی کہ ایک تو فیشن بدل گیا اور لوگوں نے گمان کیا کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو دل سے نکالی جائے اور دل پر رکھی جائے۔ از دل خیزد بر دل ریزد۔ اور دل سے کیا مراد ہے، کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے یہ کہ ہم لوگوں کے زمانے میں Biography اور شاعری میں فرق کرنا لوگوں نے چھوڑ دیا۔ جیسے میر نے کتنے لوگوں سے عشق کیے؟ غالب نے کیا کیا بدمعاشیاں

کیں؟ ان باتوں کو شاعری کی تحسین قدر کے لیے، یا شاعری کو سمجھنے کے لیے، ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن یہ اصول پرانے کلاسیکی ادبی سماج میں رائج نہ تھا۔

ہم پرانے زمانے کے شعرا کو اس بات پر دھیان دیتے نہیں دیکھتے کہ فلاں کا Character کیسا ہے؟ یا کیسا رہا ہوگا۔ غالب شراب پیتے ہوں گے، جوا کھیلتے ہوں گے۔ میر سنی سے شیعہ ہو گئے، ہو گئے ہوں گے، اپنا کیا جاتا ہے؟ انھوں نے کیا کیا کیا ہوگا؟ بڑھاپے میں شادی کی۔ کی ہوگی۔ ان چیزوں سے ہم ان کی شاعری کو judge نہیں کر سکتے، اور نہ ہی کلاسیکی عہد میں ان چیزوں کو شاعر کی خوبی یا خرابی کا معیار قرار دیا جاتا تھا۔

ہمارے زمانے کے شعرا کے ساتھ یہ ہو گیا ہے کہ ہم یہ سوال ضرور پوچھتے ہیں۔ شعرا کی شاعری اور ان کی زندگی میں کوئی کیا Paralellism ہے؟ شاعری اور سوانح میں ربط ہے کہ نہیں، کوئی تعلق ہے کہ نہیں؟ ان کی شاعری ان کی زندگی کو Reflect کرتی ہے کہ نہیں؟ اگر نہیں کرتی تو ہم اسے برا جانتے ہیں۔ چنانچہ داغ کے یہاں دیکھا گیا کہ حجاب سے ان کا رشتہ یوں تھا، فلاں رنڈی سے ان کا یہ تعلق تھا، فلاں کو یہ گھر میں ڈالنے کو تیار تھے، وغیرہ۔ بس ہم چلا اٹھے ارے یہ صاحب شاعری نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کا تو کردار بہت برا ہے، لہٰذا شاعری بھی بہت بری ہوگی۔ تو اس طرح کے تصورات کی بنا پر داغ کے ساتھ بہت ناانصافی ہوئی۔

دو چار باتیں جو داغ کے بارے میں بنیادی طور پر کہی جاتی ہیں، جیسے کہ داغ کا مشہور شعر ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

یا یہ کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس طرح کے شعر اکثر لوگوں کو یاد ہیں۔ داغ کا Image ہی یہ Image ہے کہ وہ زبان کے

شاعر ہیں، فصیح شاعر ہیں اور چلبلے شاعر ہیں، کھلواڑ والے شاعر ہیں، عورتوں سے چہلیں کرتے ہیں۔ لیکن اور طرح کے شعر جو داغ نے اپنے بارے میں کہے ہیں، وہ ہم لوگ نہیں پڑھتے کیونکہ وہ ہمیں ان کے image کے بارے میں کچھ ایسا تصور دیتے ہیں جو ہمارے لیے unacceptable ہو جاتا ہے کہ ارے داغ ایسا بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

اے داغ روشنی ہے خدا داد طبع میں
بجھتے نہیں ہیں میرے چراغ سخن کے پھول

''پھول'' کے معنی ''چنگاری'' کے ہیں، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ چراغ کو بھی پھول کہتے ہیں اور پھول کو بھی چراغ کہتے ہیں۔ سخن کو شمع کہا جاتا ہے۔ روشنی طبع، ایک مشہور اصطلاح ہے۔ ان سب لفظوں کی مناسبت سے وہ شخص شعر کہتا ہے اور پھر لفظ ''داغ'' لاتا ہے جو تخلص بھی ہے اور با معنی بھی، کہ داغ خود بھی روشن ہوتا ہے۔ داغ کو بھی تشبیہ دیتے ہیں پھول سے، چراغ سے۔ اب یہ شعر میں نے کبھی بھی نہیں سنا کسی کی زبان سے کہ داغ کا یہ شعر بھی ہے۔ یہ شعر ضرور سنا ہے کہ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ کیونکہ ہم نے ایک image بنالی ہے کہ داغ محض چلبلے الفاظ اور محاورے والا شاعر ہے۔

اب میں آپ کو کچھ شعر اور سناتا ہوں، پہچانیے کس کے ہیں:

اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں

صیاد پر ہوں بار تو ہوں باغباں کو خار
آزاد دام و تابہ چمن نا رسیدہ ہوں

یہ شعر داغ کے ہیں۔ یہ زمین سودا کی ہے۔ سودا کا مشہور شعر ہے:

تو آپ سے زباں زد عالم ہے ورنہ میں

اک حرف آرزو سو بہ لب نا رسیدہ ہوں

سودا سے پھر غالب نے لے کر غزلیں اس زمین میں کہیں ہیں۔ اس زمین میں ان کی تین غزلیں ہیں۔ دو غزلیں جوانی کے زمانے میں اور ایک غزل بڑھاپے میں۔ یہ زمین غالب کو اتنی پسند تھی۔ مشہور شعر غالب کا ہے ۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

تو ایسی زمین میں ایسے شعر نکالنا کہ میں پائے شوق ودست تمنا بریدہ ہوں۔ کوئی کہے گا ایسے شعر؟ لیکن داغ کے ان شعروں کو ہم لوگوں نے بھلا دیا اور یاد رکھے اس طرح کے شعر

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے

آپ بندہ نواز کیا جانیں

یعنی ہم لوگوں نے Selective Image بنایا تھا۔ ہم نے ایسا Image بنایا جو ہمارے تصورات سے ہم آہنگ تھا کہ داغ کو ایسا ہونا چاہیے، یعنی یہ نہیں کہ داغ اصل میں کیا ہیں؟ لیکن ہم نے چونکہ سمجھ لیا کہ داغ گزرے ہوئے زمانے کے، so called زوال آمادہ انحطاط پذیر سماج کے ہیں۔ بقول نیاز فتح پوری، وہ بہت جلد جوان ہو گئے اور قلعے کی رنگینی نے انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ارے وہاں رنگینی کیا تھی بھائی؟ بہادر شاہ ظفر شاعر اعلیٰ درجے کا، شہسوار اعلیٰ درجے کا، تیر انداز اعلیٰ درجے کا، فارسی میں شاعر وہ، پنجابی میں شاعر وہ، اودھی میں شاعر وہ، بے مثال خطاط وہ۔ ایسے آدمی کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں کہ وہاں صرف رنگینی تھی، عیاشی تھی، اور وہاں کیا تھا۔ بھائی ان لوگوں کے یہاں تصور ہی اور تھا زندگی گزارنے کا۔ تو نیاز صاحب کا یہ فرمانا کہ جوانی آنے سے پہلے داغ جوان ہو گئے، اور قلعے کی تمام بے راہ رویاں اور ہوسناکیاں ان کے دل میں سما گئیں، لہٰذا وہ شاعری کیا کرتے، یہ سب مفروضے ہیں، بے بنیاد۔ یہ ہم لوگوں نے از خود، یا کسی کے پڑھانے

سکھانے پر، طے کرلیا کہ ایسا ہی ہے۔ ضرور ہوگا کہ یہ سب لوگ بڑے انحطاط پذیر تھے۔ تاریخ اصل میں کیا کہتی ہے، یہ ہم لوگوں نے نہ دیکھا۔

یہ صحیح ہے کہ داغ کے یہاں ہر چیز نہیں مل سکتی۔ مثلاً اس طرح کے جو شعر میں نے پڑھے ہیں، ان کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مضمون آفرینی کے شعر ہیں، خیال بندی کے شعر ہیں۔ یہ داغ کا حاوی رنگ نہیں ہے لیکن وہ اس رنگ میں بند نہیں ہیں۔ ایک تو ہمارے یہاں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ہم کلاسیکی شاعروں کو پڑھتے وقت یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کلاسیکی شاعر کے پہلے کسی نے کیا کہا، اور اس کلاسیکی شاعر کے بعد کسی نے کیا کہا اس کو دھیان میں رکھے بغیر آپ اس شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سب لوگ Intertextual ہیں، ایک کا سرا ایک سے جڑا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے، مثلاً منیر نیازی کے بارے میں میں کہوں کہ ان کو پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ داغ کو پڑھیں، یا امیر کو پڑھیں۔ ہوسکتا ہے آپ کہیں کہ نہیں، ضروری نہیں ہے۔ لیکن داغ کو، جلال کو یا امیر کو پڑھنے کے لیے یہ قطعی ضروری ہے کہ آپ فارسی اردو کے شعرا، جو ان کے پہلے ہو چکے ہیں، اور جن سے یہ متاثر ہوئے، جن کے ساتھ ساتھ اور جن کی روشنی میں انھوں نے اپنے کو شاعر سمجھا، ان کو دیکھیں کہ انھوں نے کیسے شعر کہے۔ اور یہ دیکھیں کہ ان پیش رووں اور معاصروں کی بنائی ہوئی دنیا کے گلی کوچوں میں داغ، یا امیر، یا جلال، کہاں کھڑے ہیں۔ مثلاً ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک شعر خراب سا ہے۔ یہ دیکھیے کہ اپنی روایت کے اشعار سے واقف نہ ہونے کی بنا پر شاعر کس طرح کے شعر کہتا ہے۔

وہ تو وہ ہے تمھیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا منظور نظر تو دیکھو

یہ مضمون ایسا ہے کہ.... یعنی ہم اس شعر میں خوبصورتی کو، معشوق کو، حسن کو، as a text پڑھتے ہیں، یعنی حسن ایک Text ہے۔ اس کو دیکھ کر دوسرے text سمجھ میں آتے ہیں۔ شاعر کو پڑھ کر نقاد کی بات سمجھ میں آتی ہے، اور معشوق کو دیکھ کر عاشق کی قدر ہوتی ہے۔ جو مضمون شعر میں ہوتا ہے ہم اس کو decode کرتے ہیں، اس طرح مضمون کے پیچھے جو کچھ ہے اس تک پہنچتے ہیں۔

اے داغ اسی شوخ کے مضمون بھرے ہیں
جس نے مرے اشعار کو دیکھا اسے دیکھا

اگر فیض صاحب نے داغ کا یہ شعر پڑھا ہوتا تو یقیناً اپنا شعر کہنے کی ہمت نہ کرتے۔ داغ کے شعر میں Beauty as a text کے نکتے پر غور کریں۔ یعنی معشوق کی جو خوبصورتی ہے یا کوئی بھی خوبصورتی ہے، وہ ideal beauty یا ideal text ہے۔ جس نے ایک text کو پڑھ لیا، اس نے سارے text پڑھ لیے۔ گویا معشوق کے مضامین کو میں نے شعر کے مضامین میں integate کر دیا اور اسی شوخ کے مضمون بنے، میرا مضمون تو کچھ بھی نہیں۔ جو بھی کہہ رہا ہوں سب اسی کی باتیں کہہ رہا ہوں۔ تم نے میرا کلام دیکھ لیا تو گویا میرے معشوق کو پہچان گئے۔ وہ عدیم النظیر ہے، لیکن میں نے اس کی باتیں اتنی بچی بچی کہی ہیں کہ وہ اور میں یک جان ہو گئے ہیں۔

اچھا اس مضمون میں ایک مابعد الطبیعیاتی پہلو کم ہے۔ داغ اس سطح تک نہیں پہنچ سکے ہیں کہ داغ کے یہاں بہر حال ایک طرح کی ارضیت ہے۔ فارسی کے کشمیری شاعر غنی نوشاہی کہتے ہیں

آں کس کہ مرا دید ترا دید خدا دید
من روے ترا دیدم و تو روے خدا را

میں نے تیرا منہ دیکھا اور تو نے خدا کا منہ دیکھا۔ اب Wordsworth کی نظم میں شاعر اپنی بیٹی کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کہتا ہے:

Thou liest in Abraham's bosom all the year,

And worship'st at the Temple's inner shrine,

God being with thee when we know it not.

انگریز شاعر بچے کو خدا سے ہم آہنگ اور خدا کے وجود میں ضم دیکھتا ہے۔ کشمیر میں بیٹھا ہوا شاعر وہاں تک تو نہیں پہنچا، لیکن اس کے بدلے اس نے ایک مضمون ڈال دیا کہ Beauty if a text۔ معشوق نے خدا کو دیکھا ہے، گویا اسے لقائے ربانی حاصل ہے، یا پھر معشوق سراپا حسن ہے،

سراپا معنی ہے، اور اللہ بحر معنی ہے، جیسا کہ مولانا روم نے کہا۔ اے داغ اسی شوخ کے مضمون بھرے ہیں، اور وہ شوخ خود رویت باری تعالٰی سے متصف ہے۔ یہ جو نیا dimension جی نوشاہی کے شعر میں ہے، داغ وہاں تک ہم کو نہیں لے گئے۔ لیکن یہ بھی صاف ہے کہ داغ نے جن منزلوں کو طے کیا وہ فیض سے بہت دور رہیں۔ داغ کے یہاں مابعد الطبیعیاتی بعد اس لیے کم ہے کہ ان میں سعدی کا رنگ ہے۔ یہ سچ ہے کہ سعدی کے یہاں جو عشق کے تجربات کا رنگ ہے، اس کی پیچیدگی تک داغ بھی نہیں پہنچ سکتے، لیکن ان کے یہاں وہی سپردگی ہے جو سعدی کے یہاں ہے۔ جب کہ فیض صاحب کے یہاں، معاف کیجیے گا، معشوق کی تشہیر کا رنگ ہے۔ سعدی کا شعر سنیے۔

بہ لطف دلبر من در جہاں نہ بینی دوست
کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید

ایسا معشوق تو دنیا میں دیکھنے کو نہ ملے کہ دشمنی کرتا ہے اور دوستی بڑھاتا ہے۔ یعنی ظلم کرتا ہے، ہمارا دشمن ہے۔ اور جتنا ہی ظلم کرتا ہے، اتنا ہی ہمارا عشق اس سے بڑھتا ہے۔ اب اس شعر کے اوپر کوئی شعر کہتا ہے تو وہ بالکل پاگل ہے، یا پھر داغ ہے۔ گذشتگاں کا کلام دیکھے اور جانے بغیر، اور خود بھی قدرت کلام اور ندرت فکر پر مکمل اختیار رکھے بغیر داغ سے بھی یہ شعر نہ بنتا۔

اس سلیقے کی عداوت کہیں دیکھی نہ سنی
تو زمانے کا عدو دوست زمانہ تیرا

تو یہ جو عشق کے تجربات ہیں ان میں انسانی وجود کے تجربات ہیں۔ اور یہ حاصل ہوئے ہیں اپنی طباعی سے اور گذشتگاں کی راہ جاننے سے۔ غالب نے اسی لیے کہا تھا۔

ہر زہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بر دار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

یعنی میاں جلدی مت کرو، فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ غلط سلط مت بکو۔ شعر و سخن کی راہ میں تم جیسے ہزاروں آئے اور چلے گئے۔ پیروی ان کی کرو جو راہ داں ہیں۔ اس میں جو نظریۂ فن ہے، جو

بات ہے، جس کو سبک ہندی کے شعرا نے خوب سمجھا، یہی ہے کہ شعر سے شعر بنتا ہے۔

سبک ہندی میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں۔ کوئی حسی تو شاہی تک پہنچتا ہے، کوئی نہیں پہنچتا۔ کوئی سعدی کے شہر میں ایک دو رات گزارنے کی ہمت کرتا ہے۔ لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت۔ سب وہاں تک نہیں جاتے، اور داغ بھی ہر بار نہیں جا سکتے، ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ ان کے یہاں خیال کی گہرائی اور نزاکت بہت نہیں۔ لیکن اس کے بدلے میں داغ جو چیز لاتے ہیں، سعدی کے رنگ کے شعر، اس طرح کے شعر اردو میں کسی سے نہیں کہے گئے۔

اب اور مثال دیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ داغ میں ایک بڑی خوبی، یا خرابی، یہ ہے کہ وہ گہری بات بھی بڑے ہلکے سے کہہ دیتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ان کا امیج جو ہم نے بنا لیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بڑا چلبلا ہے، کھلنڈرا ہے۔ کبھی ہم غور ہی نہیں کرتے کہ اس کے شعر میں کون کون سی پیچیدگیاں ہیں، اور کون سی بات کتنی نزاکت سے کہی گئی ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

کھوئے جاتے ہیں، پا جائے ہے، بڑا لطف ہے اس میں۔ اگرچہ اس میں ایک dilemma کی کیفیت ہے۔ یعنی کہ ہم اپنے منھ کو پھیرے ہوئے ہیں لیکن اس منھ پھیرے ہوئے میں بھی وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص ہم پر عاشق ہے۔ اس مضمون کو ذرا بدل کر مومن نے کہا ہے، اور ان کا شعر اور زیادہ مشہور ہے۔

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

یہاں بات کو پلٹ کر معشوق پر لے گئے کہ بھائی، تمھارا لگاؤ غیر کی طرف ہے۔ لیکن اس بات کو تم چھپانا چاہتے ہو تو اس کی طرف دیکھو مت۔ اگر دیکھو گے چپکے چپکے تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ اس کو لگاؤ ہے۔ بے مثال شعر ہے۔

اب غالب کا شعر دوبارہ دیکھیے کہ میں اگرچہ تغافل کرتا ہوں اور تم بھی میری طرف دیکھتے نہیں ہو، لیکن میرے محو ہو جانے کی وجہ سے تم پا جاتے ہو کہ ہم تمھارے عاشق ہیں۔ یعنی سچ بات تو یہ ہے کہ عشق چھپتا نہیں ہے، غالب کے یہاں بھی یہ بات ہے کہ عشق چھپتا نہیں ہے اور مومن کے یہاں بھی یہ ہے کہ عشق چھپتا نہیں ہے، کسی نہ کسی طرح سے بات کھل جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مومن کے یہاں خاصا معمائی معاملہ ہے کہ "منظور.....تو دیکھو" کی بندش میں تعقید آگئی ہے۔ اس تعقید نے شعر میں ایک intellectual فضا پیدا کر دی ہے جو عشقیہ کلام کے منافی سہی، لیکن ایک لطف رکھتی ہے۔

اس تمہید کے بعد داغ کا شعر ملاحظہ ہو ۔

عشق منہ پر مرے لکھا ہو تو کیا اس کا علاج

جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے

ایک تو یہ کہ جو معمائی کیفیت مومن کے شعر میں، اور جو بھاری کیفیت غالب کے شعر میں ہے وہ دونوں ہی یہاں نہیں ہیں۔ کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی کہ جس کو دو بڑے استاد اور سینئر معاصر باندھ چکے ہیں کہ عشق چھپتا نہیں ہے۔ اسی بات کو داغ کہتے ہیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جس مضمون کو غالب اور مومن اتنے گہرے طریقے سے کہا ہوگا، اس کو داغ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ داغ نے بھی کہا اور خوب کہا۔

لیکن اس کی سادگی میں اور بھی باتیں ہیں۔ یعنی یہاں کم سے کم تین معنی ہیں۔ پہلے معنی یہ ہیں کہ جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے۔ میں عشق ہوں، میرے ماتھے پر عشق لکھا ہوا ہے۔ یہ گویا Signboard بن گیا ہے۔ یعنی انھوں نے پہچان لیا کہ یہ عشق مجسم ہے۔ یہ آدمی مجسم عشق ہے۔ کیونکہ میرے چہرے پر ہی عشق کے آثار نمودار ہیں اور اگرچہ ان کو خبر بھی نہیں کہ ہم کون ہیں (شاعر ہیں، اہل حرفہ ہیں، سپاہی ہیں، کیا ہیں؟) لیکن انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم کون ہیں۔ دوسرے معنی یہ کہ وہ یہ پہچان گئے کہ یہ کسی اور کا عاشق نہیں میرا ہی عاشق ہے۔ انفرادی جان پہچان نہ تھی، پھر بھی وہ مجھے اپنے عاشق کی حیثیت میں پہچان گئے۔ تیسری سطح معنی کی یہ بنی کہ میں عشق مجسم نہیں، لیکن عاشق مزاج شخص ہوں۔ جنھوں نے مجھے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا، مجھے پہچان گئے کہ میں کس وضع کا آدمی ہوں۔

یعنی اس ایک فقرے میں کہ ''جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے''، اس میں تین معنی انھوں نے ڈال دیے۔ ابھی کچھ دن پہلے کسی صاحب نے لکھا کہ داغ کے یہاں سب کچھ ہوگا لیکن معنی کی تہیں نہیں ہیں۔ وہ بات کو دور تک نہیں جانے دیتے۔ لیکن اس سادہ سے شعر کو دیکھیے، کس قدر پر معنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ داغ کا عام انداز یہ ہے کہ وہ بات کو اتنے ہلکے انداز سے کہہ دیتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ کچھ کہا ہی نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ معنی کی تہوں سے ناواقف ہیں اور معنی کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ ہم اس شعر میں دیکھ رہے ہیں کہ بظاہر لگتا ہے کہ کھلنڈرانہ سا شعر ہے کہ عشق میرے منھ پر لکھا ہے، لیکن آپ غور کریں کہ اس مضمون کو دوسرے شعرا نے کیسے کہا اور داغ نے کیسے کہا؟ اور پھر اس شعر میں تین معنی ہیں۔ فراق صاحب کا مشہور شعر ہے۔ اسے وہ بہت پڑھا کرتے تھے۔

افشائے راز عشق سن لو
مجھ سے اک بات ہو گئی ہے

اب اس بات کو کتنی Dignity اور صفائی سے داغ کہتے ہیں۔

بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنی کیا
تمھارے کان میں اک حرف ہم نے ڈال دیا

تو اب داغ جو یہ ڈھلا ہوا شعر نکالتا ہے اور اس میں بھی پہلو رکھ دیتا ہے تجربے کے اور معنی کے، اور جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ مختلف طرح کے اشعار پر یہ آدمی قادر ہے۔ یہی بات تو سعدی کے رنگ کا غزل گو ہے یہ شاعر۔ سعدی کی طرح سے ہی عشق کے تجربات کو، عشق کے معاملات کو داغ نے باندھا ہے۔ مثلاً مشہور شعر ہے سعدی کا۔

یا وفا خود نہ بود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد

یعنی شاید دنیا میں وفا تھی ہی نہیں، اور تھی بھی تو اس زمانے میں کسی نے کسی سے وفا نہیں کی۔ شیفتہ نے اسے اٹھا کر یوں کہا۔

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

ترجمہ کردیا ہے تقریباً لیکن سعدی کے شعر میں جو بات تھی یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد، کہ شاید اس زمانے میں کسی نے وفا نہ کی، یعنی اس میں جو سوال تھا، وہ شیفتہ، جو ان کے سینئر استاد تھے، اور سعدی کے یہاں سے الگ ہٹ کر داغ کے یہاں یوں نظر آتا ہے۔

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

ایک لفظ نے شعر کو کتنا اونچا کر دیا۔ گویا، یعنی بولتی ہوئی، یعنی کسی کے وجود میں وفا بولتی ہی نہ تھی۔ وفا کا گلا گھٹ گیا تھا۔ وفا کسی کے وجود میں تھی نہیں۔ یعنی اتنے زمانے سے سعدی کا شعر پڑھا جارہا ہے اور لاکھوں لوگوں نے اس پر سر دھنا ہوگا۔ مختلف اوقات میں، مختلف ملکوں میں۔ ایسے شعر پر شعر کہہ دینا اور پھر بھی شعر میں بات پیدا کر دینا یہ خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ آدمی سعدی کو اپنا حریف بنا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے آپ جیسے لوگوں کو حریف سمجھتا ہے بلکہ فخر یہ سمجھتا ہے کہ ہم ان منازل کو پہنچ سکتے ہیں عشق کے معاملات میں، جہاں سعدی ہیں۔

آخر میں ایک بات دہرانا چاہتا ہوں۔ داغ کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ داغ کی ذاتی زندگی میں کتنے عشق آئے، کتنی طوائفیں آئیں، یہ سوالات ہمارے لیے غیر ضروری باتیں ہیں۔ اور افسوس کہ ہم لوگ ان ہی چیزوں کو شاعری پر مقدم قرار دیتے ہیں، اس وجہ سے شاعری کے بارے میں ہم نے ایسا Image بنا لیا ہے کہ ایسے آدمی کی شاعری ایسی ہی ہوگی۔ تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ داغ کو پڑھنے کے لیے ذہن کو کھول کر پڑھنا چاہیے، اور جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ یہ Poet's Poet ہے۔ کوئی رنگ ایسا نہیں ہے اردو غزل کا جو اس شخص کے یہاں آپ کو نہ ملے۔

●●●

29 - C, Hastings Road
Civil Lines, Allahabad
(U.P.)

حامد حسن قادری

داغ، امیر، جلال

پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم نے مختلف ادبی موضوعات پر کچھ بہت دلچسپ یاد داشتیں لکھی تھیں جو اب تک سامنے نہیں آئی تھیں۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے ان یاد داشتوں کو "نوادرِ منتخبہ" اور "نوادرِ منتخبۂ شعر و ادب" کا نام دیا تھا۔یہ دونوں نام تاریخی ھیں اور اول الذکر سے سنہ ھجری (1358)اور موخر الذکر سے سنہ عیسوی (1941)نکلتا ھے۔ یہ یاد داشتیں دو بیاضوں میں تھیں۔مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے صاحب زادے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے ابھی حال ھی میں انھیں "نوادرِ منتخبہ" کے نام سے شائع کر دیا ھے۔ ان یاد داشتوں میں داغ، امیر مینائی (وفات 1900)اور ضامن علی جلال (وفات1909)کے متعلق بہت دلچسپ نکات درج ھیں۔ ھم انھیں ذیل میں قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لیے شائع کر رھے ھیں۔ (ادارہ)

●

رامپور میں جب امیر، داغ، جلال سب جمع تھے اس زمانے کا ذکر ہے کہ داغ نے ایک مشاعرے میں یہ مطلع پڑھا:

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے داد دینے میں کمی کی اور جب ان کی باری آئی تو ذیل کا شعر پڑھا جس کی بے حد تعریف ہوئی:۔

دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

یہ حال لکھ کر صاحب مضمون جگر صاحب بسوانی نے ان شعروں پر کوئی تنقید نہیں کی۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر جلال اپنا شعر پہلے سے کہہ کر لائے تھے، تب بھی داغ کا مطلع سن کر نہ پڑھنا چاہیے تھا، اور اگر داغ کو سن کر یہ مضمون ذہن میں آیا اور اسی وقت موزوں کیا تو اس سے زیادہ بد ذوقی کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن داد دینے میں کمی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جلال کا شعر پہلے سے کہا ہوا غزل میں موجود ہوگا۔ داغ سے توارد ہو جانے اور داغ کا مضمون سننے سے دم بخود رہ گئے۔ زبان سے داد نہ نکل سکی۔ داغ کے مقابلے میں جلال کا مضمون پھیکا اور پامال ہے۔ عاشق کے دل اور معشوق کی آنکھ کا بیمار ہونا اور ان میں سے ایک کا حال اچھا اور ایک کا برا ہونا بالکل سامنے کی باتیں ہیں۔ ان کے لیے کسی فکر کی ضرورت نہ تھی۔ شاعری کا یہ دستور العمل ٹھہرا کہ اوّل دوسرا مصرع کہہ کر پھر پہلا مصرع چپکاتے ہیں، تو جب یہ مصرع ذہن میں آئے گا کہ "ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے" تو شاعر اس میں دو چیزوں کی تلاش کرے گا۔ وہ دو چیزیں دلِ عاشق و چشمِ یار بھی آسانی سے ذہن میں آ سکتی ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا بیمار ہونا مشکل ہے لیکن دوسرے مصرع کا یہ مضمون لینا کہ ایک عاشق کا حال بُرا اور ایک کا اچھا ہے اور اس کو چشمِ فسوں گر کا کمال قرار دینا، ذرا غور و فکر سے سمجھ میں آتا ہے، اس لیے داغ کے مضمون میں ایک طرح کی ندرت و تازگی پیدا ہو گئی۔

•

امیر و داغ

مطلع

وہ کون تھا جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے، کیا کبھی شباب نہ تھا (امیر)

یہ داغ رند کب آلودۂ شراب نہ تھا
خراب آج ہوا؟ آج تک خراب نہ تھا؟ (داغ)

مضمون و اسلوب ادا دونوں بہت قریب قریب ہیں۔ امیر مینائی کا مطلع بہت اچھا ہے۔

شب فراق میں کیوں یارب انقلاب نہ تھا
یہ آسمان نہ تھا، یا یہ آفتاب نہ تھا (امیر)

نہ پوچھیے مرے روز سیاہ کی ظلمت
چراغ لے کے بھی ڈھونڈا تو آفتاب نہ تھا

وہ پہنچے غیر کے گھر، جان کر شب وعدہ
ہمارے روز سیہ میں جو آفتاب نہ تھا (داغ)

آفتاب کے قافیے میں امیر کا مضمون بہت معمولی ہے۔ داغ کے دونوں شعروں میں ایک ہی مبالغہ ہے۔ پہلے مضمون میں کوئی خاص لطف نہیں۔ دوسرے شعر میں داغ نے اپنے مخصوص رنگ اور خاص شوخی سے لطف پیدا کر دیا۔

شب وصال بھی وہ شوخ بے حجاب نہ تھا
نقاب الٹ کے بھی دیکھا تو بے نقاب نہ تھا

کہا جو میں نے کہ یوسف کو یہ حجاب نہ تھا
تو ہنس کے بولے وہ منہ قابلِ نقاب نہ تھا (امیر)

داغ نے نقاب کا قافیہ نہیں لکھا۔ حجاب کا یہ شعر کہا ہے:۔

ہزار پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں
اسے حجاب تھا، موسیٰ کو تو حجاب نہ تھا (داغ)

حجاب کا مضمون دونوں کا الگ الگ ہے۔ امیر کا پہلا مطلع بہت اچھا ہے اور ان کے خاص رنگ کا ہے۔ لیکن داغ نے حجاب کا مضمون نہایت نازک و نادر نکالا ہے۔ امیر کا دوسرا مطلع صرف ان کی پُرگوئی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس میں لکھنے کی کیا بات تھی۔

جواب کا قافیہ

دماغ بحث تھا کس کو وگر نہ اے ناصح
دہن نہ تھا کہ دہن میں مرے جواب نہ تھا
سوالِ وصل کیا، یا سوالِ قتل کیا
وہاں نہیں کے سوا دوسرا جواب نہ تھا
لپٹ کے چوم لیا منہ، مٹا دیا انکار
نہیں کا ان کی سوا اس کے کچھ جواب نہ تھا (امیر)
پیامبر، تجھے لاکھوں سوال کرنے تھے
نہ تھا ہزار میں اک بات کا جواب نہ تھا (داغ)

داغ کا ایک شعر امیر کے تینوں شعروں پر بھاری ہے۔ امیر کے تینوں مضمون پامال ہیں۔ تیسرا شعر خالص لکھنوی مضمون کا ہے۔ داغ نے اس طرح سے شاید ہی کہیں کہا ہو۔

خواب کا قافیہ

نصیب جاگ اُٹھے، سو گئے جو پاؤں مرے
تمھارے کوچے سے بہتر مقامِ خواب نہ تھا (امیر)

وہ رات کون سی گزری جو اضطراب نہ تھا
جب آنکھ دی تھی خدا نے مجھے تو خواب نہ تھا (داغ)

امیر نے اپنے خاص رنگ کا شعر کہا ہے۔ جاگتے سونے کی مناسبت لکھنؤ کا طرز ہے اور امیر اس کے استاد ہیں۔ بہر حال دوسرے مصرع کے مضمون نے ایک لطف پیدا کر دیا۔ داغ کا پہلا مصرع بالکل سادہ تھا۔ اس کے پڑھنے سے کسی پُر لطف مطلع کی توقع نہیں ہوتی، لیکن دوسرے مصرع میں عجیب بات کہہ دی کہ جب خدا نے مجھے آنکھ دی تھی اس وقت نیند پیدا ہی نہیں کی گئی تھی۔ پھر مجھے کہاں سے ملتی۔ اسی لیے رات بھر بے چینی میں رہتے ہیں، نیند نہیں آتی۔ بے خوابیِ فراق کے لیے یہ توجیہ کرنا نہایت دلچسپ ہے۔

شباب کا قافیہ

نہ پوچھ عیش جوانی کے ہم سے پیری میں
ملی تھی خواب میں وہ سلطنت، شباب نہ تھا (امیر)

جواں ہوئے تو قیامت ہوئے، خدا کی پناہ
وہ جب بھی فتنہ تھے جب عالمِ شباب نہ تھا (داغ)

دونوں امیر و داغ کے اپنے اپنے رنگ کے شعر ہیں اور دونوں خوب ہیں۔ امیر نے شباب کو خواب کی سلطنت کہہ کر مضمون میں تازگی پیدا کر دی۔

انقلاب کا قافیہ

زمانہ وصل میں لیتا ہے کروٹیں کیا کیا
فراقِ یار کے دن ایک انقلاب نہ تھا (امیر)

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا (داغ)

امیر کا شعر، داغ کے مقابلے میں گویا کہنے ہی کا نہ تھا۔ بالکل سامنے کی بات کہہ دی۔ داغ نے بھی کوئی نادر بات نہیں نکالی، لیکن اسلوبِ بیان خوب نکالا۔

خانماں خراب کا قافیہ

وہ کہتے ہیں شبِ وعدہ میں کس کے پاس آتا
تجھے تو ہوش ہی اے خانماں خراب نہ تھا

یہ بار بار جو کرتا تھا ذکرِ مے واعظ
پیے ہوئے تو کہیں خانماں خراب نہ تھا (امیر)

بغیر داغ کے جنت تمھاری بزم رہی
ہزار شکر کہ وہ خانماں خراب نہ تھا (داغ)

امیر کا دوسرا شعر صرف بھرتی کا ہے، اور پہلا معمولی۔ داغ کے مقطع میں بڑی دلچسپ شوخی ہے۔ ''ہزار شکر'' نے بڑا لطف پیدا کر دیا۔

ان قافیوں کے علاوہ امیر مینائی نے عذاب، شراب، خطاب، حباب بھی لکھے ہیں جو داغ نے نہیں لکھے لیکن سب عامۃ الورود بلکہ بھرتی کے ہیں۔ صرف ایک شعر نے ایک بات پیدا کی ہے۔ کہتے ہیں:۔

غرض یہ ہے کہ ہو عیشِ تمام باعثِ مرگ
وگرنہ میں تو کبھی قابلِ خطاب نہ تھا (امیر)

یہاں ''تمام'' کا لفظ ''مرگ'' کی مناسبت سے رکھا ہے کہ مرگ بھی زندگی کا تمام ہونا ہے۔ باعث مرگ پیدا کرنے کے لیے عیش تمام کی جگہ افراطِ عیش بہتر ہوتا۔

داغ نے اضطراب، کباب، حساب کے قافیے لکھے ہیں جو امیر نے نہیں لکھے۔ داغ کے سب شعر اچھے ہیں۔ خصوصاً اضطراب کے تینوں شعر بہت خوب ہیں۔

نگاہِ شوق پہ الزام بے قراری کا ؟
تمھاری برقِ تجلی کو اضطراب نہ تھا؟

کہا انھوں نے شبِ غم کا ماجرا سن کر
ترے مزاج کی شوخی تھی، اضطراب نہ تھا
پیامبر کی زباں بات بات پر جو رُکی
شریکِ حال مرے دل کا اضطراب نہ تھا (داغ)

پہلے شعر کی شوخی بھی لطف سے خالی نہیں لیکن دوسرا شعر تو داغ کے سوا کوئی کہہ ہی نہ سکتا تھا۔ تیسرے شعر کا جواب نہیں۔ کیا صحیح واقعہ اور جذبہ لکھا ہے! سادہ سی بات ہے مگر واہ! باقی دو یہ ہیں:۔

ملا ہمیں دلِ پُر داغ کا نشاں اتنا
جلے کباب کی بو تھی، مگر کباب نہ تھا

"مگر کباب نہ تھا" کیا خوب کہا!

نہ پوچھ مجھ سے مرے جرم داورِ محشر
مرے گناہوں کا دنیا میں بھی حساب نہ تھا (داغ)

اس "بھی" نے شعر کو شعر بنا دیا۔

شراب کا قافیہ

غضب کیا کہ اسے تو نے محتسب توڑا
ارے یہ دل تھا مرا، شیشۂ شراب نہ تھا (امیر)

سنا کلام جو رندوں کا، شیخ چکرایا
وہاں تو بات کا چھینٹا بھی بے شراب نہ تھا (داغ)

امیر کا مضمونِ شراب نہایت ادنیٰ ہے۔ داغ کے ایسے شعروں کا جواب نہیں ہوا کرتا لیکن پہلا مصرع ذرا بے مزہ ہے، دوسرے کا کیا کہنا! (یہ شعر اور بعض اور اشعار بعد کو دستیاب ہوئے)۔

عذاب کا قافیہ

اسے جو شوقِ سزا ہے، مجھے ضرور ہے جرم
کہ کوئی یہ نہ کہے قابلِ عذاب نہ تھا (امیر)

اگرچہ بادہ کشی تھا گناہ اے زاہد
جو تجھ سے چھین کے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا
ازل میں عشق کے بدلے ملا نہ کیوں دوزخ
اگر عذاب ہی دینا تھا، واں عذاب نہ تھا؟ (داغ)

امیر کا مضمون اور طرزِ ادا دونوں میں کوئی بات نہیں۔ محض ''خانہ پُری'' ہے۔ داغؔ کے دونوں شعروں میں شوخی سے لطف پیدا ہو گیا۔

•

تعقیدِ لفظی

اس حد تک ہو تو نہایت مکروہ ہے۔

خوف مانا اس قدر زلفوں کی کن کا رات نے
کہکشاں سے لے لیا دانتوں میں تنکا رات نے (شاہ نصیر دہلوی)

''زلفوں کی کن کا'' یعنی کن کی زلفوں کا، یا للعجب!

اس سے بہتر یوں ہو سکتا تھا، اگرچہ خوف بجائے زلفوں کے اُن کا ہو جاتا لیکن تعقید نہ رہتی:۔

خوف مانا دیکھ کر زلفوں کو کن کا رات نے
کہکشاں سے لے لیا دانتوں میں تنکا رات نے

دوسرے یہ بات قابلِ تأمل ہے کہ ''کہکشاں سے تنکا لے لیا'' فارسی کا ترجمہ ہے، لیکن اردو کا محاورہ نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں فارسی محاورات کا لفظی ترجمہ جائز تھا، خواہ ہمارے محاورے کے

خلاف ہو، اس لیے شاہ نصیر پر اعتراض نہیں، تاہم (سے) کی جگہ (کا) لکھ سکتے تھے۔ ''کہکشاں کا لے لیا، دانتوں میں تنکا رات نے۔''

مقابلہ

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ ادھر اُدھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ

(مرزا رضا علی آشفتہ اکبر آبادی، از تذکرۂ گلشنِ بے خار)

تم آئینے میں نہ ہر بار دیکھتے جاؤ مری طرف بھی تو سرکار دیکھتے جاؤ

(نواب میرزا داغ دہلوی)

قرینِ قیاس ہے کہ داغ نے اور کہیں نہیں تو ''گلشنِ بے خار'' میں آشفتہ کا یہ مطلع دیکھ کر قافیہ بدل کر اپنا مطلع اور غزل لکھی ہو۔ مضمون دونوں کا ایک ہے۔ لیکن آشفتہ کا اسلوبِ ادا داغ سے بہتر ہے۔ آشفتہ نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرمائش کر کے ضمناً اپنی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا ہے۔ یہ بات داغ سے زیادہ لطیف ہے۔

آشفتہ کی اس غزل کے جو اور اشعار نواب شیفتہ نے ''گلشنِ بے خار'' میں لکھے ہیں وہ بھی اچھے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

بجائے اشک نکلتے ہیں پارہ ہائے جگر تمہارے جی میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ

دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ

اگرچہ ہوئے گی تصدیع لیکن آشفتہ کوئی گھڑی کا ہے مہمان، دیکھتے جاؤ

داغ نے بھی اپنی غزل اپنے رنگ میں دلچسپ کہی تھی، چند شعر یہ ہیں:۔

تمھیں غرض جو کرو رحم پائمالوں پر تم اپنی شوخیِ رفتار دیکھتے جاؤ

نہیں ہیں جرمِ محبت میں سب کے سب ملزم خطا معاف، خطا وار دیکھتے جاؤ

کوئی نہ کوئی ہر اک شعر میں ہے بات ضرور جنابِ داغ کے اشعار دیکھتے جاؤ

آشفتہ کا اور کلام بھی بہت اچھا ہے۔ میر سوز دہلوی کے شاگرد ہیں، میر و سودا اور درد کے ہم عصر، اسی لیے آشفتہ کے کلام میں انہی بزرگوں کی سادگی اور درد و اثر ہے، کہتے ہیں:۔

اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو تو صدقے نہ کر
ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے

چلا ہے کعبے کو آشفتہ پارسا بن کر
خدا جو بیٹھے بٹھائے اسے خراب کرے

چہرہ کچھ ان دنوں غمِ پنہاں سے زرد ہے
ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے

ہمیشہ آگ نکلتی ہے میرے سینے سے
الٰہی موت دے، گزرا میں ایسے جینے سے

مر گیا اک صنم پہ آشفتہ
موت ایسی خدا نصیب کرے

●●●

داغ اور ان کے دہلوی شاگرد

نواب میرزا خاں داغ دہلوی 1830 میں چاندنی چوک، دلّی کے اس علاقے میں پیدا ہوئے جو اب کوچہ استاد داغ کہلاتا ہے۔نواب شمس الدین احمد خاں والیِ لوہاروان کے والد تھے، اور والدہ کا نام وزیر بیگم یا چھوٹی بیگم تھا۔ ان کے علاوہ نواب شمس الدین خاں کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ کرنل فریزر کے قتل کے جرم میں ملوث قرار دیے جانے پر نواب صاحب کو پھانسی ہوگئی۔ اس کے 5 سال بعد 1840 میں چھوٹی بیگم، آغا تراب علی کے یہاں پناہ گزیں ہوئیں، اور کچھ روز بعد انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد، میرزا فخرو سے 1844 میں نکاح کر لیا۔ داغ کی پرورش، تعلیم و تربیت 14-13 برس کی عمر سے دیگر شاہزادوں کے ساتھ قلعۂ معلّٰی میں ہوئی۔ وہیں خاقانی ہند، ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق (استادِ شاہ) کے شاگرد ہوئے۔ قلعے میں 13-12 سال گزارے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب ان کے پھپھا ہوتے تھے۔ اور استاد ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب کی صحبت میں زیادہ وقت گزرتا تھا۔ گھنٹوں شطرنج کھیلتے اور فرمائش پر غالب کو اپنا کلام سناتے تھے۔

داغ نے فنِ سپاہ گری کے اُصول، شہسواری، بندوق کی نشانہ بازی، وہیں سیکھی اور سید میر پنجہ کش سے خوش خطی سیکھی، جو بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد تھے۔

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ پھر رامپور متمکن ہوئے۔ یہاں نواب یوسف علی خاں نے ان کی پرورش کی۔ داغ کی شادی فاطمہ بیگم سے ہوئی جو 50 برس ان کی رفیقِ حیات رہیں۔ نواب کلب علی خاں والیِ رامپور داغ کو اپنا بھائی کہتے تھے۔ انھی کے ہمراہ 41 برس کی عمر میں حج بھی کیا۔ غزلیات اور مثنوی کے علاوہ، حمد، نعت، منقبت، سلام وغیرہ بھی کہے اور پابندی سے نماز بھی پڑھی۔ ثقہ، سنجیدہ اور فکری شاعری بھی کی، اور دِلّی کی ٹکسالی زبان، روزمرّہ، محاورہ بندی، سلاست و فصاحت کے ساتھ معاملہ بندی، تغزل و تعشق کی شاعری بھی خوب کی۔ رقص و موسیقی، مجرے، گانے، رت جگے کے بھی

شوقین تھے۔ راجوں مہاراجوں نوابوں، جاگیرداروں اور امرا و رؤسا کی طرح تمام شوق پورے کیے، جس کا گہرا عکس جا بجا ان کے کلام میں ملتا ہے۔ حسن و جمالیات کے رسیا تھے اور محبت کیش تھے۔ منّی بائی حجاب سے تعلق خاص رہا۔ وہ داغ صاحب کو حاجی میاں کہا کرتی تھیں۔ لال قلعے میں ذوق، غالب، ظفر، اور دلی کے دیگر باکمال حضرات مومن، نواب شیفتہ، صدرالدین آزردہ، بالمکند حضور کی صحبتوں سے فیض پایا۔

رامپور میں نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے درباروں میں بھی ماحول ادبی تھا اور شعروسخن کی محفلیں گرم تھیں۔ باکمال مشاہیر موجود تھے۔

نواب مرزا داغ کے دو بڑے احسان اردو زبان پر ہیں۔ ایک تو جو زبان پہلے خانقاہوں، درگاہوں اور اولیا و صوفیا میں پلی، اور اس کے بعد رؤسا و امرا کے درباروں اور محلوں میں بند رہی، طوائفوں، قلعیوں اور قوالوں نے چند شعرا کا کلام گا گا کر، کچھ مخصوص طبقوں تک پہنچایا۔ رفتہ رفتہ وہ زبان ایک دور میں عربی اور فارسی ترکیبوں سے بہت بوجھل ہوگئی، ایہام اور ابہام اور مشکل پسندی نے زبان کو عوام سے دور رکھا۔

یہ نواب میرزا داغ کا طرۂ امتیاز ہے کہ انھوں نے زبان کو میر تقی میر، اور خواجہ میر درد کی طرح، بلکہ اور بھی زیادہ سادہ، صاف، رواں، عام فہم، بول چال کی ہر دلعزیز، عوام رس زبان بنا دیا، جو لغات سے علما اور استادوں سے بے نیاز ہوکر براہ راست ہر کس و ناکس کے دل پر چوٹ کرنے لگی۔ داغ نے زبان کو پڑھے لکھے اور انپڑھ، شہری اور دیہاتی، غریب اور امیر، طالب علم نوجوانوں اور عمر رسیدہ پختہ کاروں تک جو ہر طبقے اور ہر پیشے سے تعلق رکھتے تھے، پہنچا دیا۔ اور اردو شاعری زبان زدِ خاص و عام ہوگئی۔ عام، سادہ، صاف زبان میں دل کو چھونے والے مضامین، راحت رساں بن کر سارے معاشرے کی کلفتوں کا مرہم بن گئے۔ اگر داغ زبان کی صفائی اور سلاست کی طرف توجہ نہ کرتے تو آزادی کے بعد خصوصاً جب رسمی طور پر اردو پاکستان کی سرکاری زبان بنا دی گئی، اس کے ردِ عمل میں اگر اردو رجب علی بیگ سرور، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے رنگ کی زبان ہوتی تو 25-20 برس میں کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ داغ کا احسان ہے کہ اردو آج بھی ہندوستان میں لنگوا

فرینکا ہے۔ سارے ملک میں اور باہر مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ اور مغربی ایشیا تک اور اس سے آگے خلیجی ممالک ہوتی ہوئی سعودی عرب سے ہوکر ازبکستان سمرقند و بخارا تک پڑھی، بولی اور لکھی جاتی ہے۔

مرزا داغ نے تو کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مگر آج وہ ہوتے تو دیکھتے کہ" سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔" جدہ میں ایک سینئر سیکنڈری ہندوستانی اسکول ہی میں دس ہزار لڑکے اور تین ہزار لڑکیاں اردو پڑھ رہی ہیں۔ 70 ملکوں میں سالانہ اردو سیمینار، مذاکرے، کانفرنسیں اور عالمی مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں۔

یہ داغ ہی کی زبان ہے جو تقسیمِ وطن کے بعد کے نامساعد حالات میں بلکہ اردو دشمن سازشوں کے باوجود 58 سال بعد بھی آب وتاب سے پھر پنپ رہی ہے۔ اسکولوں میں (گو بہت کم سہی) کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں، پرائیویٹ اور سرکاری سطح پر اس کی تعلیم پھر بڑھنے لگی ہے۔

دوسرا احسان داغ کا یہ ہے کہ کشمیر سے کالی کٹ تک، اور بمبئی سے کلکتہ، شیلانگ اور آسام تک ہر جگہ ان کے شاگردوں نے اردو کو گھر گھر پہنچایا۔ ان کے لگ بھگ دو ہزار شاگرد سارے ملک میں چھا گئے۔ دلی، رامپور، میرٹھ، آگرہ، علی گڑھ، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، بھوپال، عظیم آباد، اعظم گڑھ، گورکھپور، فیض آباد، حیدر آباد (دکن)، کانپور، مظفر نگر تک اردو پھیلتی چلی گئی اور ہر جگہ مرزا داغ کے شاگردوں کا طوطی بولنے لگا اور یہ زبان پورے ملک اور سماج کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔

کچھ اشعار نواب مرزا داغ کے حاضر کرتا ہوں پھر داغ کے چند تلامذہ کا بھی ذکر کروں گا جو جانشین داغ یا یادگار داغ کہلائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال نے داغ کا مرثیہ لکھتے ہوئے اپنے استاد کو دل سے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کے بعد نئے خیالات کی ترجمانی کرنے والے پیدا ہوتے رہیں گے۔ مگر:

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
مر گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

حج کو جاتے ہوئے جو غزل کہی، اس کا مطلع ہے:

دیر سے کعبے کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں
دیکھ لیتا ہے جو کوئی، وہیں تھم جاتے ہیں

کعبے میں بیٹھ کر جو غزل کہی اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ اللہ سے کہتے ہیں:

مجھ گنہگار کو جو بخش دیا
تو جہنم کو کیا دیا تو نے

اور اس کے بعد کہتے ہیں:

خدا کا شکر ہمیں حج جو اب نصیب ہوا
قصور وار گئے، بے قصور ہم آئے

اب ان کا مخصوص رنگ:

تم تو ہو جان اک زمانے کی
جان تم پر نثار کون کرے
داغ کی شکل دیکھ کر بولے
ایسی صورت کو پیار کون کرے

سب لوگ جدھر وہ ہیں، اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننی پڑے گی داستاں میری

گر میرے بُت ہوش رُبا کو نہیں دیکھا
اُس دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا

شوخی سے ٹھہرتی نہیں قاتل کی نظر آج
یہ برقِ بلا دیکھیے گرتی ہے کدھر آج

ستم ہو گیا، رازِ دل کھل گیا
چھپاتے چھپاتے خبر ہو گئی

داغ کا ہر حرف لکھتے ہیں جدا
ٹکڑے کر ڈالے ہمارے نام کے

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا
اُن کا تو کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

داغ کہتے ہیں جنھیں دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دُور، آپ پہ مرنے والے

ناز والے نیاز کیا جانیں
سازِ بے کینہ ساز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

جناب شیخ، ہیں، آداب عرض کرتا ہوں
اندھیری رات میں چھپ کر کہاں چلے اُستاد

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھرو ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پری زاد آیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

دہلی میں تلامذۂ داغ:

دہلی میں تلامذۂ داغ اور اُن کے عہد کی کچھ یادیں پیش کرنے سے پہلے اور ان کی شخصیات وفن کا تعارف کرانے سے پہلے عہدِ داغ کی مختصر تاریخ، ماحول، معاشرتی اقدار اور آداب وقرائن زندگی کو مختصراً سمجھ لینا ضروری ہے۔ 1830 سے 1905 تک کا یہ عہد تین وجوہ سے یادگار ہے۔ ایک تو 1835 کے بعد سے انگریزوں نے اردو کو فارسی کی جگہ سرکاری، عدالتی و دفتری زبان قرار دیا۔

دوسرے انقلاب 1857 کی اُتھل پُتھل اور شکست و ریخت کے بعد ایک ایسے عبوری دَور کی سخت گیری جس میں مسلم کلچر، مسلم معززین و رؤسا، اور وابستگان مغلیہ حکومت کی مسلسل اہانت کی اور ان کے ساتھ ناروا سلوک۔ یوں تو جنگِ پلاسی 1757 کے بعد ہی سے یہ عمل شروع ہو چکا تھا، مگر 1806 میں لارڈ لیک کے دلّی فتح کر لینے کے بعد سے سلطنت کی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکل جانے پر، فرار، کی دو راہیں کھل گئی تھیں۔ ایک تو تصوف اور خانقاہیں، اور دوسرے سستی لذّت پرستی، عیش کوشی، رنگ رلیاں، کوٹھے، مجرے، گانے، شراب و کباب اور رت جگے۔

اسی کے ساتھ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جب ہندی، ہندوی، ہندوستانی، یعنی ایک مشترکہ عام فہم ملی جلی زبان اردو کو دو قالب میں تقسیم کیے جانے کا عمل شروع ہوا تو رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بُعد اور فصل اور نفرت و نفاق کی داغ بیل پڑی۔

مرکز کمزور، ریاستیں، صوبیداریاں، نوابیاں برائے نام، سب پنشن یافتہ کٹھ پتلیاں ہو گئیں۔ اور انگریز ریزیڈینٹ اصل حاکم۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملکہ وکٹوریہ کے دور تک، یہی صورت حال تھی۔ اس صورت حال نے جس کلچر کو جنم دیا، اس میں تماش بینی، داشتائیں رکھنا، کوٹھوں پر تہذیب اور ادب سیکھنے سکھانے کا رواج عام ہو گیا شاعری میں کنگھی، چوٹی، آئینہ و آرسی، اور جذباتی تغزل، تعشق اور صنفی جذبات و جنسی نفسیات کا دور ہر طرف گرم ہو گیا۔

اِن حالات میں، ایک مجسم شخصیت میں سمٹ کر، تمام تغیر و انقلاب نے فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ دہلوی کا روپ اختیار کر لیا۔ جو اپنی والدہ کے ساتھ کئی گھر اور در اور کئی شہر بدلنے پر مجبور ہوتے رہے۔

نواب شمس الدین خاں والی لوہارو کے یہاں سے مرزا فخرو تک لال قلعے میں پہنچنے تک اور پھر وہاں سے رام پور آنے جانے تک، داغ کئی نشیب و فراز دیکھ چکے تھے۔ ایک شکست خوردہ معاشرے میں انھوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکال ہی لی اور وہ تھی تکمیل زبان، فصاحت، روزمرّہ، ٹھیٹھ بولی، ٹکسالی اردو، قلعہ معلی کی زبان کو عوام تک، خانقاہ تک، کوٹھے تک، طوائف و قوال تک، بازار تک، حکما اور کرخنداروں تک پہنچانا۔ انھوں نے ایک نیا محاورہ ایجاد کیا اور اسے تمام ملک کی عوامی، سماجی،

معاشرتی، ادبی وتہذیبی وتجارتی زبان بنا دیا۔ ساتھ ساتھ، دل پر جادو کا اثر کرنے والے جذبات نے ان کی شاعری کو ملک گیر شہرت عطا کی۔ اور سارے ملک میں داغ کی زبان اور دلّی کا محاورہ چھا گیا۔ داغ کے اکثر تلامذہ، زبان، محاورے، روزمرّہ، تعشق وتغزل کے شاعر ہیں۔ وہ اور لیلیٰ حسن وعشق کی زلفوں میں ایسے گرفتار ہوئے کہ فکر سے غافل ہو کر سب "زبان کی سند" کے استاد ہو کر رہ گئے۔ فکر وتخیل، مضمون آفرینی تقریباً مفقود ہو گئی۔ مگر روزمرّہ کو بول چال کو یہ لوگ مالا مال اور لازوال کر گئے اور معرّب ومفرّس بیان سے بچا گئے۔

داغ کے تلامذہ کی زبان میں وہ تمام رنگینیاں اور لہجے اور اسالیب موجود ہیں جن میں قلعہ کی زبان، قلعہ کے باہر اُمرا اور رؤسا اور وابستگانِ قلعہ کی زبان، بیگمات کی زبان، خواجہ سراؤں کی زبان، جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان، کھتریوں کی زبان، کائستھوں کی زبان، طوائفوں اور کوٹھوں کی اصطلاحی زبان، شُہدوں اور کرخنداروں کی زبان، خوانچہ فروش اور چھابڑی والوں کی زبان، خانقاہی زبان وغیرہ وہ تمام رنگ ہیں، جو ایک ہی زبان کے اساتذہ نے الفاظ کے برتنے سے ابھارے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں دلّی میں داغ کے چار شاگردوں کا ذکر کروں گا، جنھیں بیخود، سائل، شاعر اور زار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حاجی منشی سید وحید الدین بیخود دہلوی، باقی باللہی کا ذکر کروں گا۔ گہرا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا دہانہ، سفید بُرّاق چاندی جیسی سر سیدی ڈاڑھی، سر پر چاروں طرف برائے نام بال، پڑھتے ہوئے عینک بھی لگاتے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ، لمبے کان، کسرتی پہلوانی بدن، کرتا علی گڑھی پائجامہ سے کچھ تنگ، اور تنگ چوڑی دار پائجامے سے کچھ کھلتا ہوا پائجامہ، گھٹنوں سے نیچے تک کرتا۔ اچکن، جامۂ احرام، نمازی رومال کندھے پر، ہزارہ تسبیح ہاتھ میں، بغل میں (گھر سے باہر کسی جلسے یا مشاعرے میں جاتے ہوئے) کئی دیوان اور بیاضیں، پمپ شو، یا وصلی جوتی۔ ایک چھڑی ہاتھ میں۔ پاٹ دار اور گرجدار آواز، پکّے جلالی سید۔ غصّہ ناک پر موجود۔ مزاج کے خلاف ذرا سی بات پر موٹی موٹی پھوسڑے دار، کرخنداری گالیاں۔ ساتھ ہی توبہ واستغفار اور اَوراد وظائف لبوں پر جاری۔ خواجہ باقی باللہ کے خاندان سے تھے۔ انگریزوں کو، پادریوں کو، آئی سی ایس افسروں کو اردو وفارسی پڑھاتے تھے۔

بیخود صاحب کی شاگردی داغ کا قصہ بھی سننے کے قابل ہے۔ بیخود صاحب بھی پہلے مولوی عبدالحق اور علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی طرح، خواجہ الطاف حسین حالی۔ کے شاگرد تھے۔ جب حالی، سرسید کے ساتھ علی گڑھ جانے لگے تو وہ خود بیخود صاحب کو داغ کے پاس لے گئے اور کہا کہ اس لڑکے کی طبیعت بہت شوخ اور لڑتی ہوئی ہے۔ آپ ہی کے رنگ میں شعر کہتا ہے میرا تو برائے نام شاگرد ہے، میں تو علی گڑھ جارہا ہوں، اسے آپ کا شاگرد کرانے لایا ہوں۔ مرزا داغ نے ان کا کلام سننے کی فرمائش کی۔ مولانا حالی نے بیخود صاحب سے کلام سنانے کو کہا۔ انھوں نے ایک غزل پڑھی، جہاں استاد نے ایک اور غزل کی فرمائش کی۔ بیخود صاحب نے دوسری غزل بھی سنائی۔ فصیح الملک نے پسند فرمایا اور کہا کہ یہ تو فارغ الاصلاح ہے اور بنا بنایا شاعر ہے۔ خیر میں اسے اپنا شاگرد کرتا ہوں۔ اب بیخود صاحب کا بھی باقی بلا ہی جلال جاگا اور فرمانے لگے ٹھہریئے صاحب آپ دونوں کے فیصلے سے کیا ہوتا ہے پہلے استاد ہمیں بھی اپنا کلام سنائیں تاکہ ہم بھی تو فیصلہ کریں کہ ہم کو ان کا شاگرد ہونا ہے کہ نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور نواب مرزا داغ نے بے تکلف دو غزلیں سنائیں۔ غزلیں سن کر بیخود صاحب نے اُٹھ کر حضرت داغ کے پاؤں پکڑے، سلام کیا، اور کہا ''ہم آپ کو اپنا استاد کرتے ہیں اور آپ کے شاگرد ہوتے ہیں۔''

یہ اکڑفوں ابتدا سے بیخود صاحب میں تھی اور مرتے دم تک قائم رہی، بلکہ عمر اور شہرت کے ساتھ بڑھتی گئی اور عمر کے آخری دور میں کوئی 70 برس سے 99 برس تک، بیماریوں کی وجہ سے چڑچڑے پن اور مردم آزاری میں تبدیل ہوگئی تھی۔ بیخود صاحب 57-1856 کے درمیان بھرت پور (جو اس وقت صوبہ دارالسلطنت دلی میں تھا اور اب راجستھان میں ہے۔ جسے انگریزوں نے 1857 کے بعد توڑ کے الگ کردیا تھا) میں پیدا ہوئے۔ اور 2 اکتوبر 1955 کو دلّی میں انتقال فرمایا۔ یوں تو مجھے ان کے سینکڑوں واقعات یاد ہیں، جن کی ایک یلغار حافظے میں تلاطم خیز ہے، مگر چند واقعات ہی کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

داغ کے جملہ تلامذہ ان کو امام غزل اور جانشین داغ مانتے تھے جوانی میں شکار، نشانہ بازی، گھوڑسواری، کبوتر بازی اور مجرے گانوں سبھی سے شوق کیا۔ کبوتر بازی تو آخر عمر تک جاری رہی۔

''گفتار بیخود'' اور ''ذرِ شہسوار بیخود'' دو دیوان ان کے عنایت کردہ میرے پاس ہیں۔ ڈرامے اور افسانے بھی لکھے۔ غالب کی شرح بھی سپردِ قلم کی۔ داغ کے خطوط بھی شائع فرمائے۔ قصیدہ، مثنوی، مسدّس، غزل ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ چار دیوان شائع کیے۔ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، زار دہلوی، سے مخلصانہ تعلقات تھے جو ساری عمر استوار رہے۔ ساحر صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جن مشاعروں میں ساحر و بیخود دونوں موجود ہوں تو صدارت کا مسئلہ منتظمین کے لیے بڑا پیچیدہ ہو جاتا تھا مگر بیخود ایسے موقعے پر کہتے میاں جس کی داڑھی لمبی وہی صدارت کرے گا۔ ساحر صاحب کی داڑھی تو ناف تک لمبی تھی۔ ایک مرتبہ ساحر صاحب سے بھی کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ فرمایا ''پنڈت! اب تیرے مشاعروں میں کبھی نہیں آؤں گا (ساحر صاحب نے بزمِ سخن قائم کی تھی اور 1910 سے 1943 تک اس کے ماہانہ اور سالانہ جلسے اور مشاعرے اہتمام سے اور پابندی سے منعقد ہوتے رہے۔ مگر ناراضگی کے باوجود، دوسرے چوتھے دن ان کی مزاج پُرسی کو ضرور جاتے مگر مشاعروں میں شریک نہ ہوتے۔ مگر جب 1936 میں بزمِ سخن کی سلور جوبلی کے جلسے اور مشاعرے ہوئے اور سناتن دھرم اسکول کونڈے والان، اجمیری گیٹ دلّی کی عمارت میں تین چار دن تک کئی کئی نشستوں میں چلے، ہندوستان کے کونے کونے سے اساتذہ و مشاہیر شریک ہوئے۔ داغ، حالی، آزاد، شبلی، امیر مینائی اور دوسرے متاخرین کے جتنے تلامذہ زندہ تھے سب شریک ہوئے۔ دلّی، یوپی، پنجاب، کلکتہ، بہار اور حیدرآباد، ہر جگہ سے اہلِ فن تشریف لائے تھے، میں خود اس میں شریک تھا۔ اس سلور جبلی تقریب میں بیخود صاحب شروع کے دو دن تشریف نہیں لائے۔ لکھنؤ اور پنجاب کے اساتذہ میں طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ دلّی والے پریشان سب کہیں کہ بیخود صاحب کی شرکت ضروری ہے مگر سب کی کوششیں بیکار گئیں۔ بیخود صاحب نے سب پیامبروں اور دوستوں کو ٹال دیا۔ آخر سب نے فیصلہ کیا کہ زار صاحب انھیں لا سکتے ہیں۔ قصہ مختصر زار صاحب ان کو منانے تشریف لے گئے۔ یا تو دو دن تک ٹس سے مس نہ ہوئے تھے، یا زار صاحب کو دیکھتے ہی کہنے لگے سمجھ گیا کیوں آئے ہو۔ بنو اد میرا اکّڑ ا۔ میری ناک کٹوا کر دلّی کی ناک بچالو۔ چلو میں چلتا ہوں۔ اب ایک شور مچ گیا۔ آ گئے آ گئے وہ آ گئے۔ یہ عصرانہ چائے اور گروپ فوٹو کا وقت

تھا۔ مشاعرہ تو عشا کے بعد ہونا تھا۔ سب لینے کے لیے دروازے کی جانب دوڑے۔ ساحرؔ صاحب بھی کھڑے ہو گئے۔ پہلے دونوں بغلگیر ہوئے۔ دونوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر وہیں گروپ فوٹو کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ساحر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''پنڈت اب تو خوش ہے۔ دلی کی ناک تو نہیں کٹی، خواہ میری کچھ نیچی ہو گئی، بھئی تو جیتا۔ آ گیا نہ آخر تیرے مشاعرے میں۔ اب یہیں دونوں غزلیں سن لو۔ رات کو نہیں آ سکتا''۔ وہیں دونوں طرحی غزلیں سنائیں اور سب کے چہرے بشاش ہو گئے۔ اسی طرح سائل صاحب سے معرکے ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ دربار ہال میں، جسے ٹاؤن ہال بھی کہا جاتا تھا، جو بعد کو نگر نگم رنگ شالہ ہو گیا تھا۔ ملکہ باغ، نزد گھنٹہ گھر، چاندنی چوک، دلی میں یومِ داغ کا طرحی مشاعرہ تھا۔ زبردست ہجوم اور نمائندہ مشاہیر کا اجتماع۔ دوسرے شعرا کے علاوہ ابن سائل، قطب الدین فصیح المعروف بہ محمد میاں بھی شامل تھے۔ جب انھوں نے اپنا کلام پڑھا تو بیخود صاحب نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا فصیح ابن سائل۔ توجہ سے کان آگے بڑھا کر محمد میاں کی غزلیں سنی، وہ کامیاب رہے۔ جب پڑھ کے اپنی نشست کی طرف واپس ہوئے تو بیخود صاحب نے بلا کر پوچھا کسے دکھاتے ہو۔ فصیح بھائی نے کہا ابا ہی کو دکھا لیتا ہوں۔ بولے مجھے دکھایا کرو، ہفتے بھر میں ابا سے اچھے شعر کہنے لگو گے۔ محمد میاں نے رات کے کھانے پر سائل صاحب سے یہ بات کہی۔ انھوں نے کہا صبح تیار ہو جانا، گیارہ بجے کے قریب بیخود صاحب کے یہاں چلیں گے۔ اگلی صبح مع فرزند، کچھ ارادتمندوں اور شاگردوں کو ساتھ لے کر یہ قافلہ لال دروازہ، لال کنوا دلی سے گلی مٹیا محل، جامع مسجد پہنچا۔ بڑی حویلی کی گلی نما لمبی ڈیوڑھی سے گزر کر اندر دروازے پر اوپر کی سیڑھیوں کے نزدیک سے خود سائل صاحب نے دستک دی۔ اوپر سے ایک سخت اور کرخت آواز آئی، ''کون ہے؟''۔ جواب ملا ''سائل ہوں۔'' ایک اور جوابی آواز گونجی ''ہاتھ خالی نہیں ہے۔'' اور ساتھ ہی بھدڑ بھدڑ ان کے لی سیدھڑی، (بیخود صاحب کے لیے) بدحواسی میں دوڑتے، کودتے، گرتے پڑتے، زینے سے لپک کر نیچے آئے اور قدمبوسی کر کے ہاتھوں ہاتھ چچا سائل صاحب کو لیا اور وہیں بازو میں بڑی بیٹھک میں نہایت ادب و احترام سے بٹھایا۔ بیخود صاحب بھی آ گئے۔ سائل صاحب نے رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد گفتگو شروع کی اور عرض مطلب پر آئے اور کہا کل رات مشاعرے میں

آپ نے اپنے ولبند محمد میاں سے کچھ فرمایا تھا۔ کہنے لگے تو غلط کیا کہا تھا۔ سائل صاحب نے کہا تو سمجھا لیے اپنے شاگرد کو، مجھے تو شیرینی یہ کھلائے یا آپ، یہ اب بیٹا آپ کا ہوا، اور اس طرح خود لے جا کر فصیح بھائی کو بیخود صاحب کا شاگرد کروا دیا۔ اللہ اللہ یہ ظرف یہ وضعداری اور یہ روایتیں، بس کچھ انھی بزرگوں کا حصہ تھیں۔

اسی طرح ایک واقعہ حضرت صفی لکھنوی کے ساتھ پیش آیا، وہ بھی سن لیجیے۔ اس قصے کو کئی حضرات، مختلف لوگوں سے غلط منسوب کر کے کئی جگہ پیش کرتے آئے ہیں۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ لکھنؤ کے ایک سفر میں مشاعرے کے بعد صفی صاحب نے بیخود صاحب کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ تمام اساتذہ و مشاہیر لکھنؤ موجود تھے۔ ذاتی گفتگو اور ہلکی پھلکی بات چیت کے بعد پرانی تہذیب، وضعداری اور مشاعروں کے معیار، اور کلام کی فصاحت و بلاغت پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ صفی صاحب نے بیخود صاحب سے پوچھا کہ بھائی آپ کے نزدیک اب ہندوستان میں مستند استاد اور شاعر باکمال کون ہے۔ بیخود صاحب پہلے تو ٹالتے رہے، کہ بھائی اب کہاں کے شاعر اور کہاں کی شاعری، کہاں کی استادی، اب بچا ہی کیا ہے۔ کوئی نہیں۔ مگر صفی صاحب کے بار بار اصرار پر بیخود صاحب نے فرمایا، ''بھائی اب تو لے دے کے دو ہی استاد بچے ہیں، ایک تم اور ایک میں اور تم بھی کیا؟''...اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور بات ختم ہوئی۔

آخر عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور مختلف عوارض نے گھیر لیا تھا۔ انتڑیاں اتر آتی تھیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر ہی نماز پڑھ لیتے تھے۔ 2 نومبر 1955 کو اپنے گھر پر ہی انتقال فرمایا۔

1947 کے بعد کافی مضمحل ہو گئے تھے۔ تقسیم وطن کے دوران فسادات کی وجہ سے، میں نے ان کی حفاظت اور خدمت کی غرض سے چاہا کہ کچھ اسپیشل پولیس آفیسر آنرری فورس کے اپنے اسکاؤٹ والنٹیئر ان کی دیکھ بھال کو ان کے گھر پر بٹھا دوں۔ کیونکہ میں اس وقت دلی کے پہلے ہندوستانی ڈپٹی کمشنر شری ایم ایس رندھاوا آئی سی ایس کی طرف سے اسپیشل پولیس کا اعزازی چیف کمپنی کمانڈر مقرر تھا۔ دلی کے بہت سے بزرگوں اور علماء و اساتذہ کے لیے بھی میں نے ایسا ہی کیا تھا مگر دو حضرات نے ''حفاظت'' کے اقدام کو ایک سے جواب کے ساتھ رد اور نامنظور کر دیا۔ ایک حضرت بیخود نے اور

دوسرے مولوی عبدالسلام نیازی نے۔ فرمایا یہ میرا ملک ہے، میرا شہر ہے، میرے باپ دادا کا وطن ہے، لعنت ہے کہ مجھے یہاں جینے کے لیے اپنی حفاظت کا انتظام کروانا پڑے۔ میاں جان تو جان آفریں کی امانت ہے۔ جو اسے منظور ہو۔ بیٹے اِن ''نکیرین'' کو لے جاؤ۔

بہر حال اس پایہ اور شان و مرتبہ کا بزرگ اور ایسا باکمال استاد اب کیا پیدا ہوگا۔ آپ خواجہ باقی باللہ کی درگاہ، واقع قطب روڈ میں مدفون ہیں۔ بیخود صاحب کے شاگردوں میں بے شمار لوگ تھے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر لوگوں میں صابر دہلوی، حکیم جھنتو ل نافذ، سر شنکر لعل، لالہ مرلی دھر شاد، لالہ پنا لعل جوہری، عاصی نظامی، بیتاب دہلوی، یکتا دہلوی، مخمور دہلوی، ابن سائل وغیرہ شامل ہیں۔ آخری دور میں تین چار برس ڈاکٹر کامل قریشی دہلوی نے بھی ان سے استفادہ کیا۔

دوسرے بزرگ استاد اور داغ کے ممتاز شاگرد تھے افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی۔ یہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک برگزیدہ عالم اور دیندار شیعہ مجتہد بھی تھے۔ پنجہ صاحب کشمیری گیٹ، اور موری گیٹ محمد علی بازار کی شیعہ مسجدوں اور خانقاہوں میں آپ کے بہت سے مرید و شاگرد، آپ سے رشد و ہدایت لیتے اور ''مجلسیں'' سنتے۔ بڑے لمبے تڑنگے، مضبوط جسم کے، چوڑے چکلے سینے والے تھے۔ بدن کسرتی، لمبے ہاتھ پاؤں، خوبصورت، سُرخ و سفید رنگ، آخر میں زیادہ تر تہد لنگی وغیرہ زیب تن کرنے لگے تھے۔ ورنہ پہلے چوڑی موری کا پائجامہ پہنتے تھے، لمبا کرتا، واسکٹ، چادر یا شال اور جانماز، چار خانے کا بڑا رومال، چھوٹی سی تسبیح ہاتھ میں۔ ایک لمبا مضبوط ڈنڈا کان سے اوپر تک نکلتا ہوا۔ اوپر چاندی کا متھا۔ نیچے تانبے کے کئی حلقے چھلّے ٹھکے ہوئے۔ مشاعروں میں نہایت گرجدار آواز میں کلام سنانا شروع کرتے، پھر رفتہ رفتہ بہ دیدۂ نم، غمناک بلکہ روتی ہوئی آواز میں پانچ چھ شعر پڑھ کر، غزل مکمل کیے بغیر بیٹھ جاتے، لوگ شور مچاتے.... استاد اور، استاد اور، اٹھتے اور کہتے اب باقی کیا سنو گے سبھی شعر ایسے ہیں:

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

یہ مطلع تو انھوں نے باغ دیوار فتح پوری میں، کٹرہ نیل کے پیچھے، دھرم شالہ لکشمی نرائن بالمقابل ملکہ

باغ، ایک مشاعرے میں اتنے ڈرامائی اور مجلسی انداز میں پڑھا کہ اکثر حاضرین رونے لگے یا نم دیدہ ہو گئے اور محفل میں سناٹا چھا گیا۔ اب ظاہر ہے اس کے بعد جو بھی شاعر آیا، اس کا جو حشر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جوش ملیح آبادی سے بے تکلف دوستانہ تعلقات تھے۔ جوش صاحب دلّی میں جب بھی رہتے، خصوصاً "کلیم" رسالے کے دور میں، تو چھوٹے محمد علی بازار، موری گیٹ میں، ان ہی کے دولت کدے پر شام کی محفلیں بپا ہوتیں۔ مولانا ابوالحسن فکر بھی، جو اس وقت تیج اخبار میں کام کرتے تھے، ان محفلوں میں موجود ہوتے۔ حتیٰ کہ کئی مرتبہ تو جوش صاحب کی "مغرب" کے بعد کی رنگین نشستیں بھی وہیں گرم ہو جاتی تھیں۔

آغا آفتاب قزلباش، آغا سرخوش اور بیگم آغا سحاب قزلباش ان کی اولاد تھے۔ میں 1983 میں کراچی گیا تھا تو ان سب سے ملا تھا۔ اس وقت تک چچی بیگم آغا شاعر زندہ تھیں مگر سکتے کا عالم تھا۔ ان کے شاگردوں میں منشی مہاراج بہادر برق دہلوی نے بہت نام پایا مگر 1936 میں اپنے استاد سے پہلے ہی چل بسے جس کا آغا شاعر کو بہت رنج تھا۔ لالہ دھرم پال گپتا وفا، منشی دکھمبر پرشاد جین گوہر، حکیم حبیب اشعر دہلوی، لالہ شیر سنگھ ناز، نخشب جارچوری، نازاں لطیف، طاہر بریلوی، کیف دہلوی سب ان ہی کے شاگرد تھے۔ منشی شیش چند سکسینہ طالب تلمیذ برق بھی وہاں کے حاضر باشوں میں تھے۔

"شاعر کے سو شعر" کے نام سے ایک کتابچہ، تقسیم سے پہلے دلّی سے شائع ہوا تھا۔ کچھ کلام آغا آفتاب نے کراچی میں بھی شائع کیا ہے۔ غالباً اکتوبر 1940 میں ان کا انتقال ہوا اور یہیں دلّی میں مدفون ہوئے۔

اب جس ہستی کا ذکر کروں گا وہی میرے اوّل ادبی و معنوی استاد تھے غزل پر 1940 سے 1945 تک انھی سے اصلاح لی، (باقی کلام خصوصاً نظمیں، کیفی صاحب کو دکھاتا تھا)، میری مراد ابوالمعظم، نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، جانشین و داماد داغ سے ہے۔ داغ کی رشتے کی بھانجی اور منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم ان کے عقد میں تھیں۔

نواب سائل نہایت وجیہہ، بزرگ تھے۔ انگریزوں کی طرح سُرخ و سپید۔ لمبے تڑنگے، مخملی چو گوشہ ٹوپی، مخملی اور کڑھی ہوئی اچکنیں، چغے، کشمیری ٹپکے اور شال کا استعمال کرتے۔ لمبے لمبے مضبوط ہاتھ پاؤں، کان چوڑے، ناک لمبی اور خوبصورت، جب تک بصارت رہی چشمہ بھی استعمال کر لیتے تھے۔ سفید مغلیہ داڑھی، لمبے سفید بال، کنجی کنجی دلکش آنکھیں، حیدرآباد کے ایک سفر میں زینے پر سے پاؤں پھسلنے پر کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے سے معذور ہو گئے تھے۔ پھر ساری عمر اپنی ذاتی ''ہاتھ رکشا'' میں شام کو گھومنے نکلتے اور عصر سے مغرب تک فصیلی شہر پرانی دلّی کا طواف کرتے ہوئے، جملہ احباب سے ملا کرتے۔ لال دروازہ لال کنواں سے، فتحپوری۔ ہارڈنگ لائبریری وہاں فصیح الدین احمد سیکریٹری دلّی لٹریری سوسائٹی، ایڈیٹر ادیب وسیکریٹری ہارڈنگ لائبریری جواب ہردیال لائبریری کے نام سے موجود ہے، اور بیرسٹر شوبیہ الحسن بختیاری ڈائریکٹر لوکل مائیکروفون اسٹیشن سے ملاقات کرتے۔ پھر لال قلعے کے ساتھ ساتھ جمنا تک جاتے اور گھر پر سارے دن وظیفہ پڑھ پڑھ کر جو آٹے کی گولیاں بناتے رہتے وہ مچھلیوں کے لیے دریا میں ڈال کر پھر شہر کی جانب رخ کرتے۔ وہاں سے کبھی پتھر والے کنویں سے کبھی اڈورڈ پارک اور وکٹوریہ زنانہ ہسپتال کی طرف جواب کستوربہ گاندھی ہسپتال کہلاتا ہے، جامع مسجد آتے۔ وہاں خواجہ حسن نظامی دہلوی، مولانا راشد الخیری سے علیک سلیک کرتے ہوئے نذیریہ کتب خانے میں شاہد احمد دہلوی کو دعا دیتے ہوئے مفتی کفایت اللہ مرحوم کے بالا خانے کے نیچے ان کے فرزند اور اپنے شاگرد مولانا واصف دہلوی کے کتاب خانہ رحیمیہ اردو بازار، جامع مسجد دلّی پر رکشا روک کر کھڑے ہو جاتے۔ وہاں منشی عبدالقدیر، مولوی سمیع اللہ کے علاوہ سارے شہر کے ادیب، شاعر، استاد اور مقامی و بیرونی اہل علم ان سے ملتے اور اپنی ادبی پیاس بجھاتے۔ 1940 سے 1945 تک یہاں سے واپس گھر آنے تک ان کے طواف اور سفر میں بھی اکثر شریک رہا۔ یہاں سے چل کر محلہ شیخ منگلو ہوتے ہوئے چوڑی والان سے سڑک پریم نرائن پر پنڈت امرناتھ ساحر کی لال حویلی پر رکتے۔ 1933 سے 1943 تک جب تک ساحر صاحب زندہ رہے، تب تک سائل صاحب ان سے اسی طرح ملنے جاتے رہے۔ وہاں سے چل کر پھر ہمارے گھر، ابا محترم قبلہ زار صاحب اور میری

والدہ اوران کی شاگرد محترمہ شریمتی برج رانی وکٹوریہ زتشی بیزار دہلوی سے ملاقات کرنے آتے اور خوب گفتگو رہتی۔ انتقال سے آٹھ روز پہلے تک یہ معمول جاری رہا۔ 8 ستمبر 1945 کو ہچکیاں بندھی ہوئی، چہرہ پیلا بلکہ تقریباً سفید پڑا ہوا، ہمارے یہاں تشریف لائے۔ بیرونی کھڑکی کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ میں حسبِ معمول باہر نکلا تو، ان کو دیکھ کر ڈر گیا۔ دوڑ کر والد کو بلا کر لایا۔ انھوں نے کہا آپ نے یہ کیا غضب کیا، اس حالت میں آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ پہلے ان کے حقے میں ہلدی کی گانٹھ رکھ کر دو چار کش پلائے، ہچکی کچھ رکی تو کہا، بھائی ہفتہ بھر سے گھر سے نکلا نہیں تھا، تمھاری بھاوج ہیں نہ بھتیجہ، تنہائی سے بھی اُکتا گیا تھا۔ سوچا چلو بھائی اور بچوں سے مل آؤں۔ والد نے مجھے ان کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ 16 ستمبر 1945 کو انھوں نے جان، جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

دلّی کی وضعداری، طرحداری، بانکپن، آن بان اور شان، شرافت اور رئیسی کا بھرم رکھنے والے صابر و متوکل بزرگ، سراپا دلّی کی تصویر یہ آخری ہستی تھی جس سے دلّی زندہ تھی۔ چھوٹوں کی پذیرائی، معاصرین سے حسنِ اخلاق، بزرگوں کا ادب، ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔

جمیل الدین عالی جو میرے ہم جماعت رہے ہیں، سائل صاحب کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ بیت بازی کے مقابلوں میں، کالج کی طالب علمی کے دوران، نواب صاحب سے الف سے ے تک کی تقطیع کے شعر کہلوائے اور قبلہ زار صاحب سے بھی، خاص کر ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ ز۔ ژ اور ث کے اشعار ان میں بھی ان کی رنگینی الگ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک شعر ڈ (ڈال) کا سنیئے:

ڈال کر تھوڑی سی مے دو شیخ کو
صرف شربت کیوں پلاتے ہو عبث

ناولٹی سنیما کے پیچھے اللہ والوں کا محلہ تھا، جو پھاٹک حبش خاں تک آملتا ہے۔ وہاں ایک شراب کی دُکان کا، سنیما کی طرف ڈفرن برج کے قریب تالہ توڑ لیا گیا۔ صبح صبح سائل صاحب وہاں سے گزرے اور اندر کسی ''مولوی دوست'' سے ملاقات کرنے پہنچے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ایک غزل کے چند شعر موزوں کر لیے۔ مجھے دو شعروں کے الگ الگ دو مصرعے یاد آ رہے ہیں۔

در میخانہ وا ہے اور تہجد کو ہوئی چوری
خدا رکھے محلے میں سبھی اللہ والے ہیں

زندگی میں ہزاروں شعر کہے۔ موٹے موٹے چمڑے کے رجسٹر نما بڑے بڑے قلمی مخطوطے، بہ طور دیوان اور چھوٹی بیاضیں، میں نے خود دیکھی ہیں، ایک مثنوی تاریخ خاندان تیموری، موسوم ''بہ گفتار جہانگیر و نور جہاں'' کوئی سات ہزار اشعار پر مشتمل تحریر کی جو میں نے دیکھی بھی اور پڑھی بھی۔ مگر اب تک کچھ شائع نہیں ہوا۔ صرف ایک معمولی سا کتابچہ بہ عنوان ''پارۂ گلکول'' مولانا واصف نے تقریباً 20 غزلوں کا 1944 میں چھپوا دیا تھا۔ 1983 میں میں کراچی گیا تو منشی عبدالقدیر کے صاحبزادے، علاؤالدین خالد مالک اردو اکادمی سندھ کراچی، نے مجھے بتایا تھا کہ بھائی قطب الدین فصیح ابن سائل انتقال سے پہلے یہ مثنوی انھیں چھاپنے کی غرض سے دے گئے ہیں۔ پھر انھوں نے مجھے وہ کاپیاں دکھائیں۔ میں دیکھتے ہی فوراً پہچان گیا آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا۔ اور بھائی خالد سے کہا اسے سب سے پہلے چھاپیے۔

سائل صاحب سے جب کبھی ان کی زندگی میں کہا کہ اپنا کلام آپ خود چھاپیے یا چھپوانے کو کسی اور کو عطا کر دیجیے تو فرماتے تھے کہ بھائی ہم نے تو حق مہر میں، بیگم کو یہ کلام دے دیا ہے، اب یہ ہماری ملکیت نہیں ہے۔ 1944 میں ایک دن ایک دعوت نامہ میرٹھ سے آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا۔ مصرع طرح کی زمین تھی 'کام آ ہی گیا، جام آ ہی گیا۔ دوپہر کو میں خدمت میں حاضر ہوا تو غزل گنگنا رہے تھے۔ فرمایا بہت اچھے وقت پر آئے۔ میاں اگر طبیعت ٹھیک رہی تو اگلے ہفتے میرٹھ مشاعرے میں چلیں گے۔ لو غزل سنو۔ اور آج تم بھی شعر کہنا۔ کل یا پرسوں غزل سنانا۔ ان کے کمرے سے قریب ہی اندر صحن کی طرف ایک دروازے سے متصل چچی بیگم بھی کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ سائل صاحب نے وہ غزل بہت مدت بعد بڑی سرخوشی کے عالم میں عطا فرمائی۔ دو ایک شعر آپ بھی سنیے:

ان کا پس خوردہ مرے حصے میں جام آ ہی گیا
بعد مدت ہاتھ میں ماہِ تمام آ ہی گیا

چاندنی کو ماند کرنے، وہ نقابِ رخ کے بند
ڈھیلے کرتا، ٹہلتا، بالائے بام آ ہی گیا

چچی فرمانے لگیں" گلزار بیٹے"۔ دیکھا اپنے چچا کو۔ یہ تو حالت ہے درد قولنج، درد نقرس، آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، منھ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں، ابھی دل پکڑے ہیں تو ابھی جگر، گردے کے درد سے نڈھال ہیں۔ ایسے میں معشوق سامنے آئے تو گدھی نظر آئے۔ مگر جب دیکھو جام آ ہی گیا۔ کام آ ہی گیا۔ زیرِ دام آ ہی گیا۔ توبہ توبہ، کوئی حد ہے، نگوڑی شاعری کی۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے بھی ایک شعر موزوں کر کے سنایا:

عظمتِ رفتہ کے اوراقِ پریشاں دیکھ کر
خود بخود ہونٹوں پہ لفظِ انتقام آ ہی گیا

دونوں نے بہت داد دی۔ چچی نے اس دن بہ طورِ خاص، چائے بسکٹ کے علاوہ کباب اور حبشی حلوہ سوہن بھی کھلایا اور گھر لے جانے کو عطا کیا۔

آخری ایام میں، عسرت، بیماری اور ضعیفی تینوں نے مل کر بالکل مضمحل کر دیا تھا۔ مگر ڈیوڑھی میں نوکر، ڈولی کے کہار، گھر کی ماما، ملازمہ، کچھ پالے ہوئے لڑکے لڑکیاں، رکشا والا، اسی طرح مقرر و مامور، کھانا مقوی اور مرغن اور معیاری، قسم قسم کے کھانے۔ توابی کا گرچہ بھرم ہی رہ گیا تھا۔ جائداد اور زیور کوڑیوں کے مول بک رہے تھے، کئی ارادتمند اور شاگرد اور حاضر باش اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لالہ مُصدّی لال جوہری، والد دگمبر پرشاد جین، گوہر دہلوی، بھی ان میں سے ایک تھے۔ شاگردوں میں یوں تو سینکڑوں تھے۔ مگر دو کو بالخصوص اپنی آنکھیں بتاتے تھے۔ فرماتے تھے نظم میں نہال سیوہاروی اور غزل میں خار، میری دو آنکھیں ہیں۔ دوسرے ممتاز شاگردوں میں مولانا واصف دہلوی، میری والدہ بیزار زتشی، کامل نظامی دہلوی، شاکر دہلوی، ذاکر دہلوی، انور دہلوی، واصل دہلوی، نیازمند گلزار دہلوی۔

خار سے تو اتنی محبت تھی کہ ان کی شادی کے موقع پر گھر کی سقیم حالت کے باوجود دلہن بھاوج کے

آنے پر (مئی 1944 میں) چچی بیگم سائل ڈولی میں غریب خانے پر آئیں اور کہاروں کے سر پر کئی تھال پھل، مٹھائی، دلہن کا جوڑا، خار بھائی کے لیے اچکن کا کپڑا اور سونے چاندی کے تہرے چھلے برائے انگشتری۔ اور ہمارے لیے الگ سے کئی تحفے تھے۔ والدین ناراض بھی ہوئے، ناگواری بھی ہوئی، مگر کسی کی ایک نہ چلنے دی، اور سب کچھ عطا فرما کر ہی مانیں۔ اللہ اللہ یہ شان، یہ وضعداری اب کہاں دیکھنے کو ملے گی۔

آخر میں ان کی دو مشہور غزلوں کے چند شعر پیش کرتا ہوں۔ یہ بھی عرض کردوں کہ ترنم سے غزل پڑھنا، مشاعرے میں تو اب سائل ہی کی ایجاد ہے۔ کھرج کی آواز میں، نیم سوز، نیم قرأت، الفاظ کو خاص خاص ٹکڑوں کے بعد توڑ توڑ کر، بڑی پیاری دھیمی لے میں مترنم انداز میں پڑھتے تھے کہ بس جادو سا ہو جاتا تھا۔ ان کے بعد جگر، حفیظ، ساغر اور شکیل بدایونی نے اس انداز کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس کے بعد تو موسیقی کے سُر تال تک غزل خوانی میں داخل ہو گئے۔

لیجیے سائل صاحب کی دو غزلوں میں سے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں اور محظوظ ہوں:

کہیں مجنوں، کہیں وامق رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی
ہمارے نام پر چلتا قلم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے باور ہے، تم جھوٹے نہیں، وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ ناجائز، قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

لکھا نامے میں ہم بہر عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمراہ، اب سمجھا کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شب وعدہ وہ آجائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوالیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ میخانہ، تعجب اس پر آتا ہے

جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے تو اب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں

زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

دوسری غزل بھی ملاحظہ فرمائیں اور ہر جگہ ردیف کے معانی کی وسعت اور تنوع ملاحظہ فرماتے جائیں:

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو

نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑلو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو

تمھیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے، گلابی ہو یا زعفرانی، کہو تو

پلائے کوئی ساقی حور پیکر، مصفا، کشیدہ، پرانی، کہو تو

شبیہہ عدو کے قریں کا مرقع، مجھے ہو عنایت تو احسان مانوں

بناؤں گا تعویذ دل کے سکوں کا، یہ لے لوں تمھاری نشانی، کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو

تمھارے اشارے پہ قربان کردوں ابھی مایۂ زندگانی، کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضہ، مرے سوزِ دردِ نہاں کا ہے کہنا

پھر اس پر یہ تاکید بھی ہے برابر پرائی نہ کہنا کہانی کہو تو

میرے نامۂ شوق کی سطر میں اک جگہ جو ہے سادہ وہ مہمل نہیں ہے

میں ہو جاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اس کے معانی، کہو تو

مقطع دیکھیے یہ ان کے آخری دور کی عبرتناک تصویر اور صحیح صورت حال ہے۔

رکھا ہے تخلص یہ مجبور سائل ہوئی احتیاجوں کی جب اتنی مشکل

ملے دانہ کھانے کو، جب دانہ مانگو، میسر ہو پینے کو پانی، کہو تو

ان کے انتقال کے وقت چچی بیگم پاٹودی میں تھیں اور محمد میاں لاہور میں، میں اکیلا ہی ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ 15 ستمبر کو انتقال ہوا اور 16 ستمبر 1945 کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ احمد شاہ

بخاری پطرس کو فون کیا، انھوں نے ان کی وفات کا ریڈیو سے اعلان کروایا۔ شہر اکٹھا ہو گیا۔ جنازہ لال دروازہ لال کنواں سے دلّی کالج لایا گیا۔ وہاں اندر کی مسجد کے سامنے صحن میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ مصور فطرت شمس العلما خواجہ حسن نظامی، اور قبلہ زار صاحب سب سے آگے پیدل موجود تھے۔ سیکڑوں حضرات شریکِ جنازہ تھے۔ اجمیری گیٹ سے قطب صاحب، خواجہ بختیار کاکی کی خانقاہ کے پیچھے نوابین لوہارو کے خاندانی قبرستان میں اپنے چچا، اور باپ دادا کے پہلو میں دفن ہوئے۔

19 ستمبر 1945 کو ہندو کالج دلّی کی بزمِ ادب کی طرف سے جس کا میں سیکریٹری تھا، ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ مولوی عبدالحق، علامہ کیفی دتاتریہ، علامہ زار، خواجہ حسن نظامی، خواجہ عبدالمجید۔ احمد شاہ بخاری پطرس، مولانا ماہرالقادری راز مرادآبادی، شکیل بدایونی اور دوسرے بہت سے ادبا و شعرا شریک ہوئے۔ اس موقع پر پڑھی گئی نظموں میں سے شکیل کا ایک شعر اور بھائی خار کے دو شعر اب تک زبانی یاد ہیں۔ سن لیجیے شکیل کہتے ہیں:

نکل کر بزمِ آب و رنگ سے جنت میں جا پہنچا
یہ الفاظ دگر پھر داغ کی خدمت میں جا پہنچا

(شکیل بدایونی)

شاعرِ شیوہ بیاں، رنگیں نوا، شیریں سخن
جس کے دم سے تھیں تر و تازہ روایاتِ کہن
جس پہ دلّی ناز کرتی تھی وہ ہستی مٹ گئی
کاش اس دل سے کوئی پوچھے یہ بستی مٹ گئی

(خار دہلوی)

تلامذۂ داغ، عناصر اربعہ میں سے اب آخری ذکر پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی، والد مرحوم کا کروں گا۔

زار صاحب 1870 میں دسہرہ سے تیسرے روز پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد، شاہ جہاں کے

وقت سے شاہ عالم کے وقت تک کشمیر سے نقل مکانی کر کے دلی منتقل ہوتے رہے تھے اور مغلیہ درباروں، اور مغل بادشاہوں سے متعلق منصب داروں، جاگیرداروں، اور امرا کے درباروں سے وابستہ ہوتے جاتے تھے۔ مشیر تعلیم، استاد، اتالیق اور شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے نگراں رہے۔ اکثر کو "رائے رایان" اور "راجہ ولی نعمت" کے خطابوں سے نوازا گیا۔ 24 پشتوں کا شجرہ تو ہمارے بزرگوں کے پاس محفوظ تھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں پہلے 12 پشتوں کے نام نامی گنوائے تھے۔ کشمیر کے بعد لاہور، دلی، پٹیالہ، میرٹھ اور آگرہ میں ہمارے خاندان اور کنبے کی جاگیریں اور جائدادیں 1924 تک قائم تھیں۔ میرٹھ اور آگرہ سے 1924 میں اور لاہور اور پٹیالہ سے 1947 میں "رستگاری" ہوئی۔

والد حسب روایات بوریہ والے حکیم صاحب کے مکتب اور شاہ جی کے تالاب کے مکتب میں داخل ہوئے۔ پھر سینٹ اسٹیفن اسکول اور دلی کالج میں تعلیم حاصل کی اور بعد کو اورینٹل کالج لاہور میں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد سے علوم شرقیہ میں دسترس حاصل کی۔ ابتدا میں مولانا سیف الحق ادیب کو کلام دکھایا۔ اور 1878 میں حکیم اجمل خاں کے والد حکیم محمود خاں صاحب کے ایما پر شریف منزل بلی ماران، دلی میں جہاں استاد فصیح الملک نواب میرزا خاں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ 1878 سے 1905 تک یہ اکتساب فیض جاری رہا۔ کئی سفروں میں بھی زار صاحب ان کے ہمراہ رہتے اور ان سے ملنے کشن کوٹ، لاہور، رامپور اور حیدرآباد بھی جاتے رہتے۔

نہایت وجیہہ، خوش پوش، رئیس طبع، تنک مزاج، "غصیل" نہایت نفیس مقوی اور مرغن، پُر تکلف انواع و اقسام کے کھانے کھاتے۔ معیار اعلیٰ، مقدار کم۔ ہر موسم کے پھل، سبزیاں، پکنے اور عام ہونے سے پہلے لا کر کھاتے اور کھلاتے۔ جوانی میں خوب رنگ رلیاں منائیں۔ شراب و کباب، ناچ گانا مجرے اور احباب کی پُر تکلف دعوتوں میں بڑے بڑے رئیسوں سے مقابلہ کرتے حتیٰ کہ 52-45 برس کی عمر تک اکثر و بیشتر جائداد، باغات، 1922 تک کی لاکھوں کی جائداد کوڑیوں کے مول بیچ کر سب شوق پورے کیے۔ کمخواب، مخمل، زربفت اور بہترین اور قیمتی سے قیمتی انگریزی اور دیسی کپڑے پہنتے۔ ہاتھی پر سیر کرنے نکلتے۔ پہلے سول انجینئرنگ کالج، مغربی گجرات، پنجاب میں

ریاضی اور اکاؤنٹ کے استاد اور نائب پرنسپل رہے۔ وہاں پنڈت بالمکند عرش ملسیانی فرزند پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، ان کے شاگرد رہے۔ ان کا بیان تھا کہ دفتر کا سپرنٹنڈ منٹ کلاس میں ان کے آگے آگے حاضری کا رجسٹر اور قلم دوات لے کر چلتا، حاضری لیتا، اور واپس آتا، تب یہ جماعت کو درس دیتے۔ اس رعب داب اور کرّ وفر کے آدمی تھے۔ 23-1922 میں دلّی واپس آگئے۔ 1924 سے 1960 تک دلّی یونیورسٹی، اور اندر پرستھ کالج برائے خواتین میں 36 برس اردو، فارسی اور عربی زبانیں پڑھائیں۔ 1924 میں ترک دتوبہ کی اور صوفی ہو گئے۔ یہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی صحبت اور دوستی کا فیض تھا۔

میں جب 1926 میں پیدا ہوا، اس وقت وہ تصوف و سریقت، اور جذب سلوک کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ آواز پاٹ دار، تیز اور اونچی، چال نہایت تیز، زبردست خطاط وخوشنویس، کبھی کوئی طغرہ، قصیدہ، سپاسنامہ، کاتب سے نہیں لکھوایا۔ جوانی میں کرکٹ، ہاکی، ٹینس، بلرڈ، پولو، گولف، گھوڑ سواری، نشانہ بازی، شکار، اور پہلوانی سے بھی شغل رہا۔ پہلے جارج پنجم کی سی مونچھیں رکھتے تھے جو بہت خوشنما لگتی تھیں۔ دلّی والوں کا یہ بیان تھا کہ جہاں سائل اور زار کی جُگل جوڑی نکل جاتی، سرراہ بھی اور بام و در پر بھی خواتین حیران و ششدر دیکھتی اور انگشت بہ دنداں ہو جاتیں۔ یہ دونوں حضرات بڑھاپے تک، کم از کم 70 برس تک ایسے ہی حسین وجمیل اور خوبصورت رہے کہ جوانیاں رشک کریں۔

زار صاحب 7 برس کی عمر سے 95 برس کی عمر تک شعر کہتے رہے۔ ہر مشاعرے میں سہ غزلہ، چو غزلہ پڑھتے۔ وہ بھی 35-35 اشعار کی غزلوں پر مشتمل۔ عجیب عجیب انداز سے شعر کہتے۔ کوئی مضمون اور قافیہ شاید ہی چھوٹا ہو۔ تینوں گیتاؤں کا یعنی شریمد بھگوت گیتا، اشٹاوکر گیتا اور اودھت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا۔ اور کئی برس تک بکسوں، الماریوں، پیٹیوں، سوٹ کیسوں اور کپڑے کی تھیلیوں میں گانٹھ باندھ کر رکھا۔ کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی بلکہ ان کے کمرے میں گھسنے تک کی ممانعت تھی۔ کس کی ہمت تھی کہ سرمو حکم عدولی کر سکتا۔

آخر یہ لاکھوں اشعار کا سرمایہ، بے نیازی اور قلندری کی نذر ہوا۔ بارش، دھوپ اور کیڑوں کی خوراک بنا۔ بہ مشکل دو تین سو غزلیں میں بچا پایا۔ 1947 تک جب میں 21 برس کا ہوا اور میری

حیثیت کا اعتبار میرے بزرگوں کو آیا، اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ تو ان کے انتقال پر عزیز وارثی اور میں نے مل کر "ندائے اتحاد" کا زار نمبر نکالا اور اس میں ان کے متعدد قطعات تاریخ اور کوئی دو سو غزلیں محفوظ کر دیں۔

تاریخ گوئی پر اتنی قدرت تھی کہ دو یا چار اشعار کے قطعات میں، پانچ پانچ تاریخیں نکالتے۔ ہجری، عیسوی، بکری، فصلی، ساکا۔ وغیرہ۔ کئی مرتبہ ایک ہی مصرعے میں الفاظ کے اضافوں سے تاریخیں نکلتی تھیں۔ مثلاً حضرتِ نوح ناروی کے انتقال پر میں نے ایک جلسہ کیا، اس میں تشریف لائے اور کوئی پانچ سات اشعار کہے اس میں ایک مصرع تھا

"غرقِ لجنِ عتیق جامی"....اس میں غرق لجن میں ایک تاریخ ہے۔ "غرقِ لجنِ عتیق" میں دوسری تاریخ ہے۔ اور پورے مصرعے میں تیسری تاریخ ہے۔ اسی طرح صنعتِ توشیح میں بے پناہ تاریخیں کہتے۔ ہر شعر کے مصرع اولیٰ کے حروفِ اوّل کے اجتماع سے ایک تاریخ۔ دوسرے مصرعوں کے حروف اوّل کے اجتماع سے دوسری تاریخ، اور قطع کے دونوں مصرعوں سے دو دو سری تاریخیں۔

55 برس تک تو اپنے استاد داغ کے رنگ میں عاشقانہ غزلیں کہتے رہے۔ مگر آخری 45-40 برس حمد، نعت، سلام، ویدانت، تصوّف، عرفانیات، طریقت، جذب وسلوک، مجادلہ، مجاہدہ، مراقبہ اور مکاشفوں کی شاعری کی۔ میں نے انھیں اسی رنگ میں پایا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ان کے انتقال پر ستمبر 1965 کے برہان میں لکھا کہ مجھے جب کوئی دقّت یا مشکل پیش آتی اور کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آتا، خواہ ادب کا ہو یا دین کا، یا مغلیہ کھیلوں کا، جس میں گنجفہ شامل ہے، یا محاورہ اور روزمرّہ کا، تو میں مفتی کفایت اللہؒ کے بعد سید حا زار صاحب کی خدمت میں جا کر اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، قرۃ العین حیدر، عرش ملسیانی، جمیل الدین عالی اور یہ نیاز مند، ان کے چند شاگردوں میں ہیں۔

زار صاحب نے حفاظت نیز بہتر استعمال کے خیال سے اساتذہ کے خطوط اور تصویریں، اپنا بہت سا کلام اور یادداشتیں، اور کتابیں، ایک حصہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کو 1924 سے پہلے اور 1930-1035 میں، مہیش پرشاد کو بنارس یونیورسٹی، شعبۂ فارسی و عربی کے لیے، اور 40-1939 میں،

مولوی عبدالحق اور کیفی صاحب کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو (ہند) کو دے دی تھیں۔ظاہر ہے یہ ایک بہتر اور مفید اقدام تھا مگر 1947 کے بعد اس سرمائے کا جو حشر ہوا وہ سوچ کر اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اس میں میر مہدی مجروح، داغ، حالی، آزاد، شبلی، امیر مینائی ایسے اساتذہ اور زار صاحب کے اپنے معاصر اساتذہ و مشاہیر کے خطوط شامل تھے، سب تلف ہو گئے۔زار صاحب 1895 میں یورپ اور لندن کے سفر پر بھی تشریف لے گئے اور وہاں کی باکمال ہستیوں سے ملے۔

دلی، لکھنؤ، حیدرآباد، الہ آباد، جے پور، لائل پور، لاہور، رامپور، بھوپال، پٹیالہ، میرٹھ اور اکبر آباد کے عمائدین، روسا، اہل علم، افراد اور اداروں نے 1920 سے 1947 تک آپ کی بے حد پذیرائی اور قدر افزائی کی اور اعزازات و خطابات سے نوازا۔

ان کے فیضان صحبت کا یہ اثر تھا کہ میری والدہ اور کئی ماموں شاعر ہوئے، پنڈت گردھاری موہن کول عاشق تو اپنا مطبوعہ دیوان یادگار چھوڑ گئے۔پنڈت اومکار ناتھ زتشی۔پانچ میں سے تین بھائی شاعر، پنڈت دینا ناتھ زتشی۔بسمل اور آزاد تخلص کرتے تھے۔1978 میں 78 برس کی عمر میں ان کا دلی میں انتقال ہوا۔ریڈیو اور ٹی وی آرٹسٹ تھے۔بلراج ساہنی کی پکچر ''گرم ہوا'' میں انھوں نے مرزا جی کا پارٹ ادا کیا تھا۔پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خار دہلوی، یادگار سائل کو تو اکثر حضرات اب بخوبی جانتے ہی ہیں۔''خلشِ خار'' آپ کا دیوان، کچھ برس ہوئے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے۔باقی گھر والے بھی کچھ نہ کچھ کہہ لیتے ہیں، مگر کم۔سب خوش مذاق، ذوق سلیم اور سخن فہمی سے آراستہ۔

مشرقی تہذیب کے ایسے دلدادہ ہوئے کہ 1920 کے ہوم رول تحریک اور خلافت تحریک کے بعد، ہندوستان، ایشیا اور مشرق کی برائی، یا علوم شرقیہ، اردو و فارسی، اور پرانی وضع قطع، لباس، اور نشست برخاستگی بدگوئی یا توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

آخر میں ان کی دو غزلوں کے چند منتخب اشعار سن لیجیے، ایک غزل تو اپنے استاد تو اب مرزا داغ کے رنگ میں ہے، اور دوسری خواجہ میر درد کے رنگ میں، بلکہ جس رنگ میں میں نے انھیں دیکھا۔

پہلی غزل ملاحظہ ہو:

کھلا پھولا گلِ زخمِ جگر ہے سہیلِ آبیاری چشمِ تر ہے
گئی انگڑائیاں لینے جوانی نہ آنچل کی نہ دامن کی خبر ہے
نہیں آنکھوں میں کوئی بھی سماتا بہت اونچی تری نیچی نظر ہے
کمائی عمر بھر کی زار اپنی یہی لے دے کے اِک زخمِ جگر ہے

دوسری غزل میں فرماتے ہیں:

انا الحق جزو لا ینفک بنا ہے میرے ایقاں کا یہی ہے قُل ہو اللہ احد مستوں کے قرآں کا
اَلِف الحمد کا قشقہ ہے میرے نورِ ایماں کا بنا ہر رشتہ زُنّار گلو تارِ رگِ جاں کا
ملا جو بے تمنّا دل اَزل میں اہلِ باطن کو وہی ہے دیرِ ترسا کا، وہی کعبہ مسلماں کا
عَلَم نشرح ہوا سرِّ خفی ہذیانِ مستی میں یہ خمیازہ ہوا اے زار اپنے حالِ وجداں کا

میں نے 1957 میں دلّی میں بہت بڑے پیمانے پر ایک آل انڈیا یومِ داغ کا جلسہ اور طرحی مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ داغ ہی کا ایک مصرع طرح تھا: ''آپ بندہ نواز کیا جانیں''۔ مخالفینِ داغ کی نذر اسی غزل کے تین شعر حاضر کر کے اجازت چاہتا ہوں کہ:

لغزشوں میں ادا ہوئے سجدے ہم طریقِ نماز کیا جانیں
کون مومن ہے کون کافر ہے رند یہ امتیاز کیا جانیں
ہم سمجھتے ہیں داغ کو، جی ہم '' آپ بندہ نواز کیا جانیں''

● ● ●

E - 99,
Sector- 26, Noida
(U.P.)

سیّدہ جعفر

داغ کا قیامِ حیدرآباد

آصف جاہی سلطنت کے چھٹے حکمران میر محبوب علی خاں تھے۔ آصف سادس نے حیدرآبادی عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی اور شمالی ہند میں ان کی داد و دہش، علم پروری اور ادب نوازی کے بڑے چرچے تھے۔ ''عرضِ ہنر'' کی تمنا میں اربابِ فن شاعر اور ادیب ریاست حیدرآباد کا رخ کرنا چاہتے تھے۔ نثار علی شہرت اور سیف الحق دہلوی ادیب کی خواہش تھی کہ داغ حیدرآباد آ کر قسمت آزمائی کریں۔ انھوں نے بعض ارکانِ ریاست سے مشورے کے بعد داغ کو خط لکھا تھا کہ وہ حیدرآباد چلے آئیں چنانچہ 7 اپریل 1888 مطابق 14 رجب 1305ھ کو داغ حیدرآباد پہنچے اور بازار سدی عنبر میں قیام کیا داغ کا مکان سیف الحق دہلوی ادیب مترجم اخبارات سرکاری کے گھر کے قریب تھا اور داغ ان کے مہمان ہوئے تھے (1) تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ داغ نے حیدرآباد میں 7 اپریل 1888 سے 12 جولائی 1889 تک قیام کیا اور پھر بنگلور اور ممبئی وغیرہ گھومتے ہوئے دلی پہنچ گئے۔ (2)

حاجی محمد ابراہیم خانسامانِ شاہی شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور داغ سے ان کی خط و کتابت تھی اور انھوں نے بھی داغ کو حیدرآباد آنے کی ترغیب دی تھی۔ (3)

بقول غلام صمدانی گوہر'' پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بنسی راج کی معرفت پیش گاہ اقدس میں بھیجی گئی تھی'' (4) راجہ گردھاری پرشاد اور حاجی ابراہیم خانساماں کو شاہ دکن کا تقرب حاصل تھا انھوں نے نظام سے داغ کے کلام کی تعریف کر کے بھی شمالی ہند کے اس خوش گو شاعر کی ان کے دل میں جگہ بنا دی تھی۔ نثار علی شہرت'' آئینۂ داغ'' میں لکھتے ہیں کہ نظام ششم نے داغ کے اشعار ملاحظہ فرمائے تھے۔ (5) اہل حیدرآباد داغ کی شاعری کے مداح تھے۔ دال منڈی کے ناٹک میں حیدرآباد کے شیدائیانِ شعر و سخن داغ کی وہ غزلیں سن چکے تھے جن میں زبان کا چٹخارہ بھی موجود تھا۔ سلاست و روانی، رنگینی و شگفتگی کے ساتھ ساتھ وہ سحر آفرینی بھی موجود تھی جو دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ اقبال کے

الفاظ میں داغ ایک ایسا "ناوک فگن" تھا جو "دل" پر "تیر" چلاتا تھا اور اہل حیدرآباد کے دلوں پر یہ تیر چل چکے تھے۔ "گلزار داغ" کے ساتھ داغ کی شہرت حیدرآباد پہنچ چکی تھی۔

راجہ گردھاری پرشاد نے داغ کا وہ قصیدہ جو انھوں نے والیِ ریاست میر محبوب علی خان کی شان میں لکھا تھا، آصف سادس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ داغ نے راجہ صاحب کے ذریعے سے ایک عرضی نظام حیدرآباد کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ عرضی کے جواب میں باریابی کا حکم ہوا تھا اور داغ نے حاضر دربار ہو کر یہ قصیدہ میر محبوب علی خاں کی نذر کیا تھا۔

میں ہوا بادِ یہ پیما طرفِ ملکِ دکن
سرمۂ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن
نازنینوں کی کمر بید کی شاخ لرزاں
موجۂ ریگِ رواں زلفِ پریشاں کی شکن

داغ کے قیام حیدرآباد کی کہی ہوئی یہ غزل عوام میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

لے چلا جان مری روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داغ کو حیدرآباد کی سکونت پسند آئی تھی چنانچہ اسی غزل میں داغ نے کہا تھا۔

آرزو ہی نہ رہی صبح وطن کی مجھ کو
شام غربت ہے عجب وقت سہانا تیرا

داغ حیدرآباد میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتے تھے اور "دن رات" "لطف شاہانہ" سے محظوظ ہونے کے متمنی تھے۔

میرزا داغ ہوں اور شاہ دکن مورد لطف
اور دن رات رہے لطف شاہانہ تیرا

حیدرآباد میں داغ کے متعدد مداح اور قدرداں پیدا ہو گئے تھے۔ ریاست کے بس سرا نے ان کی شاگردی بھی اختیار کی تھی چنانچہ میر محمد علی خاں رنج اور میر مہدی حسین آلم اسی زمانے کے تلامذہ ہیں۔ مشاعروں میں داغ نے اپنی خوش گوئی اور استادی کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس زمانے میں وہ حیدرآباد کے محلے افضل گنج میں قیام پذیر تھے چنانچہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

اٹھاتے ہیں مزے دنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو افضل گنج اپنی عیش منزل ہے

لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر داغ نے حیدرآباد کو خیرباد کہا احسن مارہروی، غلام صمدانی گوہر اور کلب علی خاں فائق لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے اخراجات سے پریشان ہو کر داغ نے یہاں کی سکونت ترک کی تھی۔ داغ اپنے ساتھ جو رقم لائے تھے وہ خرچ ہو چکی تھی کنور اعتماد علی خاں کو اس کا حال اپنے ایک مکتوب میں اس طرح لکھا ہے "میں اپنی زندگی سے زیادہ آپ کی دعا مانگتا ہوں کہ آپ ہی پیٹ کی خبر لے رہے ہیں۔ معاملۂ معلومہ کا خیال رہے جس کا وعدہ مہینے بھر کا ہے ورنہ زہر کھانا پڑے گا۔ میں باہر نہیں نکلتا کہ قرض خواہ تکلیف دیتے ہیں (6)

آصف سادس میر محبوب علی خان داغ کی شعر گوئی کے دلدادہ ہو گئے تھے "تزک محبوبیہ" سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نواب داور الملک بہادر کے ذریعے سے داغ کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی۔ تمکین کاظمی کا بیان ہے کہ دلی میں نو مہینے رہ کر داغ نے 29 مارچ 1890 کو دوبارا حیدرآباد کا رخ کیا تھا۔(7) اس مرتبہ داغ نے محلہ محبوب گنج میں کمان کے قریب ایک مکان میں رہائش اختیار کی تھی۔ نور محمد نوری رقمطراز ہیں کہ اس مکان میں ایک بڑا ہال تھا جس میں پچاس ساٹھ اشخاص کی نشست کی گنجائش تھی اس سے متصل حجرہ تھا اور یہی داغ کی خواب گاہ تھی۔(8) داغ اس گھر میں کچھ عرصے مقیم رہے اور پھر ترپ بازار کی ایک کشادہ اور شاندار کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

1891 میں میر محبوب علی خاں نظام ششم نے داغ کی خدمت میں اپنی پہلی غزل اصلاح کے لیے ارسال کی۔ 26 جمادی الثانی 1308ھ مطابق 6 فروری 1891 اتوار کی شب نو بجے چوبدار ایک سر بمہر لفافے میں غزل لے کر حاضر ہوا اور صبح دربار میں باریاب ہونے کی خوشخبری بھی دی (9) دوسرے دن علی الصبح داغ دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔ باریابی کا شرف حاصل ہوا تو اپنے ورود حیدرآباد کی حسب ذیل تاریخ نظام کے ملاحظے میں پیش کی۔

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا
بڑے شوق سے اور ارمان سے

حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر
یہ کہہ دو ملے داغ سلطان سے
1305

داغ کو چودہ پندرہ برس تک سلطانِ وقت کی استادی کا شرف حاصل رہا اور وہ آصف جاہ سادس کے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ میر محبوب علی خان نظام ششم شاعر تھے اور ان کا تخلص آصف تھا۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ اپنے استاد داغ سے اثر پذیری جھلک گئی ہے۔ کلامِ آصف میں محاورہ اور روزمرہ کا برجستہ استعمال، عاشقانہ مضامین اور رنگین خیالی داغ کا فیضان معلوم ہوتی ہے۔ اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود آصف سادس نے شعر گوئی کا مشغلہ جاری رکھا تھا۔ نوح ناروی سے داغ نے کہا تھا کہ بادشاہوں کے اشعار کی اصلاح کے آداب یہ ہیں کہ دست مبارک سے تحریر کیے ہوئے الفاظ قلم زد نہیں کیے جاتے بلکہ ان پر اصلاحی لفظ یا مصرعہ لکھدیا جاتا ہے۔ (10)

میر محبوب علی خاں کی مسند کے قریب مخصوص امرائے عظام اور چند خاص عہدیداروں کو نشست کی اجازت تھی اور ان میں داغ بھی تھے۔ قیام رام پور میں داغ کو وہ اعزازات حاصل نہیں ہوئے تھے جو حیدرآباد میں آصف سادس نے عطا کیے۔ اس کے باوجود رام پور کی پرلطف محفلوں کی یاد داغ کے دل سے محو نہیں ہو سکی تھی چنانچہ اپنی ایک غزل میں داغ کہتے ہیں ۔

یاد آتے ہیں وہ اشخاصِ مصاحب منزل
دو گھڑی جلسہ وہ احباب کہ شامل اپنا
نہیں اکثر کا پتہ اور جو کچھ باقی ہیں
ان سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

امیر مینائی 5 ستمبر 1900 کو حیدرآباد آ کر داغ کے مہمان ہوئے تھے لیکن قضا و قدر نے انھیں یہاں زیادہ قیام کی اجازت نہیں دی 13 اکتوبر 1900 کو امیر مینائی نے اس دار فانی سے کوچ کیا اور ''غربت میں'' موت نے ''مینائے امیر'' توڑ ڈالی۔ داغ نے اپنے دیرینہ احباب کی مفارقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔

داغ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوئی
ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

امیر مینائی اور جلال کی جدائی کا داغ کو بڑا قلق رہا۔ داغ کا دل چاہتا تھا کہ لکھنؤ پہنچ کر اپنے ان دوستوں سے ملاقات کریں۔

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

آصف جاہ سادس کی استادی کا شرف حاصل ہونے کے بعد ریاست حیدر آباد کی طرف سے متعدد اعزازات سے داغ کو نوازا گیا۔ داغ ''جہان استاد''، ''نواب فصیح الملک''، ''ناظم یار جنگ'' اور ''دبیر الدولہ'' جیسے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ وہ ان خطابات میں سے صرف ''فصیح الملک'' کو استعمال کرتے تھے۔ راقمۃ الحروف نے تلاشِ بسیار کے بعد محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد کی پرانی فائیلوں سے داغ کے خطابات کی تفصیل حاصل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں داغ کا خطاب ناظم جنگ تجویز کیا گیا تھا لیکن یہ خطاب امین جنگ کے ''علاقے کا خطاب'' تھا لہٰذا ناظم یار جنگ خطاب قرار پایا۔ ''تختۂ سرفرازی مناصب وخطابات'' کے الفاظ ''بتقریب جشن سالگرہ مبارک بتاریخ 27 ماہ ربیع الثانی 1311ھ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ آصف سادس کے جشن سالگرہ کے موقعے پر ''ناظم یار جنگ'' اور ''دبیر الدولہ''، ''فصیح الملک''، ''بلبل ہندوستان'' اور ''جہان استاد'' کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ منصب چہار ہزاری اور سہ ہزار سوار وعلم ونقارہ سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ (11) میر محبوب علی خاں نے اپنے استاد کو ایک گاؤں بھی عنایت فرمایا تھا اور ''تزک محبوبیہ'' کے بیان کے مطابق ایک باغ بھی مرحمت فرمایا تھا۔ (12)

حیدر آباد میں چھٹے آصف جاہی حکمران نے داغ کی جو قدر و منزلت کی اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ داغ شاہی محلے کے رکن تھے اور انھیں امرائے عظام کی طرح دربار میں بلایا جاتا تھا۔ داغ نے اپنے بعض اشعار میں اپنی اس خوش نصیبی کا ذکر کیا ہے۔

ہے لاکھ شکر کہ اے داغ آجکل
آرام سے گزرتی ہے شاہ دکن کے ساتھ

شاہ میرا قدر داں، احباب میرے مہرباں
میں دکن میں جب سے ہوں اے داغ اک جنت میں ہوں
کی مری قدر مثلِ شاہِ دکن
کسی نواب نے نہ راجا نے

داغ نے حیدرآباد میں جو غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی اس کا سبب محض ان کی شاعرانہ عظمت ہی نہیں تھی بلکہ ان کی خوش اخلاقی اور ملنساری اور سادگی نے بھی دلوں کو موہ لیا تھا۔ "دبدبۂ آصفی" 6 ذی الحجہ 1322ھ میں داغ کے اخلاق اور ان کی شخصی خوبیوں کو بہت سراہا گیا تھا۔ "دبدبۂ آصفی" کے مہتمم لکھتے ہیں "مرحوم داغ کی یہ خوبی بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کے کلام پر اعتراض نہیں کیا اور نہ کسی معترض کا جواب دیا (13)

حجاب کو داغ نے 3 جولائی 1883 کو کلکتہ میں اس کے گھر پر خدا حافظ کہا تھا (14) ساڑھے انیس سال بعد حیدرآباد میں اپنے گھر پر 18 یا 19 جنوری 1903 کو حجاب کا خیر مقدم کیا۔ رفیق مارہروی نے "زبان داغ" میں حجاب کے حیدرآباد آنے کا سنہ 1902 تحریر کیا ہے۔ (15)

تمکین کاظمی "معاشقۂ داغ و حجاب" میں لکھتے ہیں کہ "یہ صرف وضعداری اور دل لگی تھی۔ اس جذبۂ تفریح کو محبت سے دور کا واسطہ نہ تھا دونوں طرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ داغ اپنی دولت و امارت کا نقش حجاب کے دل پر بٹھانا چاہتے تھے اور حجاب کی نظر داغ کی دولت پر تھی" (16) تمکین کاظمی کے اس بیان کی تصدیق داغ کے اس شعر سے ہوتی ہے ۔

داغ سے کہتے ہیں سب دے دو مجھے
جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے

اختر جان گانا سنانے پر داغ کے یہاں ملازم تھی اس کی موجودگی حجاب کو پسند نہیں تھی۔ حجاب اور داغ کے تعلقات رفتہ رفتہ بہت کشیدہ ہو گئے۔ "انشائے داغ" میں اختر جان کی مدت ملازمت ڈیڑھ سال بتائی گئی ہے۔ (17) داغ نے حجاب کے لیے علحدہ مکان کا انتظام کر دیا تھا پہلے ساٹھ اور پھر سو روپیہ تنخواہ مقرر کر دی۔ (18) لیکن حجاب اس تنخواہ سے خوش نہیں تھی۔ داغ نے حیدرآباد کے نواب حسن علی خان کو جو ان کے خاص تلامذہ میں سے تھے، لکھا تھا۔

"حجاب کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ آئے دن سرگرداں رہتی ہے۔ وہ ہنسی دل لگی وہ مشغول سب غائب.... کل اختر جان کے باب میں دیر تک جھگڑا کرتیں رہیں۔ گانا سننے کا نہ صرف مجھے شوق ہے بلکہ موسیقی کا دیوانہ ہوں۔ ان ناچاقیوں میں میری یہ خواہش کیسے پوری ہو۔

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں (19)

اگست 1904 کو حجاب کلکتے واپس ہوگئی۔

آصف سادس نے ابتدا میں داغ کی تنخواہ بقول احسن مارہروی چار سو روپے ماہانہ مقرر کی تھی اور تین سال تک داغ کو یہی تنخواہ ملتی رہی۔ داغ اپنی اس تنخواہ سے مطمئن تھے۔ "تزک محبوبیہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ 20 ربیع الاوّل 1309ھ کو ایک مراسلہ (نمبر 75 پولٹیکل وفینانس) جاری کیا گیا جس کی رو سے ان کی تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ سکۂ حالی مقرر ہوئی تھی۔ (20) 1312ھ میں ساڑھے پانچ سو کا اضافہ ہوا اور جملہ ایک ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر ہوگیا۔ (21) داغ نے اس مرحمت شاہی کی یہ تاریخ کہی تھی۔

ہو گیا میرا اضافہ آج دونے سے سوا
یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس اضافے کی کہو تاریخ یہ اے داغ تم
ابتدا سے اپنی ساڑھے پانچ سو نقدی بڑھی

داغ نے اپنی رفیقۂ حیات کو نومبر یا دسمبر 1891 میں حیدرآباد بلا لیا تھا۔ وہ حیدرآباد میں داغ کے ساتھ سات سال اور چند ماہ رہیں اور پھر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انھوں نے رجب 1316ھ مطابق 1898 کو رحلت کی تھی۔ داغ کو اپنی رفیقۂ حیات کی وفات کا بڑا صدمہ تھا۔

داغ حیدرآباد میں کم وبیش سترہ سال قیام پذیر رہے لیکن اپنے لیے کوئی مکان تعمیر نہیں کروایا۔ ان کے احباب مکان خریدنے یا تعمیر کرنے کا ذکر کرتے تو وہ ٹال دیتے تھے، داغ کی خواہش تھی کہ آصف سادس انھیں مکان عنایت فرمائیں چنانچہ اپنے ایک شعر میں لکھتے ہیں۔

حضور دیں گے تمھیں چند روز میں اے داغ
اٹھاؤ اور کوئی دن مکان کی تکلیف

شہر حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد میں داغ کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔نوراللہ محمد نوری نے داغ کے تلامذہ کی تعداد پانچ ہزار بتائی ہے(22)لیکن نوح ناروی نے تلامذۂ داغ کی تعداد تقریباً دو ہزار تحریر کی ہے۔سخاوت مرزا نے کنج نشین بیدری کے حوالے سے لکھا ہے کہ داغ کے پاس اپنے شاگردوں کا باقاعدہ رجسٹر تھا جس میں شاگرد کا نام پتہ پیشہ اور دیگر تفصیلات درج کی جاتی تھیں۔

آخری ایام میں داغ کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔وہ نقرس کی درد سے پریشان رہتے تھے۔

جو گزرتی ہے ہم کہیں کس سے
تنگ آئے ہیں درد نقرس سے

داغ کے مرض الموت کی تفصیل یہ ہے کہ وہ آٹھ دن تک بستر علالت پر موت سے لڑتے رہے۔ جسم کے بائیں جانب کا حصہ فالج سے متاثر ہو گیا تھا۔عبدالمجید آزاد کا بیان ہے کہ آخری زمانہ حیات میں داغ کو زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا اور انھوں نے آزاد سے کہا تھا:۔

''اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی۔گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔غزل کہنے اور سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے.....یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

9ذی الحجہ 1322ھ کی شام داغ نے اس دارفانی سے کوچ کیا اس وقت ان کی عمر شمسی حساب سے چوہتر(74)سال تھی میر محبوب علی خاں آصف سادس کو اپنے استاد کی رحلت کا بڑا قلق ہوا تھا۔ انھوں نے داغ کی شایان شان تجہیز و تکفین کے لیے شاہی خزانے سے تین ہزار روپے بھجوائے تھے۔ عیدالضحیٰ کی صبح کو داغ کی نماز جنازہ مکہ مسجد میں ادا کی گئی۔انھیں درگاہ یوسفین میں ان کی رفیقہ حیات کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔سرور جہان آبادی نے اپنے ایک مرثیے میں خاک دکن سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

داغ و امیر کے لب اظہار بھیج دے
نطق فصیح و شوخی گفتار بھیج دے
تاج سخن کے گوہر شہوار بھیج دے
منگواتے ہیں نظام کی سرکار بھیج دے

ان موتیوں کو خاک دکن کیا کرے گی تو
کس پر نثار یہ دُر یکتا کرے گی تو

●

حواشی

1۔ نثار علی شہرت۔ آئینۂ داغ۔ ص، 44
2۔ کلب علی فائق۔ مقدمہ مہتاب داغ۔ ص، 85
3۔ تمکین کاظمی۔ داغ۔ ص، 99
4۔ تزک محبوبیہ۔ جلد دوم۔ دفتر ہفتم۔ ردیف د۔ ص 33
5۔ ایضاً ص 44
6۔ زبان داغ۔ ص، 171
7۔ فصیح الملک داغ دہلوی (مضمون) مشمولہ رسالہ نورس اپریل، 1958، ص:97
8۔ داغ۔ ص، 15
9۔ محمد اکبر خاں افسوں۔ یادگار داغ۔ ص، 22
10۔ نوح ناروی۔ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی۔ (مضمون) مشمولہ رسالہ نگار داغ نمبر 1953 ص، 20
11۔ تحفہ جات سرفرازی، مناصب و خطابات در جشن سالگرہ مبارک بابت 17 ربیع الثانی 1311ھ

سلسلہ 15

12۔ غلام صمدانی گوہر۔ تزک محبوبیہ۔ جلد دوم۔ ص، 32

13۔ ایضاً ص، 4

14۔ تمکین کاظمی۔ معاشقۂ داغ و حجاب۔ ص، 68

15۔ ایضاً ص 33

16۔ ایضاً ص 69

17۔ احسن مارہروی۔ انشائے داغ۔ فصل دوم۔ ص، 78

18۔ تمکین کاظمی۔ معاشقۂ داغ و حجاب۔ ص، 83

19۔ رفیق مارہروی۔ مسودہ خطوط داغ۔ ص، 33

20۔ غلام صمدانی گوہر۔ تزک محبوبیہ۔ حصہ دوم ص، 33

21۔ احسن مارہروی۔ مقدمہ منتخب داغ۔ ص، ف

22۔ داغ۔ ص، 177

●●●

9-1-34/1, Langar House
Hyderabad - 500008 (A.P.)

لطف الرحمٰن

داغ دہلوی اور ان کی شاعری

داغ دہلوی اردو غزل کے ایک ممتاز دبستان کے موجد ہیں، ان کی جمالیاتی شخصیت کی تعیین کے لیے ناگزیر ہے کہ ان کے مختصر حالات زندگی پیش نظر رہیں۔

داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکا کے رئیس تھے، دہلی میں ایک کشمیری تھے یوسف سادہ کار، ان کی دو صاحب زادیاں تھیں (1)، بڑی بیٹی عمدہ بیگم اور دوسری وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم۔ نواب شمس الدین احمد خاں وزیر بیگم پر فریفتہ ہو گئے اور انھیں اپنے ساتھ فیروز پور لے گئے۔ عمدہ بیگم پہلے ہی والی رامپور نواب یوسف علی خاں سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ ان کا قیام رامپور اور دلّی دونوں جگہوں پر رہتا تھا۔ یہی حال وزیر بیگم کا بھی تھا، وہ بھی دہلی اور فیروز پور میں اقامت گزیں رہتی تھیں۔

25 مئی 1831 کو داغ چاندنی چوک دہلی کے ایک کوچے میں پیدا ہوئے، اب وہ کوچہ، کوچہ استاد داغ کہلاتا ہے۔ نومولود کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ آگے چل کر ابراہیم نے اپنا نام نواب میرزا خاں رکھا۔ اس تبدیلی نام کے متعلق تیقن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

داغ چار برس چار ماہ کے تھے کہ ان کے والد پر دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کا الزام عاید ہوا۔ ولیم فریزر کو نواب موصوف کے ملازم کریم خاں نے قتل کیا تھا۔ چوں کہ نواب شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے تعلقات بوجوہ بہت کشیدہ تھے، اس لیے الزام نواب صاحب کے سر آیا۔ مقدمے کی رسمی کارروائی کے بعد نواب موصوف کو پھانسی دے دی گئی۔ وزیر بیگم اور داغ کے لیے یہ حادثہ قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ چوں کہ وزیر بیگم کی نواب صاحب سے باضابطہ شادی نہیں ہوئی تھی، اس لیے وراثت کے حق سے بھی محرومی مقدر رہوئی۔

1- کالی داس گپتا رضا کی تحقیق ہے کہ ان کی تین بیٹیاں تھیں — ادارہ

اس حادثے کے بعد وزیر بیگم نواب شمس الدین احمد خاں کے سوتیلے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر ورخشاں سے متعلق ہوگئیں اور داغ اپنی خالہ عمدہ بیگم کی نگرانی میں رام پور میں رہے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد وزیر بیگم آغا ابوتراب علی کے ساتھ رہنے لگیں۔ نواب ضیاء الدین سے کوئی اولاد نہ ہوئی، آغا تراب علی سے دو فرزند ہوئے۔ مرزا آغا شاغل اور مرزا آغا شائق۔

وزیر بیگم تیس بتیس برس کی تھیں کہ مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو ان پر فریفتہ ہو گئے۔ اس وقت تک مرزا فخرو بہادر شاہ کے ولی عہد نامزد نہیں ہوئے تھے۔ عمر تقریباً پچیس برس کی تھی، ان کی دو بیویاں پہلے سے موجود تھیں، مرزا فخرو نے وزیر بیگم سے باضابطہ شادی کی اور وہ شوکت محل سے موسوم ہوکر لال قلعے میں آگئیں۔ داغ بھی ماں کے ساتھ قلعۂ معلیٰ میں آگئے، یہ واقعہ 1844 کا ہے۔ داغ کی عمر اس وقت تقریباً تیرہ برس کی تھی۔ مرزا فخرو سے وزیر بیگم کو ایک فرزند ہوا، جس کا نام شہزادہ خورشید احمد رکھا گیا۔

10 جولائی 1856 کو مرزا فخرو اچانک ہیضے کے مرض میں انتقال کر گئے۔ وزیر بیگم کو بچوں کے ساتھ لال قلعے سے رخصت ہونا پڑا، کچھ دنوں کے بعد وزیر بیگم ایک انگریز مارٹن بلیک کے ساتھ رہنے لگیں، جس سے ایک بیٹی بادشاہ بیگم خفی کی پیدائش ہوئی۔ بعض روایتوں کے مطابق وزیر بیگم کسی دکنی رئیس کے ساتھ بھی رہی تھیں۔ 1879 میں رامپور میں وزیر بیگم کا انتقال ہو گیا۔

داغ بلند و بالا قد و قامت رکھتے تھے، رنگ قدرے سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے ہلکے داغ تھے۔ پیشانی بلند، ناک اونچی، آنکھیں بڑی بڑی اور انگلیاں موٹی تھیں۔ جثہ قد کے لحاظ سے متناسب تھا، داڑھی اوسط تھی، مجموعی طور پر قبول صورت تھے۔

پندرہ برس کی عمر میں داغ کی شادی عمدہ بیگم کی صاحبزادی فاطمہ سے ہوئی، اس وقت داغ لال قلعے میں تھے۔

انقلاب 1857 کے دوران داغ اپنی اہلیہ، والدہ اور خالہ کے ساتھ رامپور چلے گئے، جہاں نواب یوسف علی خاں نے داغ کی خاطر خواہ دلداری کی اور اپنے بیٹے نواب کلب علی خاں کا مصاحب بنا دیا۔

21 اپریل 1865 کو نواب یوسف علی خاں نے رحلت کی، نواب کلب علی خاں مسند نشیں ہوئے۔
14 اپریل 1866 کو نواب کلب علی خاں نے داغ کو اپنا معتمد خاص مقرر کیا اور انتظام کارخانہ جات، اصطبل، گاڑی خانہ، فراش خانہ، کنول خانہ اور شتر خانہ سپرد کیا۔

رامپور میں داغ اور منی بائی حجاب کی آشنائی کا آغاز ہوا۔ داغ نواب کلب علی خاں کے ساتھ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ داغ علی الصبح بیدار ہو جاتے تھے، ان کی صبح کی نماز قضا نہ ہوتی تھی۔

23 مارچ 1887 کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ بعض روایتوں کے مطابق ان کو زہر دیا گیا۔ نواب مشتاق علی نے گدی سنبھالی۔ اعظم الدین خاں ان کے مدار المہام تھے، ان دونوں کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شعرا کی طرف ان کا رویہ منفی اور بے نیازانہ تھا۔ داغ نے گیارہ سالہ ملازمت سے سبک دوشی حاصل کی۔ مستعفی ہو کر دہلی آ گئے۔ امرتسر، کشن کوٹ، اجمیر شریف، آگرہ، لاہور، بنگلور، علی گڑھ، متھرا، جے پور اور ریاست منگرول کی سیاحت اور اپنے شاگردوں اور مداحوں سے ملاقاتیں کیں۔

رام پور سے مستعفی ہو کر داغ بے روزگار ہو گئے تھے۔ ان دنوں حیدر آباد میں غالب کے شاگرد مولوی سیف الحق ادیب قیام پذیر تھے، انھوں نے بعض ارباب اقتدار سے مشورے کیے اور داغ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ داغ 7 اپریل 1888 کو حیدر آباد پہنچے، داغ نظام دکن کی سرکار میں ملازمت کے خواہاں تھے۔ مختلف ذرائع سے سلسلہ جنبانی ہوئی۔ دربار میں قصیدہ بھی پیش کیا، مگر حیدر آباد میں سوا سال کی مدتِ قیام کا نتیجہ صفر ہی رہا۔

12 جولائی 1889 کو داغ حیدر آباد سے براہ بنگلور اور بمبئی دہلی واپس آ گئے۔ نظام کو داغ کی واپسی کی خبر ملی تو انھوں نے وقار الامرا سے خط لکھوا کر داغ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی۔ داغ دوسری بار تیسری یا چوتھی اپریل 1890 کو حیدر آباد پہنچے۔ ایک سال کے انتظار کے بعد 6 فروری 1891 کو نظام دکن میر محبوب علی خاں نے داغ کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جو ابتدائے ورود حیدر آباد سے جاری کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وظیفے کی رقم ایک ہزار روپیہ ماہانہ کر دی گئی

اور وہ بھی ابتدائے ورود حیدرآباد سے جاری ہوا۔ ایک گاؤں جاگیر میں اور ایک باغ بھی عطا ہوا۔ مختلف اوقات میں نوازش خسروانہ سے بھی فیض یاب ہوتے رہے۔ نظام دکن نے انھیں بلبل ہندوستاں، جہاں استاد، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک بہادر کے خطابات سے نوازا۔

داغ اب گردش روزگار کی آفتوں سے محفوظ و مامون رئیسانہ شان وشوکت سے بسر کرنے لگے۔ نومبر یا دسمبر 1891 میں داغ نے اپنی اہلیہ فاطمہ بیگم کو بھی حیدرآباد بلوالیا۔ وہ تقریباً سات سال داغ کے ساتھ حیدرآباد میں رہیں۔ 1898 میں ان کی رحلت ہوگئی جس کا گہرا اثر داغ کے دل ودماغ پر پڑا۔ درگاہ یوسفین میں ان کی تدفین ہوئی۔

مذکور ہے کہ رامپور میں داغ کے یہاں ایک لڑکا بھی تولد ہوا تھا جس کا نام احمد مرزا رکھا گیا تھا۔ لیکن بچپن ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ویسے تمکین کاظمی کا خیال ہے کہ احمد مرزا داغ کے رشتے کے ایک بھائی کا لڑکا تھا۔

آخری عمر میں داغ نے اپنی سالی کی بیٹی یعنی اپنی خالہ عمدہ بیگم کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا، جس کی شادی سائل دہلوی کے چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خاں سے ہوئی تھی، ممتاز الدین احمد خاں کے انتقال کے بعد سائل دہلوی نے لاڈلی بیگم کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ داغ کے واسطے سے لاڈلی بیگم کو بھی سرکار دکن سے تین سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ داغ نے سائل دہلوی کے لیے بھی دوسو روپے ماہانہ وظیفے کا بندوبست کرادیا۔

حیدرآباد میں داغ نے رئیسانہ زندگی گزاری، میر محبوب علی خاں نے داغ کی جتنی قدر روانی اور عزت افزائی کی، سرکار دکن سے کسی دوسرے ادیب وشاعر کو وہ رتبہ نہیں ملا۔ داغ موسیقی کے دلدادہ تھے۔ خود بھی ستار بہت اچھا بجاتے تھے، اچھی شکل وصورت بھی ان کی کمزوری تھی۔ کہتے ہیں۔

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ
اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

حیدرآباد میں انھوں نے دوتین گانے والیوں کو بھی مختلف اوقات میں ملازم رکھ لیا تھا، جن میں صاحب جان، عمدہ جان اور اختر بائی کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے۔

داغ نے 14 فروری 1905 کو حیدرآباد میں بعارضۂ فالج رحلت کی، نظام دکن نے تین ہزار روپے تجہیز و تکفین کے لیے بھجوائے۔ اپنی اہلیہ کے پہلو میں درگاہ سید یوسفین میں آسودۂ خاک ہوئے۔

داغ نے اردو کے تین اہم مراکز میں زندگی گزاری، دہلی، رامپور اور حیدرآباد۔

داغ جس زمانے میں لال قلعے سے وابستہ ہوئے، وہ قلعۂ معلیٰ کے زوال و انحطاط کا آخری دور تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت لال قلعے تک محدود ہو گئی تھی۔ بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار تھا اور وقتِ ضرورت کٹرہ نیل کے مہاجنوں سے قرض لینے پر بھی مجبور تھا۔

قلعۂ معلیٰ میں اصحابِ سیاست و فراست کی جگہ اربابِ حسن و جمال کی عشوہ طرازیوں نے لے لی تھی۔ ایک خود فراموشی و خود رفتگی کا ماحول تھا۔ بادشاہ، شاہزادے اور امرا و عمائدین سب کے سب عیش و عشرت کی مصنوعی فضا میں غرق، حقیقت و واقعیت سے آنکھیں چرانے اور زندگی کی تلخ کامیوں کو نظر انداز کرنے میں ہمہ تن مصروف و مشغول تھے۔ آنے والی جس قیامت کی دھمک ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، نغمہ و نشاط کی تیز جھنکاروں میں اس کو ان سنی کرنے کا خود فراموشانہ عمل جاری تھا۔

داغ نے شعر گوئی شروع کی تو ابتدا میں مرزا فخرو نے ان کے کلام پر کچھ دنوں تک اصلاح دی۔ پھر انھوں نے داغ کو ذوق کے حلقۂ تلامذہ میں داخل کرا دیا۔ داغ خود رقم طراز ہیں:

"میں ذوق کا شاگرد خواجہ بختیار الدین کاکیؒ کی درگاہ میں ہوا تھا، جہاں شاہ ظفر اور ولی عہد بہادر بھی تشریف فرما تھے، نواب فتح الملک بہادر مرزا فخرو نے میری طرف سے حضرت ذوق کی حدمت میں ایک دوشالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اس روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت استاد کے در دولت پر حاضر ہوتا، مغرب کے وقت وہاں سے واپسی ہوتی...... میں نے خاقانی ہند جناب ذوق سے کامل 14 برس اصلاح لی تھی۔"

داغ کو قلعۂ معلیٰ کی زندگی میں عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کا بھرپور تجربہ ہوا۔ آغاز جوانی ہی میں داغ کو سیر و تفریح اور نشاط و انبساط کے مواقع میسر آ گئے۔ داغ کی سیرت و شخصیت اس نہج پر ڈھلی کہ زندگی کو ہنستے بولتے گزار دینا ہی مطمح نظر ٹھہرا۔ کہتے ہیں ۔

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

کون تسنیم کے چھینٹوں پہ عبث شاد رہے
کچھ کمی یاں بھی نہیں، میکدہ آباد رہے

اور کیا داغ کے اشعار اثر کرتے ہیں
گدگدی دل میں حسینوں کے مگر کرتے ہیں

اے فلک چاہیے جی بھر کے نظارہ ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارہ ہم کو

ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی
روز معشوق نیا، روز ملاقات نئی

قلعۂ معلی کے دوران قیام میں ذوق کے علاوہ دوسرے نابغہ ہائے روزگار سے بھی داغ نے استفادے کیے۔ غالب کے ساتھ شطرنج کی بازیوں کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے۔ غالب کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ احسن مارہروی کے مطابق غالب نے داغ کے مندرجۂ ذیل اشعار کی بے حد تحسین و توصیف کی تھی ۔

دلبروں پر طبیعت آتی ہے
اس طرح اس قدر نہیں آتی

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور
یہ تجھے مفت بر نہیں آتی

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی
اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے۔

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والوں کو دیکھا چاہیے
گو تری نظروں سے گِر ہی پڑیں
آج تو کوئی ٹھکانا چاہیے۔

خود داغ کو اپنی اور اہلِ دہلی کی زبان پر ناز تھا۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نہیں داغ آسان یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

داغ نے قلعۂ معلی کی ٹکسالی زبان کو دلّی والوں کی عام بول چال اور روزمرّہ سے ہم آہنگ و یک رنگ کر کے اپنے اسلوب سخن میں لفظیات کی دلکش طلسم کاری تھی۔ درج ذیل اشعار داغ کی تخلیقی انفرادیت کو روشن کرتے ہیں۔

بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمھیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ سے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

کیا کہا، پھر تو کہو، ہم نہیں سنتے تیری
نہیں سنتے تو ہم ایسوں کو سناتے بھی نہیں

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں، اور سہی

کب تک کھنچے رہوگے، کب تک ٹھنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے، کس کی بنی رہے گی

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھ کو

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں، یا اِدھر پروانہ آتا ہے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمھارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

یہ بات کیا دم رفتار ہوتی جاتی ہے
کہ اپنے سائے سے تکرار ہو جاتی ہے

داغ نے جس اردو زبان کو فروغ دیا تھا وہ سلاست وروانی، رنگینی وشوخی، بے تکلفی و برجستگی، شیرینی ودلکشی، روزمرّہ، محاورہ، ضرب الامثال، بذلہ سنجی وظریفانہ طرّاری، ذہانت وطباعی اور سہل ممتنع کا مجموعہ تھی۔

شعر کے حسن ومعیار پر ان کا نقطۂ نظر ملاحظہ فرمایئے۔

اصطلاح اچھی، مثل اچھی ہو، بندش اچھی
روز مرّہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا

ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو
ایک مصرعے میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا

داغ نے اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے ایک منظوم ہدایت نامہ قلم بند کیا تھا، مندرجۂ بالا اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔

داغ نے پرانی زبان کے بہت سارے الفاظ متروک قرار دے دیے، حالانکہ بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، ذوق وغیرہ کے یہاں ان الفاظ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ داغ نے عربی، فارسی، ترکی اور دوسری زبانوں کے نامانوس، بوجھل، ادق اور غریب الفاظ سے بھی زبان کو پاک صاف کیا، جس نے اردو کو ٹھیٹھ زبان کا درجہ دیا۔

داغ سے پہلے سبک ہندی کے شعرا کے زیر اثر اردو شاعری بھی خیال آفرینی اور مضمون آرائی کی طرف زیادہ مائل ہو گئی تھی۔ غالب نے تو علی الاعلان کہا۔

سخنِ سادہ، دلم را نہ فریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانے بمن آر

ذوق نے یقیناً کلاسیکی اسالیب کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالی تھی، لیکن مجموعی طور پر اردو کا دامن اردو پن سے خالی ہو گیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں جب غیر ملکی سامراج نے لسانی تعصب و تنگ نظری کے بیج بھی بو دیے تھے، ضرورت تھی ایک ایسے لسانی انقلاب کی جو پورے ملک میں لسانی اتحاد کی فضا کو خوش گوار اور ہموار بناتا۔ قدرت نے یہ کام داغ سے لیا۔

داغ نے فارسیت کی گرانباری اور نامانوسیت سے اردو غزل کو نجات دلائی۔ مومن و غالب کے یہاں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جو معمولی تبدیلی سے فارسی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل، آئینہ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(غالب)

دونوں اشعار مشہور و معروف بھی ہیں مگر ان میں تغزل کی بو باس کس حد تک موجود ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے سینکڑوں اشعار اردو شعرا کے دواوین میں موجود ہیں، جو تغزل کی خصوصیات سے عاری ہیں۔ ان کو غزل کے دائرے میں شمار کرنا زیادتی ہے۔

داغ نے ان بدعتوں کے خلاف تنہا جہاد کیا۔ انھوں نے بے محل اور غیر ضروری الفاظ، خواہ مخواہ لفظ سازی، حرف عطف کا حذف، حرف ندا کا حذف، ترکیب فارسی میں 'ن' کا اعلان یا اس کے برعکس، ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافتیں، حرف اضافت کا حذف، کلمۂ ایجاب کا حذف وغیرہ کے اصول وضوابط مقرر کیے اور اردو دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کی منا قشت از خود تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی۔

محاوروں کی صحت کا داغ کو کتنا پاس و لحاظ تھا، اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد سید ابوالحسن ناطق گلاوٹھی کو لکھا تھا:

''یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ، مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آئے۔ محاورے سے شعر میں سقم نہ آنے پائے، اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجیے ورنہ نہیں۔''

زبان و بیان کے معروضی شعور اور دہلی کی معیاری ٹکسالی زبان کے ساتھ داغ قلعۂ معلیٰ سے نکل کر رامپور پہنچے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، رامپور سے داغ کا دیرینہ تعلق تھا۔ قلعۂ معلیٰ سے بے دخل ہونے کے بعد 1857 کے خوں چکاں دور میں داغ نے اپنے اہل خاندان کے ساتھ پھر رامپور میں پناہ لی۔ اس زمانے میں رامپور اساتذۂ دہلی اور لکھنؤ کا مرکز بن گیا تھا۔ عبدالسلام ندوی کے لفظوں میں ـــــ

''غدر کے بعد جب نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کی قدر دانیوں نے رام پور کو اساتذۂ لکھنؤ اور اساتذۂ دلی دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا تھا، ان کی فیاضانہ کشش نے داغ، اسیر، امیر، منیر، بحر، قلق، تسلیم، حیا اور جلال وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا تو دلی اور لکھنؤ کے یہ دونوں اسکول

ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے اور ایک کا دوسرے پر اثر پڑنے لگا۔ اگرچہ یہ اثر ابتدا میں بہت زیادہ نمایاں نہیں ہونے پایا اور امیر، منیر اور قلق وغیرہ کا کلام اپنی قدیم حالت پر قائم رہا تاہم جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا، داغ کی روش اس قدر مقبول ہوتی جاتی تھی کہ خود اساتذہ لکھنؤ کو ان کے مقابلے میں اپنا کلام پھیکا نظر آتا تھا۔ اس بنا پر منشی امیر احمد صاحب مرحوم نے اپنی قدیم روش چھوڑ کر علانیہ داغ کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔''

رامپور میں داغ کے زیر اثر لکھنؤ اور دہلی کے لسانی اختلافات ختم ہوئے اور ایک نئی لسانی وحدت سامنے آئی جس نے داغ اور ان کے ہزاروں شاگردوں کے توسط سے ہندوستان گیر سطح پر اردو کو عوامی رابطے اور جمالیاتی تجربے کی زبان کے طور پر مقبول ومحبوب بنادیا۔

رامپور ہی میں داغ اور منی بائی حجاب کی داستان عشق ومحبت کا غلغلہ بلند ہوا۔ نواب کلب علی خاں کے دادا نواب احمد علی خاں نے رامپور شہر سے تین میل مشرق میں 1817 کے آس پاس بے نظیر باغ اور کوٹھی کی تعمیر کرائی تھی، اسی باغ میں نواب کلب علی خاں نے ایک میلے کی بنیاد رکھی جو مارچ کے آخری ہفتے سے شروع ہو کر اپریل کے پہلے ہفتے تک تقریباً دس دن تک جاری رہتا تھا، رفتہ رفتہ سارے ملک میں اس کی شہرت پھیل گئی۔ ملک کے گوشے گوشے سے مختلف فنون کے ماہرین اس میں شرکت کرنے لگے۔ نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں—

''مارچ 1881 کے اس بے نظیر میلے میں کلکتہ کی ایک ڈیرہ دار طوائف ماہ منیر بیگم عرف منی بائی بھی حاضر ہوئیں، یہ بڑی شوخ، طرار، حاضر جواب اور عشوہ فروش غارت گر ہوش مغنیہ تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک محفل میں داغ کی غزل گائی:

تیرے وعدے کو بت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے، کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے، کبھی شام ہے

اور جب مقطعے پر پہنچی تو بار بار داغ کی طرف ہاتھ بڑھا کر پڑھتی تھی:

جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی روسیاہ کا نام ہے

اس شوخی پر ساری محفل لوٹن کبوتر بن گئی اور خود داغ بھی ان اداؤں پر دل نچھاور کر بیٹھے۔''

منی بائی شاعرہ بھی تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی۔ داغ اور منی بائی حجاب کا عشق تو رامپور ہی میں پروان چڑھا، لیکن منی بائی کی کلکتہ واپسی کے بعد بھی دونوں طرف آگ برابر لگی رہی۔ اگلے برس منی بائی حجاب پھر رامپور آئی۔ واپسی پر منی بائی حجاب داغ سے کلکتہ آنے کا وعدہ لے کر گئی۔

اس واقعے سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں طوائفوں سے علانیہ ربط و تعلق معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ منی بائی حجاب نے داغ کو کلکتہ آنے کی دعوت دی اور اپنے وعدے کی تکمیل پر اصرار کیا۔ اور اپنے منظوم خط میں لکھا۔

زندگی بخشِ نامِ ذوق و نظیر
رشک سودا و درد و مومن و میر
رسمِ الفت نباہنے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ
کوئی روکے مگر چلے آؤ
ریل میں اتنی دور آنا کیا
کارِ سرکار کا بہانا کیا

منی بائی حجاب کے عشق میں حسد و رقابت کی نوبتیں بھی آئیں۔ رامپور میں ضلع بدایوں کے جاگیردار نواب حیدر علی خاں بھی حجاب پر فریفتہ تھے۔ داغ نواب حیدر علی خاں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اولاً تو یہ کہ وہ نواب رامپور کے قرابت داروں میں تھے، دوسرے جاگیردار تھے اور دولت کی فراوانی تھی۔ داغ ستر روپے ماہانہ کے ملازم تھے۔ چنانچہ حسد، رشک اور رقابت کے ان گنت تجربوں سے داغ گذرے، جس نے ان کے کلام میں طنز و تعریض اور رقیبانہ جذبات کی شگفتگی پیدا کی۔

داغ بنیادی طور پر حسن پرست تھے۔ اچھی صورت اور آواز کے رسیا۔ لیکن ان کے یہاں سطحیت اور ابتذال نہیں تھا جس کے لیے چکبست نے ان کو اور ان کی شاعری کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ سلیم احمد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ داغ نے اردو غزل کو کوٹھے پر بٹھا دیا۔ لیکن سلیم احمد اس حقیقت کو نظر انداز کر

گئے کہ انیسویں صدی کے پُر آشوب دور میں اردو زبان کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ یہ تو داغ کی شاعری تھی جس نے پورے ہندوستان کو ایک لسانی وحدت میں باندھ رکھا تھا، ورنہ انگریزی سامراج نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی اور سماجی خلیج حائل کرنے کے لیے زبان کو بھی ایک اہم آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کے یہ احساسات ملاحظہ فرمایئے—

''1825 سے 1905 تک بالخصوص افراط وتفریط، بحران، دم توڑتی مغل حکومت اور قدیم امرا کی ڈوبتی جاگیرداریوں کا زمانہ تھا— فورٹ ولیم کالج طے شدہ دوررس سیاسی نقطۂ نظر سے دور سم الخطوں میں ہندی، ہندوی، ہندوستانی کو نئے طرز کی اردو ہندی بنانے میں مصروف تھا۔ مسلمان رؤسا اور وابستگان قلعۂ معلیٰ کو رسوا کیا جا رہا تھا اور انگریز پرست غیر مسلمین کو ابھارا جا رہا تھا۔ عوام تو عوام خواص کا ایک گروہ جس میں دانشور، ادیب اور شاعر بھی شامل تھے، یا تصوف اور خانقاہوں کی طرف رجوع ہو رہا تھا یا رقص وسرود کے بام ودر کی طرف مائل ہو رہا تھا۔''

اس پس منظر میں اردو زبان اور ادب اگر انحطاط وزوال سے سرعت کے ساتھ ہم آغوش ہو رہا تھا تو حیرت کا مقام نہ تھا۔ میر و درد، غالب و مومن اور ذوق و آزردہ کی روایت شاعرانہ بھی دھیرے دھیرے دم توڑ رہی تھی۔ اردو زبان کا وجود عدم کے تھپیڑوں سے دوچار تھا۔ ان حالات میں بقول گلزار زتشی—

''اگر اردو صرف ڈپٹی نذیر احمد کی زبان ہی بن کر رہ جاتی تو بھی اس کی بقا کو خطرہ تھا اگر ذوق کے قصائد اور غالب کی ابتدائی چالیس پینتالیس برس کی شاعری ہی ہو کر رہ جاتی تب بھی اس کی موجودہ حیات وحرکت شاید نظر نہ آتی اور وہ ایک جامد وساکت زبان ہو کر انقلاب زمانہ کے ہاتھوں شہید ہو جاتی— یہ داغ اور صرف داغ ہی ہیں جن کی زبان عالموں کے ترجمے، لغات کے حوالوں اور ایذا طلبی ومشکل پسندی سے آزاد ہو کر کوچہ وبازار میں پہنچی اور خواص کے ساتھ عوام کی بھی زبان بن گئی اور بے تکلف بول چال اور اظہار خیال کا عام فہم ذریعہ بن سکی۔ جس نے 1947 کا جھٹکا بھی جھیلا اور اس کے بعد تقریباً 30-25 برس کا استحصال بھی بھگتا، اور نہ صرف یہ کہ پھر بھی زندہ رہ سکی بلکہ پھلی پھولی،

پچھلی اور آج کی رونق دیکھ سکی۔"

وہ طبقہ جو داغ کو سنجیدگی سے نہیں لیتا اور جو ان کی شاعری اور اسلوب بیان کی اہمیت سے باخبر نہیں ہے، اس کی آنکھیں کھولنے کے لیے درج بالا حقایق یقیناً کافی ہیں۔

بہر کیف! منی بائی حجاب اور دوسری طوائفوں سے ربط و تعلق نے داغ کی شاعری میں وقوعہ گوئی کی خوبی پیدا کی۔ خیالی معاملہ بندی کے بجائے اصلیت پر مبنی وقوعہ گوئی داغ کی ایک اہم دین ہے جس نے آنے والے دنوں میں اردو غزل کے امکانات میں وسعت اور نیرنگی پیدا کی۔

طوائفوں کے ساتھ رشتوں نے داغ کے تغزل میں جو تنوع اور نیرنگیاں پیدا کیں ان کے ثبوت میں مندرجۂ ذیل اشعار دیکھیے:

تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا
دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

لے چلا جان مری، روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر
آنکھ جس جانب تمھاری اٹھ گئی

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا
دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا
قیامت ہیں بانکی ادائیں تمھاری
ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمھاری
مرتا مگر اس حال سے فرقت میں نہ مرتا
آتی مگر اس طرح تری یاد نہ آتی

داغ حجاب کی بات رد نہ کرسکے اور کلکتہ جا پہنچے، کلکتے میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور وہاں انھوں نے خوب دادِ عیش دی، پھر رامپور سے طلبی کا پروانہ آیا، 3 جولائی 1882 کو حجاب سے رخصت ہوکر وہ رامپور واپس آگئے۔

بعض روایتوں کے مطابق حجاب رامپور آتی رہیں اور داغ سے ان کے عشق اور داغ کی اوروں سے رقابت کا سلسلہ چلتا رہا لیکن بعض روایتوں کے مطابق کلکتہ کی اس ملاقات کے کوئی ساڑھے انیس سال بعد حجاب ان کے بلانے پر حیدرآباد پہنچیں۔

رامپور میں داغ کی شاعری منتہائے کمال کو پہنچی۔ ان کا اسلوب سخن سارے ملک پر چھا گیا۔ رامپور کا قیام داغ کی شاعری کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوا۔ رامپور ہی میں انھوں نے دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج و ہم آہنگی سے اس دبستان کو ممتاز و منفرد قدروں کا حامل بنا دیا جو دبستان داغ سے موسوم ہے۔

رامپور سے مستعفی ہوکر جب داغ حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے اور نظام سادس میر محبوب علی نے ان کی شاگردی اختیار کی تو اس کے بھی دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ سربراہ مملکت کی پیروی نفسیاتی حقیقت ہے۔ حیدرآبادی شعرا ہی نہیں، دوسرے علاقوں میں بھی داغ کی مقبولیت و شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ رامپور کے دوران قیام میں ان کا دیوان 'گلزارِ داغ' اشاعت پذیر ہوکر قبولیت عام حاصل کر چکا تھا۔ منی بائی حجاب سے اپنے ربط و تعلق کی داستان انھوں نے 838 اشعار پر مشتمل مثنوی ''فریادِ داغ'' کی صورت میں قلم بند کی تھی جس کی اشاعت 1883 میں ہوئی تھی۔ یہ مثنوی بھی بہت مقبول ہوئی تھی اور بعض روایتوں کے مطابق اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ 6 ماہ کے اندر

فروخت ہو گیا تھا۔

حیدر آباد میں داغ نے نہ صرف یہ کہ دہلی کی ٹھیٹھ ٹکسالی اردو کی مرکزیت قائم کردی بلکہ دلی دکنی کے تقریباً دو سو سالہ ادبی قرض کو بھی بیباق کر دیا۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے ایک اہم نکتہ پیش کیا ہے:

"ہم روایت کے طور پر کہتے رہے ہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں جسے دہلی کا دبستان شاعری کہا جاتا ہے، اس کا آغاز ولی سے ہوتا ہے اور اختتام داغ کی شاعری پر ہوتا ہے۔"

شمالی ہند میں مغلوں کی حکومت تھی۔ فارسی سرکاری زبان تھی۔ اس کے برعکس دکن میں گولکنڈہ اور بیجاپور آزاد ریاستیں تھیں۔ وہاں کی سرکاری زبان اردو تھی۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے جس کے دیوان میں تقریباً ایک لاکھ اشعار ہیں۔ اس کے دربار سے بے حد اہم شعرا اور نثر نگار وابستہ تھے۔ ابن نشاطی، ملا وجہی اور غواصی وغیرہ اسی دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے درج ذیل اشعار بہت مشہور ہیں اور ایک خاص مزاج اور تہذیبی پس منظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں
کہا جائے اما کیا جائے نا

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت 1580 سے 1611 پر محیط ہے۔ قلی قطب شاہ کے اشعار اس لسانی تغیر اور امتزاج کی نشاندہی کرتے ہیں جس کا باضابطہ آغاز امیر خسرو نے کیا تھا۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

امیر خسرو نے ایرانی غزل اور موسیقی اور ہندوستانی گیت اور موسیقی کے امتزاج کا جو سنگ بنیاد رکھا تھا وہ قلی قطب شاہ تک آتے آتے زیادہ مضبوط و مستحکم ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ولی دکنی تک اس نے جمالیاتی ارتقا کی اہم منزلیں طے کر لی تھیں۔ اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جب شمال اور جنوب

کی سیاسی خلیج کا خاتمہ ہوا تو 1700 میں ولی دکنی اپنے دوست ابوالمعالی کے ہمراہ دلی آئے۔

دہلی کی بزم سخن میں انھوں نے اپنا کلام پیش کیا تو شمال کے شعرا کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت تک شمالی ہند کے شعرا فارسی زبان میں جمالیاتی تجربے کر رہے تھے۔ حکومت وقت کی زبان بھی فارسی تھی۔ اس لیے فارسی میں گفتگو کرنا، خطوط لکھنا، شعر کہنا فخر و امتیاز کی سند تھا۔ مگر ایرانی شعرا ہندوستانی نژاد فارسی شعرا کو قطعی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ جو ایرانی النسل شعرا ایران میں شاعرانہ شہرت و مقبولیت کی سند سے فیض یاب ہو کر ہندوستان آئے اور مغل درباروں سے وابستہ ہو گئے، انھیں بھی ایرانی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے، اور اس طرح کے تبصرے کیے "بہ ہندوستان رفت و زبان خود را خراب کرد۔"

اس پس منظر میں ولی دکنی کی دہلی آمد فال نیک ثابت ہوئی، یہاں کے مقامی شعرا کو احساس ہوا کہ جو زبان وہ گھروں اور بازاروں میں بولتے ہیں، اتنی قوت رکھتی ہے کہ اس میں جمالیاتی تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ولی کے زیر اثر شمالی ہند میں باضابطہ شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ نواب صدر الدین فائز دہلوی نے اپنا اردو کلام یکجا کیا جس میں ان کی 32 غزلیں ولی کی زمینوں میں ہیں۔

دہلی میں ولی سے قبل بعض شعرا اردو میں شعر گوئی سے شغف رکھتے تھے۔ ان میں جعفر زٹلی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ پہلا شہید شاعر ہے۔ جعفر زٹلی کے علاوہ افضل نارنولوی، خواجہ عطا، موسوی خاں فطرت اور قزلباش امید وغیرہ تفنن طبع کے طور پر اردو میں بھی کبھی کبھار کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ ان شعرا میں سے بعض کے کچھ نمونے بہ طور مثال پیش ہیں۔

اورنگ زیب کی فتح دکن پر جعفر زٹلی نے ایک مثنوی کہی تھی، جس کے تین اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

زہے شاہ اورنگ دھانک بلی
کہ در ملکِ دکھن پڑی کھلبلی

دریں پیر سالی و ضعفِ بدن
مچائی دھا چوکڑی در دکن

زہے شاہ شاہاں کہ وقتِ وغا
نہ بلند، نہ طلند، نہ جنبد زجا

اثل نارنولوی

رخسار پُر بہار سجن رونقِ چمن
یا گل گلاب کا کہوں یا لالۂ سمن
بر توسنِ کرشمہ سوار است نازنیں
سید اثل زبادۂ دیدار او مگن

موسوی خاں فطرت

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

خواجہ عطا

بر فلک شب نہ می تپد انجم
دل رستم زبیم می دھڑکد
دست و پا می زند عدو در رن
ہم چو پڑری کہ در قفس پھڑکد

لیکن ولی کی غزلیں جمالیاتی میزان و معیار سے بہت حد تک ہم آغوش ہو چکی تھیں اور امیر خسرو اور قلی قطب شاہ کی جمالیاتی روایت کی صحت مند اور مثبت نمائندہ تھیں۔

ترے بن مجھ کو اے ساجن یو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مج کن تو یو سنسار کیا کرنا
مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
تج گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم

مشتاق درس کا ہے تک درس دکھاتی جا

دل کوں میرے تب تیتی حاصل ہوا ہے پیچ و تاب

جب سوں دیکھا پیچ تیری لٹ پٹی دستار کا

ولی کے یہاں ہندوستانی جمالیات کے زیر اثر عورتوں کی طرف سے بھی اظہار عشق ہوا ہے۔ گیت اور غزل کے ترنم میں امتزاجی کیفیت سے ولی اور ان کے ہم عصروں کی شاعری ہند ایرانی جمالیاتی ہم آہنگی اور امتزاج کے فطری ارتقا کی بہترین مثال ہے، لیکن سانحہ یہ ہوا کہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو دو مشورے دیے:

1۔ شما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را در زبان اردوے معلیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید تا موجب شہرت و رواج وقبول خاطر طبعان عالی مزاج گردد۔

2۔ ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختۂ خود بکار ببر از تو کے محاسبہ خواہد گرفت۔

ولی نے سعد اللہ گلشن کے مشورے پر عمل کیا۔ دکن میں فارسی روایات و جمالیات سے استفادے کی روایت بہت پہلے سے تھی لیکن یہ فطری تقاضوں کی رہین منت تھی۔ سعد اللہ گلشن نے تو ولی کو فارسی سرمایۂ سخن پر ڈاکا ڈالنے کا ہی مشورہ دے دیا اور ولی دکنی نے اس صوفی صافی کے حکم کی پیروی کو باعث سعادت سمجھا۔ غزل اور گیت کی ہم آہنگی سے جو روایت پروان چڑھ رہی تھی وہ رک گئی۔ یہ ایک تاریخی سانحہ تھا جس کے بعد ولی کے کلام میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہوا۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا

ہے مطالعہ مطلع انوار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں

تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا

مسند گل منزل شبنم ہوئی

دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا

بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

جمیل جالبی کا نقطۂ نظر حقیقت پر مبنی ہے کہ ولی نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے کام لے کر اردو شاعری کے ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کی جو آئندہ دو سو برس تک شعرا کے لیے مشعل راہ بنا رہا۔ عہد داغ تک شمال و جنوب کے شعرا نے جس اسلوب سخن سے فیض یاب ہو کر اپنے اپنے لب و لہجے کی تشکیل کی، وہ ولی دکنی ہی کا چشمۂ فیض ہے۔

ولی نے شمالی ہند میں جس شاعری کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور جس کی بنا پر اس کو دبستان دتی کا بابا آدم قرار دیا جاتا ہے، اس دبستان سخن کو دتی کی ٹھیٹھ ٹکسالی زبان کے معیار و میزان اور عظمت و رفعت سے ہم کنار کر کے داغ نے حیدر آباد میں اردو کی مرکزیت قائم کی اور اس طرح ولی کے قرض سے دبستان دتی سبکدوش ہوا۔

داغ جس زمانے میں اردو زبان کو ہمہ گیر ذریعۂ اظہار بنانے کی کوشش و کاوش میں منہمک تھے، اس زمانے میں سرسید کی علی گڑھ تحریک عوامی مقبولیت سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ سرسید اور حالی انقلاب 1857 کے بعد کے ماحول میں ایک اصلاحی تحریک چلا رہے تھے جس کے دائرۂ کار میں شعر و ادب بھی تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ قوم و ملت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور نئے سماجی، سیاسی، علمی اور سائنسی شعور سے واقف کرانے میں شعر و ادب اہم آلۂ کار ثابت ہوں گے۔ چنانچہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے نقیبوں نے سب سے پہلے اردو کی رسمی و روایتی شاعری کو اپنا ہدف بنایا۔ حالی کی مسدس اور مقدمۂ شعر و شاعری نے غزلیہ شاعری کو مردود و مطعون قرار دیا— اس سے پہلے محمد حسین آزاد نئی شاعری کا بگل بجا چکے تھے۔ حالی نے تو یہاں تک اعلان کر دیا تھا۔

یہ شعر اور قصاید کا ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

''محصنات'' میں ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں کی شاعری میں عاشقی اور بے تہذیبی کے سوا کیا ہے۔ شریف خاندانوں کے لڑکے اکثر اسی کتب سے خرابی کے لچھن سیکھتے ہیں اور اسی اکھاڑے میں بُرے کوتکوں کی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ یہ سارے حملے اسی طرز سخن اور روایت تغزل پر تھے جس کی زمام کار داغ کے ہاتھوں میں تھی۔ حالی اور داغ دہلی میں ہم نوا اور ہم نشیں رہ چکے تھے۔ حالی کئی مشاعروں میں داغ کی بے محابا تحسین وتعریف کر چکے تھے۔ لیکن انقلاب وقت نے دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔

اسی عہد میں شاد عظیم آبادی اپنی الگ دنیا تعمیر کر رہے تھے۔ انھوں نے جرأت کی معاملہ بندی اور اسلوب کی رنگینی کو سودا کی بلند آہنگی، درد کی ربودگی ورفتگی، میر کے سوز وگداز اور مومن کی باطنی نغمگی کے ساتھ ہی غالب کی فکری سنجیدگی سے ہم آہنگ کیا اور ایک ممتاز کلاسیکی اسلوب کی تشکیل کی۔

داغ نے ذوق کی روایت تغزل کو اپنے مخصوص عاشقانہ مزاج، نشاطیہ آہنگ، شوخ بیان، قلعۂ معلیٰ کی فصاحت وحلاوت، شیرینی وشگفتگی اور دلی کے گلی کوچوں کی زبان کی کاٹ، تیزی، برجستگی وبے ساختگی اور سلاست وسادگی سے ہم آہنگ کر کے بام کمال پر پہنچا دیا۔ فراق نے صحیح لکھا ہے:

''اگر غالب کی زبان نرم ہو کر حالی کی بن گئی اور مومن کی زبان حسرت موہانی کی تو ذوق کی زبان بھی دوآتشہ ہو کر داغ کی زبان بن گئی ہے۔''

غزل جس پُر آشوب دور سے گزر رہی تھی اس عہد میں داغ واحد شاعر ہیں جنھوں نے تغزل کی میراث کی حفاظت کی۔ اور غزل کو تغزل کی کیفیت وخصوصیت سے محروم ہونے سے بچا لیا۔ یہ ان کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ داغ اردو کی لسانی وحدت کے ارتقائی سلسلے کا وہ آخری نغمہ گر ہے جس نے پورے ہندوستان میں اردو زبان اور تغزل کو مروج ومقبول بنایا، ان کی تخلیقی شخصیت کی بے کرانی، فعالیت، تنوع اور نیرنگیِ اظہار نے اردو زبان کی گویائی کے تمام امکانات کو روشن کر دیا، جس کو ان کے شاگردوں نے مزید مستحکم اور جاندار بنایا۔ داغ کے بعد شعر وسخن کی دنیا میں قدم رکھنے والا کوئی نغمہ سنج

ایسا نہیں جس نے داغ کی زندہ تخلیقی روایت اور معنو لانہ علایم و رموز سے استفادہ نہ کیا ہو۔
ان کی شاعری میں ان گنت ایسے نشتر ہیں جو ان کو میر و درد اور آتش و مومن کی روایات سخن کا امین بناتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

فرشتے بھی دیکھیں تو کھل جائیں آنکھیں
بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

ہم جہاں ہیں، تجھے دیکھیں گے وہیں
ہم سے گھر گھر نہیں دیکھا جاتا

داغ کب تک یہ پریشاں نظری
اپنے اندر نہیں دیکھا جاتا

منزل عشق نہیں ہے یہ سرائے فانی
رات کی رات ٹھہر جائیں، ٹھہرنے والے

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں
تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

وہ کب دیکھ سکتا ہے اس کی تجلی
جس انسان نے اپنا جلوہ نہ دیکھا

ان آنکھوں کے قربان جاؤں جنھوں نے
ہزاروں حجابوں میں پردہ نہ دیکھا

ہے گرچہ سب کی آنکھ ترے حسن کی طرف

جلوہ یہ کہہ رہا ہے کوئی دیکھتا نہیں
ہزار رنگ میں ہے اور پھر نظر میں نہیں

اسی کا پردہ، اسی کا ظہور ہوتا ہے
جہاں تیرے جلوے سے معمور نکلا
پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا

اے بے خودیِ شوق ہماری ہے یہ ہستی
دنیا میں ہیں اس طرح کہ دنیا میں نہیں ہیں

ایسے متعدد اشعار دواوین داغ میں موجود ہیں۔ انتخاب شرط ہے۔ مگر داغ کے خلاف جو ایک منفی رائے قائم ہوگئی اس نے نقادان ادب کو داغ کی عظمت و اہمیت سے بے نیاز و بے خبر کر دیا۔ یہ اشعار مومن و غالب کے اشعار کی طرح محتاج تشریح ہیں اور نہ ان کی شرحوں کی ضرورت ہے۔ یہ بھی داغ کی انفرادیت اور تخصیص ہے ــــ ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ان کی شاعری براہ راست قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کے مندرجۂ ذیل اشعار یا ان کے پہلے یا دوسرے مصرعے تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں:

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تونے پی ہی نہیں

اور ہوں گے تری محفل سے ابھرنے والے
حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

تو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں، اور سہی

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں

آپ سے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو

آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

دی موذن نے شب وصل اذاں پچھلی رات

ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

مدعی دیکھ ہمیں چشم حقارت سے نہ دیکھ

کل ہمارا تھا جو ہے آج زمانہ تیرا

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں

دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

عذر آنے میں بھی ہے، اور بلاتے بھی نہیں

باعثِ ترکِ ملاقات بتاتے بھی نہیں

خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی

اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

دیا دل تو اے داغ اندیشہ کیا

گذرنی جو ہوگی، گزر جائے گی

ضرب المثل ایسا ہی شعر بنتا ہے جو عام فہم سلیس اور رواں ہو۔ بہ الفاظ دیگر ضرب المثل اور سہل ممتنع لازم وملزوم ہیں۔ سہل ممتنع کے اعتبار سے داغ لاثانی ہیں۔ ان کے اکثر اشعار کو نثر کرنے کی کوشش مشکور نہیں ہو سکتی۔ لفظوں کی نشست و برخاست اور ترتیب وتہذیب میں داغ نے اتنی ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ ان کے شعر کو نثر بنانے سے اس کے زور بیان اور اثر وتاثیر میں کمی آجانا لازمی ہے۔
نقادوں نے داغ کی شاعری پر ابتذال وسوقیت کا الزام عائد کیا ہے لیکن سچائی تو یہی ہے کہ داغ

کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی اور ان کے دور کی اجتماعی نفسیات ویسی ہی تھی جیسی ان کے کلام سے مترشح ہے۔ اس لیے مورد الزام اگر کسی کو ٹھہرایا جاسکتا ہے تو اس معاشرتی زوال وانحطاط کو جس کی عکاسی اور آئینہ داری ان کے کلام میں ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری تو اپنے عہد وعصر کی ترجمانی وآئینہ داری میں شفافیت کی بہترین مثال ہے۔

ڈاکٹر صلاح الدین کی درج ذیل رائے علمی معروضیت ومعقولیت کی حامل ہے:

''داغ کے دبستان کے اسلوب کو بہر حال مستقبل کے شاعرانہ اسلوب کے لیے نشان منزل بننا مقدر ہو چکا تھا...... اپنے شاگردوں کی تربیت بھی انھوں نے اس طرح کی تھی کہ ان کے مخفی جوہروں کو مستقبل کے لیے ابھار دیا تھا۔ اس طرح ایک نئی شعری روایت کی بنیاد قائم ہوگئی تھی۔ یہی وہ شعری تربیت تھی جس کا ایک پہلو اپنے پورے بانکپن کے ساتھ سائل، زار، بیخود اور آغا شاعر کے یہاں نموودار ہوا اور دوسرا پہلو جدید شاعری کی قوت بیانیہ کا روپ دھار کر اقبال کے یہاں رونما ہوا، روایت شعری کے تمام علایم ورموز کا استعمال اقبال نے داغ ہی سے حاصل کیا اور یوں عصر حاضر کا سب سے بڑا سخن طراز جس کے کلام میں علایم و رموز کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہے، داغ ہی کا مرہون منت ٹھہرا۔''

جدید شاعری کے مختلف اسالیب اور لب ولہجے کی تشکیل میں دبستان داغ کی جمالیاتی روایت نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر گہرے نقوش واثرات مرتب کیے ہیں۔ مگر ان کی شاعری نقادوں کی کم نگہی اور مختلف عصری اصلاحی اور ادبی تحریکوں کی جولانیوں میں نظر انداز ہوکر رہ گئی۔ ایک المیہ یہ ہے کہ ان کے دور آخر کا کلام جو خاصی تعداد میں ہے، ابھی تک مرتب ومدون ہوکر منظر عام پر نہیں آیا اور نہ وہ اشعار اشاعت پذیر ہوئے جو ایک ہزار کی تعداد میں صرف محاوروں پر مشتمل تھے۔

داغ بہت زود گو شاعر تھے۔ ان کا کلام اس جہت سے کم تعداد میں موجود ہے۔ نوراللہ محمد نوری کے مطابق:

زمانۂ غدر تک کا ایک ساٹھ جز کا دیوان جس میں غزلیں، رباعیاں، ترجیع بند اور قطعات تھے، مکمل ہوگیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہنگامۂ غدر میں ضائع ہوگیا۔ رامپور پہنچنے کے بعد تلف شدہ غزلوں

کے جو اشعار یاد آتے گئے ان کو لکھ لیا گیا اور تازہ افکار سے ان کی تکمیل کی گئی۔ ان کا سب سے پہلا دیوان ''گلزار داغ'' ہے جو رامپور سے 1296 میں شائع ہوا۔ اس دیوان میں رامپور کا بھی کلام ہے اور زمانہ غدر سے پیشتر کا کچھ حصہ بھی۔''

داغ کا دوسرا دیوان'' آفتاب داغ''1302ھ میں شایع ہوا، یہ بہ لحاظ ردیف نامکمل ہے۔ تیسرا دیوان'' مہتاب داغ''1310ھ میں مطبع عزیز دکن حیدر آباد سے شایع ہوا، یہ 355 صفحات پر مشتمل ہے۔

1310ھ سے 1325ھ تک کا کلام دیوان کی صورت میں ترتیب کے مرحلوں سے گذر چکا تھا۔ مولوی ابوالحمید کے مطابق'' مہتاب داغ'' کے مقابلے میں اس کی ضخامت دوگنی تھی۔ ایک دیوان محاورات پر مشتمل تھا جس میں ایک ہزار اشعار تھے۔ داغ کی رحلت کے بعد اس سرمایۂ سخن کے لیے داغ کے اعزہ میں اختلاف رونما ہوا چنانچہ میر محبوب علی خاں نے اسے اپنے پاس منگوالیا۔ اب اگر وہ کلام اشاعت کے مرحلوں سے گزر چکا ہے تو راقم الحروف کی نگاہوں سے نہیں گزرا ہے۔

داغ کی رحلت کے بعد ان کے شاگرد احسن مارہروی نے ان کی غزلیں اور کچھ متفرق کلام 1325ھ میں'' یادگار داغ'' کے نام سے شائع کرایا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لالہ سری لام نے ''ضمیمۂ یادگار داغ'' کے نام سے بقیہ اشعار دہلی سے شائع کرائے تھے لیکن یہ بھی ناپید ہے۔

• • •

C/o H.O.D.
Deptt. of Urdu
Bhagalpur University
Bhagalpur (Bihar)

مغنی تبسم

داغ اپنی غزل کے آئینے میں

داغ اردو کے ان خوش قسمت شاعروں میں تھے جن کی شہرت اور مقبولیت ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ ان کے ہزار ہا شاگرد تھے۔ اقبال کو بھی ان کی شاگردی کا شرف حاصل تھا اور وہ داغ کے بے حد مداح تھے۔ داغ کی وفات پر اقبال نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیاں　　آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　لیلیِ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اے جہاں آباد، اے سرمایۂ بزمِ سخن　　ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہوا　　آہ خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

خود داغ کو اپنی زبان دانی اور فن پر بڑا ناز تھا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغؔ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا　　جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی، بات نئی

اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغؔ　　سست اک شعر نہ دیکھا ترے دیواں میں کبھی

داغ کے کلام میں ایسے سینکڑوں اشعار ہیں جنھیں بول چال اور محاوروں کا طلسم کدہ کہا جا سکتا ہے جیسے:

باتیں اس آئینہ رو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم　　آج تو خوب ہی شیشے میں اتارا ہم کو

جواب اس بات کا اس شوخ کو کیا دے سکے کوئی　　جو دل لے کر کہے کم بخت تو کس دل سے ملتا ہے

آج گھبرا کر وہ بولے جب سنے نالے مرے　　جان کے پیچھے پڑے ہیں چاہنے والے مرے

چڑھاؤ پھول مری قبر پر جو آئے ہو　　کہ اب زمانہ گیا تیوری چڑھانے کا

بوالہوس غیر ہیں یا ہم ہیں تمھیں منصف ہو — کچھ لگی لپٹی نہ ان کی نہ ہماری رکھنا

مٹھی میں دل نہ تھا جو اٹھے ہاتھ جھاڑ کے — الجھا ہوا ہے زلفِ شکن در شکن میں کیا

مری التجا پہ بگڑ کر وہ کہنا — نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جایئے — اللہ تیری شان کے قربان جایئے

اکثر اشعار میں محاوروں کے علاوہ بول چال کی زبان کا بے ساختہ استعمال ہوا۔ اس خصوصیت کی وجہ سے داغ کے بہت سے شعر اور مصرعے زباں زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں جیسے:

غرض جہان سے کیا اے فلک مرے ہوتے — غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے — مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد — ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

نہ جاتا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی — بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

داغ کی زبان کی دلکشی اور لطافت صنائع بدائع کے استعمال میں جھلکتی ہے۔ صنائع کا استعمال مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ وہ بے ساختگی کے ساتھ شعر میں بندھ جاتے ہیں۔ اور شعر کی معنویت کو دوبالا کرتے ہیں۔ ذیل میں چند نمونے پیش ہیں:

زاہد کا عمامہ ہو کہ ہو شیخ کی دستار — ان دونوں پہ طرّہ ہے مرا دامنِ تر آج (ایہام)

مرے اشکوں میں ہے یا تیرے دندانِ مصفا میں — گہر کی آب، ہیرے کی تجلی، نور تارے کا (صنعتِ جمع)

کس کی زلفیں مجھے یاد آئیں شبِ ہجراں میں — کہ بلائیں مری لینے کو بلائیں آئیں (تجنیسِ تام)

ارمغاں دیتے ہیں ہم پیرِ مغاں کو جا کر — کوئی اچھا جو ہمیں ظرفِ وضو ملتا ہے (تجنیسِ مذیل)

صورتِ وصل نہ تھی کوئی بجز رنجشِ غیر — وہ جو بگڑے ہوئے آئے ہیں تو بن آئی ہے (تضاد)

دلِ شکستہ کا مضموں لکھا نہیں جاتا — کہ ایک نکتے پہ ٹوٹا کیے قلم سو سو (مشاکلہ، تکریر)

سر میں ہو، گردن میں ہو، پہلو میں ہو، سینے میں ہو   تیغ ہو، خنجر ہو، پیکاں ہو، سناں ہو کوئی ہو (الف۔نشر مرتب)

داغ نے غزلیہ شاعری کی روایت سے انحراف نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں وہی استعارے اور علائم و رموز ہیں جن سے قدما نے اپنی شعری کائنات سجائی ہے۔ ہجر و وصال کے مضامین بھی وہی ہیں لیکن ان میں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ ان کے ہاں نہ میر کا سوز و گداز ہے نہ غالب کی سی پرواز تخیل اور معنی آفرینی، ذوق کی اخلاقیات سے بھی انھیں واسطہ نہیں ہے۔ ان کے خیالات کا محور عشق مجاز ہے لیکن ان کی شاعری میں عشق کے نازک احساسات، کیفیات اور جذبات کا گزر نہیں۔ معاملہ بندی ان کا خاص میدان ہے۔ بعض دہلوی اور بیش تر قدیم شعرائے لکھنو کی طرح ان کی محبوبہ ایک بازاری طوائف ہے۔ شوخ، چنچل اور شریر اور اسی کے ساتھ وہ ستم گر بھی ہے:

دلبر ہیں ادائیں بھی، دلکش ہیں جفائیں بھی   اک آن ستم گر میں ہر آن نکلتی ہے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی   اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا   اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے

حیا اس کی آنکھوں میں کیوں کر ہو یارب   کہ شوخی سے بھی ہے شرارت زیادہ

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف   ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا

داغ کی یہ محبوبہ جو ایک بازاری طوائف ہے بہ قول داغ ہر وقت رقیبوں سے گھری رہتی ہے:

آپ ہیں اور مجمع اغیار روز دربار عام ہوتا ہے

داغ کو وہ خاطر میں نہیں لاتی۔ نہایت حقارت کا برتاؤ کرتی ہے:

پوچھتے ہیں وہ مری بات تو یوں پوچھتے ہیں   کہتے ہیں کون ہے تو کیا ہے حقیقت تیری

کچھ داغ کا مذکور جو آیا تو وہ بولے   آئے تھے برا حال بنائے مرے آگے

ہم نشینوں سے مرے کہتے ہیں وہ   چھوڑ دیں غیروں کو کیا اِن کے لیے

لیکن عاشق کو یقین ہے کہ محبوبہ کے دل میں اس کے لیے جگہ ضرور ہے:

انھیں کو رنجش بے جا ہے لیکن ہے تو ہم سے ہے محبت گر نہ ہو باہم شکایت درمیاں کیوں ہو

محبوبہ جانتی ہے کہ یہ سچا عاشق ہے اسی لیے وہ اس کے جور و ستم سہتا ہے:

ہارے اتنا تو مرا دھیان انھیں رہتا ہے سب سے کہتے ہیں مرے جور کے قابل ہے وہی

عاشق خود بھی ایذا طلب ہے۔ محبوبہ اس پر ستم نہ ڈھائے، جور و جفا نہ کرے اور برا بھلا نہ کہے تو اسے چین نہیں آتا:

داغ کو چین ہی نہیں آتا اس سے جب تک، برا بھلا نہ سنے

محبوبہ ملاقات اور وصل کے وعدے تو کرتی ہے لیکن انھیں وفا کرنے کی نوبت کم ہی آتی ہے اور جب وعدہ وفا کرتی ہے تو وصل میں بھی اس کی شوخی اور شرارت نہیں جاتی:

ہر گھڑی مجھ کو قسم غیر کی دی جاتی ہے وصل میں ان کی نئی چھیڑ چلی جاتی ہے

منھ اندھیرے مجھ کو غافل دیکھ کر شوخی سے وہ چپکے اٹھ کر چل دیے پہلو میں تکیہ دھر گئے

محبوبہ کا کردار ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

ہیں رخ ناز پہ گنتی کے نشاں کس نے بو سے تیرے گن گن کے لیے

زلف برہم، عرق آلود جبیں، دامن چاک کس کی آغوش سے تو جان چھڑا کر نکلا

داغ کے دواوین کی غزلوں کا بڑا حصہ ایسے ہی مضامین اور خیالات سے بھرا پڑا ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کلام کی بے پناہ مقبولیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو معاشرہ اخلاقی انحطاط کی کس منزل پر پہنچ گیا تھا۔ داغ کی غزلیہ شاعری کا ایک چھوٹا سا حصہ آج بھی دل دادگانِ سخن کی توجہ کو کھینچتا ہے۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کلام میں شگفتگی ہے، معنویت ہے اور کہیں کہیں تہہ داری بھی ہے خاص طور پر زبان کی دلکشی مسحور کر دیتی ہے۔ داغ کی غزلیہ شاعری کی مجموعی خوبی اس کی غنائیت ہے جس

کی وجہ سے بعض معمولی اشعار بھی داد طلب ہو جاتے ہیں۔ اس مضمون کو داغ کے چند عمدہ اور پسندیدہ اشعار پر ختم کرتا ہوں:

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا
تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا وہ مرا بھولنے والا جو مجھے یاد آیا
لیجیے سنیے اب افسانۂ فرقت مجھ سے آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

یاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا کیا میں نہ تھا کہ آگ میں جلنے کو طور تھا

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی انھیں سنا ہی دیا حال داستاں کی طرح
اس کی گلی سے آئے کیوں، نکہتِ زلف لائے کیوں مجھ کو صبا سے ہے امید، مجھ سے صبا کو کیا غرض

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں ۔ مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں ۔ جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

جب پاؤں تھکے تو جستجو کی ۔ جب دل نہ رہا تو آرزو کی

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ۔ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

ترے وعدے کو بت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے ۔ کبھی شام ہے کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

تم آؤ جب سوار توسنِ ناز ۔ قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

اب آخر میں یہ چند یہ اشعار غزل جو سہل ممتنع کی کم یاب مثال ہیں:

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے ۔ دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ۔ دلِ بے مدعا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب ۔ نقشہ اپنا جما دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا ۔ جو دیا اے خدا دیا تو نے

●●●

Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Punjagutta
Hyderabad (A.P.)

محمود سعیدی

داغ دہلوی۔۔۔ مختصر سوانحی کوائف

پدری سلسلے سے داغ کے مورثِ اعلیٰ عارف جان تھے جو اپنے دو بھائیوں قاسم جان اور عالم جان کے ساتھ عہدِ احمد شاہ (1754-1748) میں وارد ہندوستان ہوئے اور بادشاہ کے ایما پر اٹک میں وہاں کے صوبیدار مرزا محمد بیگ کے پاس ٹھہرے۔ قاسم جان اور عالم جان جلد ہی دہلی چلے آئے مگر عارف جان کئی برس تک اٹک ہی میں رہے۔ 1760 کے لگ بھگ مرزا محمد بیگ نے عارف جان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی جس کے بطن سے 1762 کے اوائل میں عارف جان کا پہلا بیٹا تولد ہوا جس کا نام نبی بخش رکھا گیا۔ لگ بھگ تین سال بعد 1765 کے آس پاس عارف جان کے دوسرے بیٹے احمد بخش خاں کی ولادت ہوئی۔ سال بھر بعد 1766 کے اوائل میں عارف جان، شاہ عالم (1806-1759) کے بلانے پر بیوی بچوں کے ساتھ دتی چلے آئے۔ یہیں 1766 کے اواخر میں ان کا تیسرا بیٹا الٰہی بخش خاں پیدا ہوا۔ (یہ وہی الٰہی بخش خاں معروف ہیں جنھیں ہم مرزا غالب کے خسر کی حیثیت سے جانتے ہیں)

احمد بخش خاں مولانا فخر الدین چشتی سے، جو اپنے وقت کے اہل اللہ میں سے تھے، بیعت تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن جب احمد بخش انھیں وضو کرا رہے تھے، مولانا موصوف نے انھیں والیِ میوات کہہ کر مخاطب کیا جو بالآخر سچ ثابت ہوا۔

مولانا فخر الدین چشتی کی وفات 20 نومبر 1785 کو ہوئی۔ اس کے اگلے سال احمد بخش خاں بہ سلسلۂ ملازمت گوالیار چلے گئے اور وہاں زمرۂ سواراں میں ملازم ہو گئے۔ کئی برس بعد 1799 کے دوسرے نصف میں جب وہ اجمیر سے دتی آ رہے تھے، ان کی ملاقات الور کے راجا بختاور سنگھ سے ہوئی اور وہ ان کے ملازم ہو کر الور چلے گئے۔ اس کے تین یا چار سال بعد احمد بخش خاں کی بہن کی شادی مرزا غالب کے چچا، نصر اللہ بیگ خاں کے ساتھ ہوئی۔

1803 میں لسواڑی کی لڑائی میں راجا بختاور سنگھ کے ایما پر احمد بخش خاں نے اپنے فوجی دستے کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی۔ وہ بہت بہادری سے لڑے اور انھوں نے خطرے میں کود کر ایک انگریز سپہ سالار کی جان بھی بچائی۔ انگریزوں کی فتح ہوئی اور اگلے سال جب اس فتح کی خوشی میں دربار منعقد ہوا تو لارڈ لیک نے راجا بختاور سنگھ کو 14 نئے علاقے جاگیر میں دیے اور احمد بخش خاں کو جو سند دی گئی اس میں انھیں فخر الدولہ، دلاور الملک، نواب احمد بخش خاں بہادر، رستم جنگ لکھوایا اور فیروز پور جھرکہ، پونا ہانا، بچھور، سانگرس، نگینہ کے اضلاع بہ طور جاگیر انھیں دیے۔ اِس جاگیر میں پرگنہ لوہارو کا اضافہ راجا بختاور سنگھ نے اپنی طرف سے کیا۔ اب احمد بخش خاں کو نواب احمد بخش خاں بہادر والیِ فیروز پور جھرکہ ولوہارو کہا جانے لگا۔

کھانا شمس آباد ضلع گوڑگاؤں کے ایک شخص مسارام میو کی دو بیٹیاں موسی اور مدی نام کی تھیں۔ ان پر راجا بختاور سنگھ کی نظر پڑی۔ اس نے موسی کو اپنے پاس رکھ لیا اور مدی کو احمد بخش خاں نے اپنے لیے پسند کرلیا۔ 1809 میں اسی کے بطن سے احمد بخش خاں کے بیٹے شمس الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔

شمس الدین احمد خاں کی پیدائش کے تین سال بعد 1812 کے آس پاس احمد بخش خاں کی شادی بیگم جان سے ہوئی جو نیاز محمد بیگ خاں مغل برلاس کی بیٹی تھی۔ احمد بخش خاں کے بیٹے امین الدین احمد خاں 1814 میں اسی کے بطن سے پیدا ہوئے اور اس سے ذرا پہلے یا فوراً بعد احمد بخش خاں نے مدی کے نام کا اپنی باقاعدہ بیوی کے طور پر اعلان کیا اور اسے بہو بیگم کا لقب بھی دیا۔ اس طرح شمس الدین احمد خاں ان کے قانونی وارث ہو گئے۔ بیگم جان سے احمد بخش خاں کے دوسرے بیٹے ضیاء الدین احمد خاں، پہلے بیٹے کی پیدائش کے لگ بھگ سات برس بعد 1821 میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر 1827 میں احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جاگیر اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی اور ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو نوابی کے لقب کے ساتھ والیِ فیروز پور جھرکہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ لوہاروان کے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے حصے میں آیا۔ 1822 میں احمد بخش خاں نے انگریزی حکومت اور ریاست الور سے اس کی منظوری لے لی تھی جس پر جنرل آکٹرلونی اور سر جان مٹکاف کے دستخط کرا لیے گئے تھے۔ احمد بخش خاں کے انتقال کے وقت شمس الدین احمد خاں اٹھارہ انیس سال کے تھے اور ان کے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کی

عمریں بالترتیب گیارہ سال اور چار سال تھیں۔ ان کی کم عمری کی وجہ سے شمس الدین احمد خاں لوہارو پر بھی قابض ہو گئے لیکن بالآخر ولیم فریزر کی کوشش سے، جو دلی کا ریزیڈنٹ تھا، لوہاروان کے دونوں سوتیلے بھائیوں کے تصرف میں چلا گیا۔ اس کا اثر شمس الدین احمد خاں پر یہ ہوا کہ وہ ولیم فریزر کے سخت مخالف ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مخالفت میں اس وقت اور شدت آگئی جب کسی موقعے پر شمس الدین احمد خاں کی موجودگی میں اس نے ان کی بہن جہانگیرہ بیگم کی خوبصورتی کی تعریف کی ("بزم داغ" کا ایک بیان، بحوالۂ داغ، ص 215) ولیم فریزر اپنی رنگین مزاجی اور ہندوستانی عورتوں کی طرف خصوصی رغبت کے لیے بدنام تھا۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم ایک روایت یہ بھی ہے کہ فریزر نے شمس الدین احمد خاں کی داشتہ اور داغ کی والدہ چھوٹی بیگم سے بھی تعلق قائم کرلیا تھا۔

22 مارچ 1835 کی رات کو ولیم فریزر کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ابتدائی تفتیش کے بعد پولیس نے شمس الدین احمد خاں کے داروغۂ شکار کریم خاں کو فریزر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ کچھ دن بعد ان کا ایک اور نوکر واصل خاں بھی مشتبہ حالت میں گرفتار ہوا اور پھر شک کی سوئی شمس الدین احمد خاں کی طرف بھی گھوم گئی۔ تحقیقات کنندہ مجسٹریٹ نے انھیں لکھا کہ تحقیقات کو مکمل کرنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے، آپ کچھ دن کے لیے دلی آجائیں۔ شمس الدین احمد خاں نے اپنے افراد خاندان اور دیگر خیر خواہوں کے اس مشورے کے برعکس کہ وہ دلی جانے کے بجائے پنجاب، سکھ علاقے میں چلے جائیں، کسی بھرم میں دہلی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ 18 اپریل 1835 کو دلی پہنچ گئے جہاں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے خسر مرزا مغل بیگ خاں پر بھی بہت سختی کی گئی اور کچھ دن انھیں نظر بند بھی رکھا گیا۔ 21 ستمبر 1835 کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل انھیں ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی جس کی تعمیل میں 8 اکتوبر 1835 کی صبح کشمیری دروازے کے باہر شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ ایک گھنٹے تک لاش پھانسی پر لٹکی رہی، اس کے بعد نواب کے خسر مرزا مغل بیگ کے حوالے کر دی گئی جنھوں نے اسے لے جا کر قدم شریف میں دفن کرا دیا۔ بقول مالک رام (ذکرِ غالب، ص 36) اس وقت نواب شمس الدین احمد خاں کی عمر صرف 25 برس تھی۔

داغ کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی تین بیٹیوں میں سب سے

چھوٹی اور سب سے حسین تھیں، 1813 کے آس پاس پیدا ہوئی تھیں۔ وہ 1830 میں تقریباً سترہ برس کی عمر میں نواب شمس الدین احمد خاں سے وابستہ ہوئیں اور اس وابستگی کے ایک سال بعد 25 مئی 1831 کو بدھ کے دن داغ کی ولادت ہوئی۔ چاندنی چوک کے جس مکان میں داغ پیدا ہوئے وہ نواب شمس الدین احمد خاں ہی نے چھوٹی بیگم کو دلوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ داغ کا اصلی نام ابراہیم تھا۔ بعد میں انھیں نواب مرزا کہا جانے لگا۔ داغ سوا چار سال کے ہوں گے جب ان کے والد شمس الدین احمد خاں کو انگریزی حکومت نے پھانسی دی۔ داغ چاندنی چوک کے جس کوچے میں پیدا ہوئے تھے اب اس کا نام انھی کے نام پر کوچہ استاد داغ ہے۔

داغ کے نانا محمد یوسف کشمیری پیشے سے سادہ کار یعنی سنار تھے لیکن ڈیرے داری بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام راحت النسا تھا۔ اس نے باقاعدہ شادی کر لی تھی، منجھلی عمدہ بیگم نواب یوسف علی خاں والی رامپور سے ان کے زمانۂ ولی عہدی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ داغ کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم کا تعلق یکے بعد دیگرے پانچ لوگوں سے ثابت ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں (30-1829 تا اکتوبر 1835) ایک انگریز مارسٹن بلاک جو جے پور میں کسی اہم سرکاری عہدے پر تھا۔ (1836) آغا تراب علی (1840) نواب شمس الدین احمد خاں کے سوتیلے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ورخشاں (1843) اور مرزا فخرو (1844-1856)

داغ کے علاتی بہن بھائی کئی تھے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

والد یعنی شمس الدین احمد خاں کی طرف سے:

بیوی افضل النسا بیگم کے بطن سے دو بہنیں احمد النسا بیگم اور شمس النسا بیگم اور داشتہ چمپا کے بطن سے ایک بہن رحمت النسا بیگم ۔۔۔ داغ نے ان تینوں بہنوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھا۔

والدہ کی طرف سے:

مارسٹن بلاک کے صلب سے ایک بھائی امیر مرزا اور ایک بہن بادشاہ بیگم خفی۔ آغا تراب علی سے ایک بھائی آغا مرزا شاغل اور مرزا فخرو سے ایک بھائی مرزا خورشید عالم خورشید۔ داغ کے تعلقات ان سب کے ساتھ مشفقانہ رہے اور مختلف طریقوں سے انھوں نے ان کی مدد کرنے کی بھی کوشش کی۔

کالی داس گپتا رضا کے مطابق داغ کی بڑی خالہ راحت النسا بیگم (جو حافظ ولی محمد ولد عبدالصمد کشمیری سے بیاہی گئی تھیں) کی تین بیٹیاں تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی فاطمہ بیگم داغ سے بیاہی گئیں مگر ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اولاد سے محرومی کی تلافی داغ کی بیوی نے اس طرح کی کہ اپنی منجھلی بہن اولیا بیگم کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا۔ داغ نے اپنے بھائی امیر مرزا (ولد مارسٹن بلاک) کے بیٹے احمد کو بھی متبنٰی بنا لیا تھا مگر وہ ایام شیر خوارگی ہی میں مر گیا۔ داغ کے دیوانِ اوّل "گلزارِ داغ" کی ایک غزل کے آخری دو شعر اسی احمد سے متعلق ہیں:

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
دل کا سرور تھا، مری آنکھوں کا نور تھا

اے داغ! صدمۂ غمِ ہجراں بجا، درست
یہ سب سہی مگر تمھیں جینا ضرور تھا

داغ کا مقطع غالب کے مقطعے کی یاد دلاتا ہے:

صبر کرتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ فاطمہ بیگم داغ کی خالہ عمدہ بیگم کی بیٹی تھیں اور ان کا تعلق چونکہ صرف نواب یوسف علی خاں ناظم ہی سے رہا اس لیے فاطمہ بیگم کے والد نواب صاحب تھے۔

داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم کی پہلی شادی نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے برادرِ خورد نواب ممتاز الدین احمد خاں سے ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ہو گیا تو سائل نے دوسری شادی لاڈلی بیگم سے کر لی۔ داغ کے رشتے سے حیدرآباد سے لاڈلی بیگم کو تین سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ سائل نے ان سے نکاح کیا تو داغ نے سفارش کر کے دو سو روپے ماہانہ ان کا وظیفہ بھی مقرر کرا دیا۔ سائل داغ کے شاگرد بھی تھے اور داغ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بھی کہلائے۔

●

1844 میں جب داغ کی والدہ چھوٹی بیگم کی عمر تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی، بادشاہِ دہلی کے ولی عہد مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر المعروف بہ مرزا فخرو نے انھیں دیکھا اور ان کے حسن و جمال پر

فریفتہ ہو گئے، مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے (دیباچہ دیوانِ ذوق) کہ مرزا فخرو ابھی ولی عہد نہیں
بنے تھے۔ان کی عمر اس وقت 24، 25 سال رہی ہوگی، یعنی وہ چھوٹی بیگم سے پانچ چھ سال چھوٹے
تھے۔انھوں نے چھوٹی بیگم کی تصویر استاد ذوق کو دکھا کر اپنی پسند کی داد چاہی لیکن ذوق نے مرزا فخرو
کی پسند کو سراہنے کے بجائے چھوٹی بیگم کی بدچلنیوں کا ذکر چھیڑ دیا اور شہزادے کو ان سے دور رہنے کا
مشورہ دیا۔مرزا فخرو چھوٹی بیگم پر دل و جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ کچھ دن بعد انھوں نے ان سے
نکاح کر لیا اور وہ مرزا فخرو کی تیسری بیگم بن کر قلعے میں آگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا فخرو نے انھیں
نواب شوکت محل کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔مگر یہ روایت زیادہ معتبر نہیں۔

یہ داغ کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔اس وقت ان کی عمر 13، 14 سال کے درمیان رہی ہوگی۔
وہ اپنی ماں کے ساتھ لال قلعے میں پہنچے تو وہاں ان کی تعلیم اور مختلف فنون میں ان کی تربیت کا باقاعدہ
آغاز ہوا۔اگر چہ اس وقت مغلوں کی حکومت اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی لیکن لال قلعہ
اب بھی مرجعِ خاص و عام تھا۔داغ نے مرزا غلام حسین شکیبا، شاگردِ میر تقی میر کے بیٹے مولوی سید احمد
حسین سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں، میر پنجہ کش دہلوی سے خوش نویسی کے فن، مرزا عبیداللہ بیگ
سے بانک، مرزا اسگی بیگ سے پھکیتی، بجن اور بندو خاں سے گھوڑسواری کی تربیت حاصل کی۔تیر اندازی،
چورنگ اور بندوق چلانا داغ کو خود مرزا فخرو نے سکھایا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ داغ نے
ان کے دل میں کیسی جگہ بنالی تھی اور مرزا فخرو انھیں کتنا عزیز رکھنے لگے تھے۔شاعری میں بھی داغ کے پہلے
استاد مرزا فخرو ہی تھے، خود داغ کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنی کچھ ابتدائی غزلوں پر مرزا فخرو
سے باقاعدہ اصلاح لی تھی۔ پھر انھی کے مشورے پر ذوق کے شاگرد ہوئے۔ داغ پہلے مرزا تخلص
کرتے تھے، داغ تخلص بھی مرزا فخرو ہی نے دیا۔داغ کا بیان ہے کہ وہ حضرت خواجہ قطب الدین
بختیار کاکی کی درگاہ میں ذوق کے شاگرد ہوئے جہاں شاہ ظفر اور ولی عہد مرزا فخرو بھی موجود تھے۔
مرزا فخرو نے داغ کی طرف سے ذوق کو ایک دوشالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں اور ذوق نے اسی وقت
ان کی ایک غزل پر اصلاح کی۔تب سے ان کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ روزانہ سہ پہر کے وقت استاد کی
خدمت میں حاضر ہوتے اور مغرب تک وہاں رہتے۔داغ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ذوق بادشاہ کی غزل
اور ان کی غزل پر ''خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے'' دوسرے شاگردوں کی غزلیں

کوئی دوسرا پڑھتا جاتا اور وہ اصلاح دیتے جاتے۔ داغ نے ذوق سے خود ان کے بیان کے مطابق 1854 تک اصلاح لی جو ذوق کا سالِ وفات ہے۔ اس وقت داغ 23 سال کے تھے۔

داغ کے شاگرد احسن مارہروی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ غالب نے قلعے میں اپنی وہ غزل پڑھی جس کا مشہور شعر ہے:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بادشاہ ظفر کو یہ زمین بہت پسند آئی، حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ چنانچہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ بہ قولِ داغ ان کی جوانی کا زمانہ تھا، طبیعت پورے جوش پر تھی۔ غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا:

ہوئے مغرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ داغ کے پاس مصرعۂ طرح اسی دن پہنچا تھا جس دن رات کو مشاعرہ تھا۔ انھوں نے غزل کہہ کر دیوانِ خاص ہی میں ذوق کو دکھائی۔ انھوں نے تمام شعروں پر صاد کیا، اتنے میں بادشاہ تشریف لے آئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔

داغ کی والدہ چھوٹی بیگم پر ولیِ عہد سلطنت مرزا فخرو کا، اس کے باوجود کہ وہ عمر میں ان سے کئی برس بڑی تھیں، فریفتہ ہو جانا اور ان کے ساتھ داغ کی بھی لال قلعے میں رسائی داغ کی زندگی کا اہم واقعہ ہے۔ لال قلعے میں مرزا فخرو نے جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر سروسامان کیا وہیں قلعے میں رہ کر مغل بیگمات، مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے طرزِ معاشرت، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور آدابِ گفتگو سے انھیں قریبی واقفیت ہوئی۔ ذوق جیسے استادِ سخن نے ان کے شاعرانہ ذہن و ذوق کی تربیت کی اور قلعے میں بولی جانے والی ٹکسالی زبان پر وہ قابض و متصرف ہو گئے۔

10 جولائی 1856 کو مرزا فخرو کو ہیضہ ہوا اور چند گھنٹوں میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھیں زہر دیا گیا۔ داغ کی عمر اس وقت پچیس برس کی ہوگی۔ ان پر اس سانحے کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے مرزا فخرو کے انتقال کی جو تاریخ کہی ہے اس سے ان کی دلی کیفیت

کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ فارسی میں ہے:

غمِ فتح ملکِ سلطاں چہ بلائے جان و دل شد
دہدش مقامِ جنت ز کرم کریم غفار
چو ز داغ سالِ رحلت دلِ دردمند پرسید
بکشید آہِ حسرت دو صد و دوازدہ بار

ترجمہ: (محمد) سلطان فتح الملک کا غم دل و جاں پر بلا بن کر نازل ہوا ہے کرم گستر اور بخشش کرنے والا (خدا) انھیں اپنے کرم سے جنت میں جگہ دے۔

داغ سے جب دلِ دردمند نے ان کا سالِ رحلت پوچھا تو اس نے دو سو بارہ مرتبہ حسرت آمیز آہ کھینچی۔

بہ حسابِ ابجد "آہ" کے عدد چھ ہیں۔ اسے 212 سے ضرب دی جائے تو 1272 کے عدد حاصل ہوں گے۔ ہجری سنہ میں یہی مرزا فخرو کا سالِ رحلت ہے جو برابر ہے 1856 کے۔

مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغ اور ان کی والدہ کو قلعہ چھوڑ دینا پڑا اور وہ غالباً اسی چاندنی چوک والے مکان میں منتقل ہو گئے جو چھوٹی بیگم کو نواب شمس الدین احمد خاں نے دلوایا تھا۔

●

قلعے سے بے دخلی کے بعد 1856 کے باقی ماندہ مہینے اور 1857 کا سال داغ اور ان کی والدہ نے زیادہ تر دلّی میں گزارا۔ قلعے سے ان کی والدہ کی تنخواہ مقرر تھی جو 1857 کے ہنگامۂ دار و گیر تک انھیں ملتی رہی۔ جب قلعہ اور قلعے والے نہ رہے تو یہ تنخواہ بھی نہ رہی۔ اپنے ایک مقطعے میں حسرت بھرے انداز میں کہتے ہیں:

اے داغ اہلِ قلعہ کا لٹنا تو درکنار
تنخواہ تک خزانۂ شاہی میں رہ گئی

داغ کو دلّی اور اور دلّی والوں کی بربادی کا غم تھا مگر وہ اس کا ذمہ دار خود ہندوستانیوں کو سمجھتے تھے جنھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ داغ نے اپنے شہرآشوب میں جو انھوں نے اس واقعے کے بعد کہا تھا، دلّی اور دلّی والوں کی بربادی کا بڑا دردانگیز نقشہ کھینچا ہے:

لہو کے چشمے ہیں چشم پُرآب کی صورت
شکستہ کاسئہ سر ہیں، حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر، دلِ خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں، توبہ، عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے، طوق ہے، گردن ہے بے گناہوں کی

مگر وہ اس صورت حال کا ذمہ دار ان ہندوستانیوں کو ٹھہراتے ہیں جنھوں نے انگریز حکام کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت کی تھی:

غضب میں آئی خدائی بلا میں شہر آیا
یہ پُر بیے نہیں آئے، خدا کا قہر آیا

''پُربیے'' یعنی جنرل بخت خاں اور ان کے سپاہی۔ دراصل اس زمانے تک قومیت کا موجودہ تصور پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار کے منفی پہلوؤں سے ایک عام شہری کو کچھ زیادہ سروکار نہ تھا۔ کچھ ذاتی وفاداریاں ضرور تھیں اور وہ بھی اس طرح کی تھیں کہ بدلتے وقت کے ساتھ بدل سکتی تھیں۔

داغ کی خالہ عمدہ خانم نواب یوسف علی خاں ناظم کے زمانۂ ولی عہدی سے ان سے وابستہ تھیں۔ داغ 1857 کے آخر میں یوسف علی خاں کے نام، جو اب والیِ رامپور تھے، اپنی خالہ کا سفارشی خط لے کر رامپور پہنچے۔ یوسف علی خاں نے ان کی پذیرائی کی اور وہ سال بھر تک وہاں رہے۔ 1859 کے شروع میں وہ دلّی واپس آ گئے۔ اس کے بعد بھی دلّی اور رامپور کے درمیان ان کی آمد و رفت جاری رہی، یوسف علی خاں نے ان کی مہماں نوازی تو کی لیکن انھیں کوئی منصب نہیں دیا۔ ان کی وفات (29 اپریل 1865) تک وہ ولی عہد کلب علی خاں کے مصاحبوں میں شامل رہے۔ ان کے نواب ہو جانے کے لگ بھگ سال بھر بعد 4 اپریل 1866 کو انھیں ستر روپے ماہانہ پر فراش خانے اور اصطبل کا داروغہ مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کے بعد کا ایک دلچسپ واقعہ خود ان کی زبانی سنیے:

"ہم رامپور پہنچے اور ہمیں اصطبل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر یا بباطن حارج ہوئے۔ ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ صبح کو جب اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا۔ غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

شہر دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

یہ شعر ہماری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا گیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مُشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی، اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغے گئے تھے، اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت معلوم کیا۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کا کہنے والا کون ہے اگر مجھ سے آکر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس کی شاعرانہ طباعی اور ذہانت کی داد بھی دوں گا۔ لیکن افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنف کا پتہ نہ چل سکا۔"

محمد علی خاں اثر رامپوری کے مطابق یہ شعر میر احمد علی رسا رامپوری کا ہے لیکن کالی داس گپتا رضا نے اسے ان کے شاگرد شیخ علی بخش بیمار سے منسوب کیا ہے۔ شعر جس کا بھی ہو، ظاہر ہے داغ کی تضحیک کے لیے کہا گیا تھا، یہ داغ کی اعلیٰ ظرفی اور شاعری کے فن سے ان کا غیر معمولی شغف تھا کہ انھوں نے اس شعر پر کسی ناخوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس میں جو شاعرانہ ذہانت کارفرما تھی اس سے وہ لطف اندوز ہوئے۔

دلّی اور لکھنؤ کے تہذیبی اور ادبی مراکز 1857 کے بعد اجڑ گئے تھے اور وہاں کے اہلِ کمال اپنے قدر شناسوں کی سرپرستی سے محروم ہو کر پریشاں حالی میں مبتلا تھے۔ رامپور جغرافیائی اعتبار سے ان دونوں مراکز کے درمیان واقع تھا۔ وہاں کے حکمراں نواب یوسف علی خاں ناظم نے باغیوں اور انگریزوں کی آویزش میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ انگریزوں کے عتاب سے محفوظ رہے اور بہت سی مراعات کے بھی حقدار ٹھہرے۔ امن و اماں بحال ہوا تو ریاستِ رامپور پریشاں حال اہلِ کمال کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر گئی اور دونوں طرف سے شاعر، ادیب اور دوسرے فنکار

وہاں آکر جمع ہو گئے۔ شعرا میں امیر احمد امیر مینائی، امیر اللہ تسلیم، سید ضامن علی جلال، شیخ امداد علی بحر، منیر شکوہ آبادی اور منشی مظفر علی اسیر جیسے شاعروں کی رامپور میں موجودگی نے اس شہر کو دلّی اور لکھنؤ جیسی رونق بخش دی تھی۔ کلب علی خاں کی مسند نشینی کے بعد داغ کی رامپور دربار سے مستقل وابستگی نے اس رونق کو دو بالا کر دیا اور وہاں دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی امتیازی خصوصیات کی باہمی آویزش اور آمیزش ایک نئے طرزِ سخن کی ایجاد کا سبب بھی بنی۔

داغ اور رامپور کا رشتہ پرانا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، ان کی خالہ عمدہ خانم جنھوں نے ان کی پرورش بھی کی تھی، نواب یوسف علی خاں کے زمانۂ قیامِ دلّی سے ان سے وابستہ تھیں۔ نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی کے بعد جب یوسف علی خاں اور عمدہ خانم رامپور آئے تو داغ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت وہ نو سال کے تھے۔ وہاں انھوں نے مولف غیاث اللغات مولوی غیاث الدین سے فارسی پڑھی اور کہا جاتا ہے کہ خود نواب یوسف علی خاں نے بھی انھیں سکندر نامہ پڑھایا تھا۔

رامپور میں داغ کی زندگی آرام و آسائش کی زندگی تھی۔ نواب کلب علی خاں ان کی مقررہ تنخواہ کے علاوہ اپنی جیب خاص سے بھی انھیں کچھ دیتے رہتے تھے۔ دیگر کئی اشعار کے علاوہ داغ نے درج ذیل مقطعے میں بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

رئیسِ مصطفےٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے
کہیں کیا داغ ہم، آرام ہم نے کس قدر پایا

دسمبر 1866 میں نواب صاحب کے کلکتے کے سفر میں داغ ان کے ہمرکاب تھے اور 1872 میں جب نواب صاحب حج بیت اللہ کو گئے تو ان کے ساتھ داغ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ گلزارِ داغ (طبع اول) کے صفحہ نمبر 111 پر درج ایک غزل کے مقطعے میں داغ کہتے ہیں:

یہ سنا جو حضرتِ داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے، یہی فکر ہے، شب و روز عزمِ سفر سے خوش

کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر انھوں نے ایک غزل کہی جس کا اندازِ حمد یہ ہے۔ اس غزل کے چند شعر یہ ہیں:

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے　　دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دلِ بے مدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو بے غرض جو دیا، دیا تو نے
تھا مرا منہ نہ قابلِ لبیک کعبہ مجھ کو دکھا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

ان اشعار بلکہ اس غزل کے اکثر اشعار سے (یہ غزل 21 شعروں پر مشتمل ہے) داغ کے اس جذبۂ عبودیت کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ اس وقت سرشار تھے۔ حج سے واپسی پر بھی انھوں نے ایک غزل کہی جس کا مقطع ہے:

ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

حج کے لیے وہ نومبر 1872 میں روانہ ہوئے تھے اور مارچ 1873 میں یعنی پانچ مہینے بعد واپس رامپور پہنچے۔ 1878 میں ان کا پہلا دیوان ''گلزارِ داغ'' شائع ہوا۔ اگلے سال 1879 میں ان کی والدہ چھوٹی بیگم نے وفات پائی اور اسی سال پہلی بار داغ منی بائی حجاب سے ملے۔

●

داغ زیارتِ حرمین شریفین تو کر آئے مگر بتانِ ہند سے انھیں جو لگاؤ اور شغف تھا اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ رامپور میں شہر سے کچھ فاصلے پر بے نظیر باغ کے نام سے ایک باغ اور اس باغ میں ایک کوٹھی تھی جو نواب احمد علی خاں کی بنوائی ہوئی تھی۔ اس باغ کی خوبصورتی اور دلکشی کو داغ نے اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

ہو چکا ذکرِ خلد اے واعظ
وہ بھی کیا بے نظیر باغ ہوا

اسی بے نظیر باغ میں نواب کلب علی خاں نے ایک سالانہ میلے کی طرح ڈالی جو مارچ کے آخری ہفتے میں شروع ہوتا تھا اور آٹھ دس دن تک جاری رہتا تھا۔ میلے کا اہتمام شاہانہ شان کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ شعر و سخن اور رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ ہوتیں۔ باغ کے آس پاس شامیانے لگا دیے جاتے

جن میں بیرونی مہمان قیام کرتے۔ ان مہمانوں میں سپاہیانہ فنون کا مظاہرہ کرنے والے بھی ہوتے اور فنونِ لطیفہ کی نمائندگی کرنے والے بھی — 1879 کے میلے میں نواب کلب علی خاں کے چھوٹے بھائی حیدر علی خاں کی دعوت پر کلکتے کی ایک ڈیرے دار ماہ منیر عرف منی بائی بھی آئی۔ وہ شاعرہ بھی تھی اور حجاب تخلص کرتی تھی۔ اس کے زمانے میں شاعرات کے جو تذکرے مرتب ہوئے ان میں اس کا ذکر اور نمونۂ کلام موجود ہے۔ بعض نے اسے عبدالغفور نسّاخ اور بعض نے نسّاخ کے شاگرد مولوی عصمت اللہ اسخ کی شاگرد لکھا ہے۔ اس نے اپنا دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔ میلے کی ایک محفل میں جس میں داغ بھی شریک تھے، حجاب نے داغ کی یہ غزل گائی:

ترے وعدے کو بُتِ حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے، کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

جب مقطعے تک پہنچی تو بار بار داغ کی طرف دیکھتی اور یہ مصرعہ دہراتی:

جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی روسیاہ کا نام ہے

نثار احمد فاروقی کے لفظوں میں ''اس شوخی سے ساری محفل لوٹن کبوتر بن گئی اور خود داغ بھی ان اداؤں پر دل نچھاور کر بیٹھے۔'' اس وقت داغ کی عمر تقریباً اکیاون سال تھی۔

مثنوی ''فریادِ داغ'' میں، جو ان کے اس معاشقے کی روداد سناتی ہے، داغ نے حجاب کے حسن و جمال کی لفظی تصویر یوں اتاری ہے:

جٹی جٹی بھنووں کی وہ تحریر
کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر
گات بانکی، بدن سڈول تمام
فتنہ قد، فتنہ چشم، فتنہ خرام
سج دھج آفت، غضب تراش خراش
کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش

(مصرعۂ ثانی کہہ کر داغ نے خود کو اچھوں میں شامل کر لیا ہے)

اب ذرا اس کے ناز و انداز ملاحظہ کیجیے:

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
اِدھر آنا، اُدھر نکل جانا
کبھی کچھ تیوری پہ بل دینا
کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا
ہے نرالی ادا زمانے سے
روٹھنا اور بھی منانے سے
اِدھر اظہار درد و رنجِ فراق
اور اُدھر گفتگو تڑاق پڑاق

مثنوی ''فریادِ داغ'' 838 اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ داغ نے سفر کلکتہ سے واپس آ کر لکھی۔ ''جلوۂ داغ'' کے مطابق یہ ''دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے'' (ص 114)

داغ کی زندگی میں اس مثنوی کے پانچ ایڈیشن ایک ہی مطبع سے شائع ہوئے۔ کالی داس گپتا رضا ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ ان کے کتب خانے میں ''فریادِ داغ'' کا ایک قدیم نسخہ ہے جس کے خاتمۃ الطبع میں تحریر ہے: ''اگر چہ متقدمینِ دہلی کا اب اس عالمِ فانی میں وجود باقی نہ رہا مگر اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں ان میں سے جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی کی ذات مغتنمات سے سمجھی جاتی ہے...... مرزا صاحب نے یہ قیامت کی مثنوی تحریر فرمائی ہے...... فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد..... میں چھپ کر نذر شائقین ہوئی ہے۔''

(جہاں استاد داغ دہلوی، ص ص 22-121)

رضا صاحب نے حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے: ''داغ دہلوی کے بعد الگ سے ذرا اوپر کاتب نے باریک قلم سے ''مرحوم'' تحریر کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مثنوی کی کتابت پانچویں ایڈیشن کے لیے ہو چکی تھی کہ داغ کے انتقال کی خبر آئی۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی پانچویں بار 1905 میں چھپی جو داغ کا سالِ وفات ہے۔''

''فریادِ داغ'' تاریخی نام ہے جس سے 1300 کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔ گویا یہ مثنوی پہلی بار 1300ھ/1883 میں چھپی۔ داغ کے ایک خط سے جو حجاب کے نام ہے، پتا چلتا ہے کہ پہلا

ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گیا۔داغ لکھتے ہیں:

"مثنوی تمھاری تھی،تمھارے حال کی تھی،تمھاری صفات کی تھی۔ .. صاحب مطبع نے پندرہ سو کاپیاں چھاپی تھیں،مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں،مکرر چھپیں گی......"

(زبان داغ،ص ص 90-89)

داغ نے کلکتے کا پہلا سفر نواب کلب علی خاں کے ساتھ دسمبر 1866 میں کیا تھا۔منی بائی حجاب دو مرتبہ رامپور آئی اور اب اس کا اصرار تھا کہ اس سے ملنے داغ کلکتے پہنچیں۔داغ اس تقاضے کو ٹال نہ سکے اور نواب رام پور سے اجازت لے کر کلکتے کے لیے چل پڑے۔وہ اوائل اپریل 1882 میں رامپور سے روانہ ہوئے اور اپریل کی آخری تاریخوں میں پٹنہ پہنچے جو کلکتے کے راستے میں پڑتا تھا۔وہاں انھوں نے کئی ہفتے قیام کیا اور مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔پہلے مشاعرے کا مصرعہ طرح یہ تھا:

اُدھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں

داغ نے اس مشاعرے میں طرحی غزل کے علاوہ ایک غیر طرحی غزل بھی پڑھی جس کا مطلع تھا:

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے
ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

اور مقطع تھا:

دنیا میں ایسے لوگ مصیبت زدہ، کہاں
روئے ہم آج خوب گلے مل کے داغ سے

یہ غزل 15 شعروں پر مشتمل ہے اور داغ کے دوسرے دیوان" آفتاب داغ" صفحہ نمبر 65 پر درج ہے۔طرحی غزل بہت مشہور ہوئی،یہ 16 اشعار کی ہے اور" آفتاب داغ" کے 43ویں صفحے پر چھپی ہے۔اس کا مطلع یہ ہے:

بھویں تنتی ہیں،خنجر ہاتھ میں ہے،تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

داغ چونکہ رئیس زادے تھے(رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں)اس لیے سفر میں موسم کی سختی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی،خواہ یہ سفر اس محبوبۂ دلنواز کے لیے ہی ہو،جو انھیں جان و دل سے

عزیز تھی۔ پٹنہ سے کلکتے کے لیے عازمِ سفر ہونے سے پہلے انھیں موسم کے سازگار ہو جانے کا انتظار تھا:

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

داغ پٹنہ میں ایک مہینے سے بھی کچھ زیادہ مقیم رہے اور وسطِ ماہِ جون میں کلکتے کے لیے روانہ ہوئے لیکن ''فریادِ داغ'' کا ایک شعر ہے:

آٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی
یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

اکثر لوگوں نے اسے داغ کے سہو پر یا پھر غلط بیانی پر محمول کیا ہے لیکن کالی داس گپتا رضا کا کہنا ہے کہ یہاں آٹھ دن محاورتاً بہت دن کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے آٹھ پہر یعنی دن رات۔ یہ توجیہ کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں۔

داغ کے لیے رامپور سے کلکتے تک کا سفر آسان نہ تھا۔ اس وقت تک ان کے مالی حالات بھی ایسے نہ تھے کہ وہ بہ سہولت یہ سفر کر سکیں اور پھر اس کے لیے لمبی چھٹی لینا بھی ضروری تھا۔ لیکن حجاب کے اصرار نے انھیں مجبور کر دیا۔ انھوں نے رخصت لی اور پہلے دلّی آئے جہاں ایک ساہوکار سے کچھ رقم قرض لی۔ دلّی سے وہ لکھنؤ پہنچے وہاں انجم نیشاپوری نے ان کی میزبانی کی۔ لکھنؤ سے داغ نے پٹنہ کا رخ کیا۔ وہاں ان کے سوتیلے بھائی آغا مرزا شاغل موجود تھے۔ وہ محلّہ گڑ ہٹہ میں رہتے تھے۔ داغ اولاً انھی کے یہاں ٹھہرے مگر ان کا مکان زیادہ گنجائش والا نہ تھا اور داغ کے پاس آنے جانے والوں کی بھیڑ لگ گئی اس لیے وہ کچھ دن بعد میر باقر (شاگردِ وحید الہ آبادی، متوفی 11 فروری 1927) کی حویلی میں منتقل ہو گئے۔

پٹنہ سے داغ کلکتے پہنچے تو وہاں بھی ان کا پُر جوش استقبال ہوا۔ ''فریادِ داغ'' میں کلکتے پہنچنے کے بعد کی کیفیت انھوں نے اس طرح بیان کی ہے:

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا
داغ آیا تو باغ باغ آیا

خود بخود دل کھلا ہی جاتا تھا
قہقہہ لب پہ آہی جاتا تھا

موسم کی خوشگواری:

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں

اختلاط و انبساط کی گھڑیاں:

چاندنی کے تمام شب جلسے
دلکشا سقف پر عجب جلسے
رات عیش و نشاط میں گزری
صبح تک اختلاط میں گزری

منّی بائی کی سکونت کولوٹولہ اسٹریٹ پر تھی۔ داغ نے ناخدا مسجد کے سامنے ایک بالا خانے پر قیام کیا جو پہلے ہی سے اِن کے لیے حاصل کر لیا گیا تھا۔

داغ اور منّی بائی حجاب کا یہ معاشقہ بہت لمبا چلا۔ داغ افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے۔ ان کا محبوب تصوراتی نہیں تھا، وہ اس سے اپنے جسمانی تقاضوں کی تسکین اور تکمیل کے بھی طلبگار رہتے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جا سکتے تھے اس کی گواہی ان کے اس طرح کے اشعار سے ملتی ہے:

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
منّی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

لیکن منّی بائی حجاب کو انھوں نے جس انداز سے چاہا، آخر تک اس سے نباہ کی جو کوشش کی اور عمر کی اس منزل میں بھی جہاں جسمانی تقاضوں میں شدّت باقی نہیں رہتی، جس والہانہ جذبے کے ساتھ حجاب کی قربت کے وہ متمنّی رہے، اس سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں جسم پر دل غالب آگیا تھا۔

داغ کی کلکتے میں خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ حجاب سے شبانہ روز ملاقاتوں کا لطف ایک طرف،

دوسری طرف انھوں نے شہر کی ادبی محفلوں میں بھی دھوم مچا دی۔ شہر کے روٴسا اور مٹیا برج میں مقیم لکھنؤ کے شاہی خاندان نے بھی ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ وہ انھی رنگ رلیوں میں تھے کہ رامپور سے ان کی فوری طلبی ہوئی۔ وہ 3 جولائی 1882 کو کلکتے سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے اور 6 جولائی کو رامپور پہنچ گئے۔

●

رامپور میں داغ کو امیرانہ ٹھاٹ باٹ چاہے میسر نہ آئے ہوں لیکن وہ زندگی آرام و اطمینان کے ساتھ ضرور بسر کر رہے تھے کہ 23 مارچ 1887 کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ یہ داغ کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ان کا دل رامپور سے اچاٹ ہو گیا۔ ان کی ایک غزل جو ان کے تیسرے دیوان "مہتابِ داغ" میں شامل ہے، اس کے مقطعے میں انھوں نے اپنی اس ذہنی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

"خلد آشیاں" سے نواب کلب علی خاں مرحوم مراد ہیں۔ کلب علی خاں کے جانشین نواب مشتاق علی خاں اور ان کے مدار المہام اعظم الدین خاں کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ان دونوں کا رویّہ اربابِ فکر و فن کے لیے خاصا توہین آمیز تھا۔ داغ کو ملازمت سے برخاست کیا گیا یا خود انھوں نے استعفیٰ دیا یہ امر تحقیق طلب ہے لیکن داغ تقریباً 21 سال تک دربار رامپور کی ملازمت میں رہ کر 28 دسمبر 1887 کو رامپور سے دلّی چلے آئے۔ جس غزل کا مقطع اوپر درج ہوا اس کا یہ شعر بھی داغ کی اسی ذہنی کیفیت کا غماز ہے جس سے رامپور سے رخصت ہوتے ہوئے وہ دوچار ہوئے ہوں گے:

کہوں کیا طالعِ واژوں کی تاثیر
گرا ہوں میں پہنچ کر آسماں تک

انھیں خبر نہیں تھی کہ ابھی اس سے آگے کی بلندیاں ان کی منتظر ہیں۔

●

رامپور سے داغ سیدھے دلّی آئے اور کچھ دن یہیں مقیم رہے۔ پھر انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی شہروں کا سفر کیا جہاں ان کے شاگردوں اور قدر شناسوں نے ان کی خوب مدارات کیں۔ قریبی

مقامات امرتسر اور لاہور، جے پور، کشن گڑھ اور اجمیر شریف، متھرا، آگرہ اور علی گڑھ کے علاوہ انھوں نے بنگلور اور منگرول کا بھی رخ کیا اور وہاں بھی کچھ دن گزارے۔

داغ کے کئی قریبی شناسا اور ان کے مداح حیدرآباد دکن میں موجود تھے۔ ان میں نثار علی شہرت اور مولوی سیف الحق ادیب دہلوی بھی شامل تھے۔ ادیب، غالب کے شاگرد تھے اور حیدرآباد میں مترجم اخبارات سرکاری کے عہدے پر فائز تھے۔ ان دونوں کو خیال آیا کہ داغ کو حیدرآباد کیوں نہ بلوا لیا جائے، وہ ان دنوں بیکار ہیں، یہاں شاید ان کے لیے کوئی کام نکل آئے۔ مولوی سیف الحق ادیب نے کچھ ارکانِ ریاست سے مشورہ کرنے کے بعد داغ کو لکھا کہ وہ حیدرآباد آئیں۔ داغ نے والیِ دکن میر محبوب علی خاں کی ادب نوازی اور علم پروری کے چرچے سنے تھے، وہ قدرے تامّل کے بعد حیدرآباد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ نثار علی شہرت اور سیف الحق ادیب کے علاوہ میر خانساماں ابراہیم علی بھی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے داغ کو حیدرآباد آنے پر آمادہ کیا۔ داغ 7 اپریل 1888 کو حیدرآباد پہنچ گئے۔ مولوی سیف الحق ادیب کا قیام بازار سعدی عنبر میں تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کے قریب ہی ایک مکان داغ کے لیے کرائے پر لے لیا تھا، داغ اسی مکان میں ٹھہرے۔ ان کے حیدرآباد آنے کی خبر شہر میں عام ہوئی تو ان سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آنے والوں میں عام لوگ بھی تھے اور رؤسائے شہر بھی لیکن داغ تو والیِ دکن میر محبوب علی خاں تک رسائی کی امید اور ارمان دل میں لیے ہوئے تھے۔ کب وہ بلائیں اور کب یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اس طرف سے کوئی سلسلہ جنبانی نہ ہونے پر خود داغ نے راجا گردھاری پرشاد عرف بنسی راجا کی معرفت جو خود بھی شاعر تھے، باقی تخلص کرتے تھے اور داغ کے مداح تھے، حضور شاہ میں حاضری کی درخواست پیش کی جسے فوری طور پر پذیرائی حاصل ہوئی اور داغ کو دربار میں بلایا گیا۔ داغ نے قصیدہ پڑھا، قصیدے کی ستائش تو خوب ہوئی لیکن صلہ کچھ نہیں ملا۔ داغ دربار سے خالی ہاتھ لوٹے۔

ایک سال سے زیادہ مدت گزر گئی لیکن داغ کی امید بر نہ آئی، داغ دلّی سے آتے ہوئے جو رقم ساتھ لائے تھے وہ دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ ملازمت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ آخر داغ نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ 12 جولائی 1889 کو انھوں نے حیدرآباد کو خیرباد کہا اور بنگلور اور بمبئی ہوتے ہوئے دلّی پہنچ گئے۔ داغ نے حیدرآباد جاتے ہوئے کچھ رقم تو ایک مکان رہن رکھ کر حاصل کی تھی اور

کچھ قرض لی تھی۔ چھ ہزار روپے (جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی) داغ کے قیامِ حیدرآباد کے سال سوا سال کے عرصے میں خرچ ہو گئے۔ آمد و رفت کے مصارف اس پر مستزاد۔

اُدھر میر محبوب علی خاں کو جب معلوم ہوا کہ داغ دیارِ دکن سے ناامید ہو کر دلّی واپس چلے گئے ہیں تو انھوں نے وقار الامرا سے داغ کو خط لکھوایا جس میں ان سے دوبارہ حیدرآباد آنے کو کہا گیا۔ داغ نے اس بار مصارفِ سفر اور ملازمت ملنے تک قیامِ حیدرآباد کے اخراجات کے لیے اپنا ایک مکان فروخت کر دیا۔ وہ 29 مارچ 1890 کو دلّی سے روانہ ہو کر 3 یا 4 اپریل کو تازہ توقعات لیے حیدرآباد پہنچے۔ اس مرتبہ وہ محبوب گنج محلے میں کمان کے قریب واقع ایک مکان میں ٹھہرے۔ یہ مکان مولوی ظہور علی وکیل کے گھر کے قریب واقع تھا۔ یہ مکان زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ چند برسوں بعد جب داغ والیِ دکن کے مشیرِ سخن مقرر ہو چکے تھے، انھوں نے اس مکان کی سکونت ترک کر دی اور ترپ بازاری کی ایک شاندار کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

حیدرآباد سے متوسل ہونے کی داستان خود داغ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"...... یہاں پہنچ کر پھر ایک برس گزر گیا اور کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ میرا دل پھر اچاٹ ہوا، پھر اعلیٰ حضرت کے بعض مصاحبین کی خدمات میں معروضات پیش کیے اور کہا کہ میں جاتا ہوں۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰ حضرت کی سواری نکلی۔ صدر میں اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ پائیں میں دو صاحب تھے۔ جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی، میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو، یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں۔ دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپے کا منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے۔ یہ خبر عام طور سے مشہور ہو گئی۔ لوگ مجھے مبارکباد دینے کے لیے آنے لگے۔ میں نے جب اعلیٰ حضرت کے بعض مقربین سے دریافت کیا تو انھوں نے اس امر کی تصدیق کی، لیکن اس واقعے کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دلّی دور است کے مصداق کچھ نہیں۔ ایک دفعہ میں وقار الامرا سے ملنے کے لیے گیا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی میں ہی مجھے بلا لیا۔ میں وہاں ایک گاڑی پر پہنچا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے میں ان کا انتظار کرنے لگا، اتفاق دیکھیے، ٹہلتے ٹہلتے اعلیٰ حضرت بھی ادھر نکل آئے، میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا، کہاں ہیں؟ اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام بتایا گیا، جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے۔ گھوڑے پر سوار تھے۔ میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا، مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آ گئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے، جو اس وقت میری جیب میں تھے نذر گزرانے، اعلیٰ حضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں ان کے ساتھ ہولیا۔ اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سنانے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی:

دیکھے منصور اگر آج زمانا تیرا
ہو انا الحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا
داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانا تیرا
وہ دن آتے ہیں، وہ آتا ہے زمانا تیرا

مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے یہ دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا ''اس میں کیا شک ہے'' جس وقت ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سنے کچھ یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا، اسی غزل کا ایک شعر ہے:

مدّعی دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ
کل ہمارا تھا، جو ہے آج زمانا تیرا

مرزا صاحب بولے کہ میں نے یہ شعر بہت زور دے کر پڑھا۔ اعلیٰ حضرت بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ مجھ سے یہ شعر پڑھوایا، اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:

ترکِ عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی
کہیں نیچا نہ ہو اے گور سرھانا تیرا

میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا افسردہ ہو گئی، اعلیٰ حضرت بھی متاثر تھے، لیکن شاہی محل میں

اس طرح کی افسردگی بھی مجھے گوارا نہ تھی، فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی:

کس وجہ سے لب پر مرے فریاد نہ آتی
وہ چوٹ نہیں کھائی تھی، جو یاد نہ آتی،،

(بزمِ داغ ص ص 75-74)

داغ کی ملازمت کے سلسلے میں اس کے بعد بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ان پر پھر مایوسی غالب آنے لگی تھی کہ اچانک 6 فروری 1891 کی رات کو نو بجے ایک چوبدار آیا اور اس نے ایک سر بمہر لفافہ داغ کو دیا اور دربار میں حاضری کا حکم بھی سنایا۔ داغ نے لفافہ کھولا تو اس میں بہ غرضِ اصلاح والیِ دکن کی غزل تھی۔ داغ نے اسی وقت اصلاح کر کے سر بہ مہر لفافے ہی میں غزل واپس کر دی اور صبح دربار میں حاضر ہو کر نذر پیش کی۔ 4 اکتوبر 1891 کو چار سو پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ابتدائے ورودِ حیدر آباد سے منظور ہوا۔ تین برس تک یہی وظیفہ ملتا رہا، پھر اسے بڑھا کر ایک ہزار روپے ماہانہ کر دیا گیا اور یہ بھی ابتدائے ورودِ حیدر آباد سے محسوب ہوا، وقتاً فوقتاً قیمتی تحائف بھی ملتے رہتے تھے۔ داغ کو یہ توقع بھی تھی کہ نظام انھیں رہنے کے لیے کوئی کوٹھی بھی مرحمت کریں گے۔ ایک مقطعے میں کہتے ہیں:

حضور دیں گے تمھیں چند روز میں اے داغ
اٹھاؤ اور کوئی دن مکان کی تکلیف

مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ اس توقع میں خود انھوں نے بھی اپنے لیے مکان نہیں خریدا اور آخر تک اسی کرائے کی کوٹھی میں رہتے رہے جو ترپ بازار میں واقع تھی۔ والیِ دکن نے بلبلِ ہندوستاں، جہاں استاد، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ، نواب فصیح الملک بہادر کے خطابات سے بھی نوازا۔ داغ ان خطابات میں سے خود صرف فصیح الملک کا خطاب اپنے نام کے ساتھ لکھنے لگے تھے۔ داغ کا ایک اور مقطع ہے:

تم نمک خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

آصفِ سادس میر محبوب علی خاں نے داغ کی یہ آرزو بھی پوری کی اور انھیں ایک گاؤں عنایت

فرمایا جسے حیدرآباد کی اصطلاح میں مقطعے سے موسوم کیا جاتا تھا۔ داغ کو ایک باغ بھی مرحمت ہوا تھا اور منصب چہار ہزاری بھی۔

داغ کی جو قدر افزائی میر محبوب علی خاں نے کی وہ بے مثال کہی جا سکتی ہے۔ داغ شاہی عملے کے ارکان میں تھے اور دربار میں انھیں باعزت مقام حاصل تھا۔ شاہی مسند کے قریب چند خاص امرا اور عہدیداران کو نشست کی اجازت تھی۔ انھی میں داغ بھی تھے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا بیان ہے کہ جب آصفی دربار میں ریزیڈنٹ آتا تو کرسیاں بچھا دی جاتیں جن کی دو صفیں ہوتیں۔ وسط میں نظام اور ریزیڈنٹ بیٹھتے اور دوسری طرف ریاست کی دوسری سربرآوردہ شخصیتیں، داغ کو یہیں جگہ دی جاتی۔ سیر وشکار میں بھی داغ نظام کے ساتھ رہتے۔ داغ نے سرزمینِ دکن اور اہلِ دکن کو اپنے بہت سے اشعار میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

دلّی میں پھول والوں کی ہے ایک سیر داغ
بلدے میں ہم نے دیکھ لی سارے جہاں کی سیر

شہر ہے گلزار یوں، خلق ہے گلرنگ یوں
جیسے چمن در چمن باغ میں پھولے گلاب

کھل جائیں آنکھیں، دیکھتے ہی اس چمن کے پھول
رضواں کو ہم دکھائیں جو باغِ دکن کے پھول

شیوۂ راستی ایسا ہے دکن میں اے داغ
بَل نہیں رکھتے مسلمان سے ہندو دل میں

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم
یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

داغ حیدر آباد اکیلے گئے تھے لیکن جب 6 فروری 1891 کو وہ ملازمِ سرکار ہو گئے تو انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بیگم کو بھی حیدر آباد بلا لیا۔ فاطمہ بیگم نومبر یا دسمبر کے مہینے میں حیدر آباد پہنچیں۔ داغ شاہدانِ بازاری سے اپنے شغف کے باوجود بیوی سے محبت کرتے تھے۔ داغ کے اس کرّ وفر کے زمانے میں وہ تقریباً ساڑھے سات سال داغ کے ساتھ رہیں اور دسمبر 1898 میں ان کا انتقال ہو گیا جس کا داغ نے ہفتوں سوگ منایا۔ امیر مینائی کے تعزیت نامے کے جواب میں انھوں نے 14 شعبان 1316ھ کو جو خط لکھا تھا اس سے ان کے غم کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

داغ جب رامپور میں تھے تو امیر اور جلال سے ان کے بڑے قریبی مراسم قائم ہو گئے تھے۔ دکن کی عیش و عشرت کی زندگی میں بھی وہ انھیں فراموش نہ کر سکے۔ ایک غزل کے مقطعے میں کہتے ہیں:

اے داغ! ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سیّد جلال سے

امیر مینائی کو تو انھوں نے حیدر آباد بلوایا بھی، وہ اپنے اثر و رسوخ سے ان کے شایانِ شان کوئی منصب انھیں دلوانا چاہتے تھے مگر امیر کی زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ 5 ستمبر 1900 کو حیدر آباد پہنچے اور 14 اکتوبر 1900 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ امیر کی وفات پر داغ نے 3 تاریخی قطعے کہے۔ پہلا قطعہ طویل ہے جس میں داغ نے امیر کے علم و فضل اور ان کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی شعر یہ ہے:

ہے دعا بھی داغ کی، تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر

1318ھ

دوسرا قطعہ بہت مشہور ہوا:

کر گئے رحلت امیر احمد امیر
اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغ کے
آہ لطفِ شاعری جاتا رہا

1317+1=1318

آخری مصرعے سے 1317 برآمد ہوتے ہیں، داغ کا دل کنایہ ہے الف کے لیے جس کا ایک عدد شامل کرنے سے مطلوبہ 1318 عدد پورے ہو جاتے ہیں— داغ نے اور بھی بہت سی تاریخیں کہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس فن پر بھی عبور رکھتے تھے۔

●

یکم جنوری 1903 کو وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کی خوشی میں دہلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ تمام والیانِ ریاست مدعو تھے۔ نظام بھی اس دربار میں شریک ہوئے اور جو چند عمائدینِ سلطنت ان کے ہمرکاب تھے، ان میں داغ بھی تھے۔ حیدرآباد کی ملازمت کے بعد داغ کا یہ پہلا سفرِ دلی تھا جو آخری بھی ثابت ہوا۔ وہ جب تک جشنِ تاج پوشی کی تقریبات کے سلسلے میں دلی میں مقیم رہے، اپنے پرانے دوستوں، مداحوں، شاگردوں اور عزیز و اقارب سے ملتے رہے اور ان کی ملاقاتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔ ان سے ملاقات کرنے والوں میں سید وحید الدین بیخود دہلوی، جو بعد کو ان کے جانشین کہلائے اور مولوی عبدالرزاق کانپوری بھی تھے۔ دونوں نے ان ملاقاتوں کا حال قلمبند کیا تھا۔ بیخود کا مضمون بہ عنوان ''داغ کی شخصیت'' رسالہ ''ساقی'' دہلی (ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی) کے مارچ 1940 کے شمارے میں شائع ہوا تھا، مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنف البرامکہ) کا مضمون ''دہلی دربار'' ان کے مجموعۂ مضامین ''یادِ ایام'' (مطبوعہ 1946) کے حوالے سے تمکین کاظمی نے اپنی کتاب ''نواب مرزا خاں داغ'' میں شامل کیا ہے۔

داغ شاید طبعاً عاشق مزاج تھے اور پھر جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور عنفوانِ شباب کا دور گزارا اس نے ان کے اس فطری میلان کو اور بھی تقویت دی۔ اس دور کے روٴسا اور امرا بہ یک وقت کئی کئی عورتوں سے جنسی تعلقات رکھنے کو نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے شانِ امارت کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی خیال کرتے تھے۔ داغ نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور وہ اس ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ جب ان کے معاشی حالات زیادہ اچھے نہیں تھے تب بھی اپنی عشق پیشگی کے وہ اسیر رہے اور جب حالات بہت اچھے ہو گئے تو باوجود اس کے کہ وہ عمر کی آخری منزلوں میں تھے، وہ اور بھی کھل کھیلے اور بہ یک وقت دو دو تین تین طوائفوں سے ان کے مراسم رہے۔ یہ مراسم ظاہر ہے جنسی سے زیادہ جذباتی نوعیت کے رہے ہوں گے۔ اس عمر میں ان کی ذہنی کیفیت

وہی رہی ہوگی جس کا اظہار غالب کے اس شعر میں ہوا ہے:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

زندگی میں جانے کتنی طوائفوں سے داغ کے مراسم رہے ہوں گے لیکن ان کا کوئی دیرپا نقش داغ کے روز و شب پر نظر نہیں آتا۔ یہ دیرپا نقش صرف کلکتے کی منّی بائی حجاب نے چھوڑا جسے وہ ہمیشہ اپنے دل میں بسائے رہے۔

حجاب کو داغ نے آخری بار 3 جولائی 1882 کو کلکتے میں الوداع کہا تھا۔ پھر وہ کچھ ایسے حالات سے دو چار رہے کہ حجاب سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکال سکے۔ 1899 میں انھوں نے نظام حیدر آباد کے ساتھ کلکتے کا سفر بھی کیا لیکن غالباً نظام کے معمولات کی پابندی کی وجہ سے انھیں حجاب سے ملاقات کی مہلت نہیں ملی۔ اس وقت تک کوئی جتنے صاحب حجاب کو پردہ نشیں بھی بنا چکے تھے۔ داغ کے اس سے مل نہ سکنے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی۔

داغ کی حجاب سے ملاقات چاہے نہ ہو سکی ہو لیکن حجاب تک یہ خبریں ضرور پہنچی ہوں گی کہ داغ والیِ دکن کے ساتھ کلکتے آئے ہیں اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ آئے ہیں۔ اس کے دل میں بھی پرانی یادوں نے انگڑائی لی ہوگی چنانچہ اس نے داغ کے ساتھ مراسلت کا رابطہ قائم کیا اور ان کے ایما پر جتنے صاحب سے طلاق لے کر داغ کے پاس حیدر آباد جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دسمبر 1898 میں داغ کی اہلیہ فاطمہ بیگم کا انتقال ہو گیا تھا، عجب نہیں کہ انھوں نے حجاب سے یہ وعدہ بھی کیا ہو کہ وہ اس سے نکاح کر لیں گے۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دہلی دربار (جنوری 1903) سے داغ، جو نظام کی ہمراہی میں تھے، واپس ہوئے تو ان کے ورودِ حیدر آباد کے فوراً بعد کسی نے ان سے پوچھا کہ آخر اب آپ کیوں حجاب سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، آپ کی بتیسی مصنوعی ہے، سر اور داڑھی کے بال خضاب سے رنگے جاتے ہیں؛ تو داغ نے کہا کہ مجھے اپنی کبرسنی کا احساس ہے لیکن میری مسہری آج بھی ایک نو عروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے، رنگین جالی کے پردے ہیں، جن پر گوٹا لگا ہوا ہے اور انگوری مخمل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے۔ یہ سب روا ہے تو منّی بائی حجاب میرے لیے کیوں ناجائز کر دی جائے۔ اس سے پہلے داغ نے اپنے بے تکلف دوستوں کی ایک محفل میں یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا

جنے صاحب سے طلاق کے بعد حجاب کو عدت میں بیٹھنا ہوگا۔

داغ نے 3 جولائی 1883 کو حجاب کو کلکتے میں صدا حافظ کہا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کے بعد انھوں نے 18 یا 19 جنوری 1903 کو اسے حیدر آباد میں خوش آمدید کہا۔ انھوں نے حجاب کے قیام کے لیے ایک مکان کا انتظام کر دیا اور اس کی ماہانہ تنخواہ بھی مقرر کر دی جو سیدہ جعفر کے بیان کے مطابق ابتدا میں ساٹھ روپے تھی پھر سو روپے کر دی گئی (داغ دہلوی، حیات اور کارنامے، دہلی اردو اکادمی، ص 56)۔ حجاب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ یہ رقم اس کی ضرورتوں کی کفالت کے لیے ناکافی تھی، وہ مزید رقم کا مطالبہ کرتی ہوگی۔ داغ نے اپنے ایک عزیز شاگرد میر حسن علی خاں کو ایک بار لکھا تھا: "حجاب کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، آئے دن سرگراں رہتی ہے۔"

(خطوطِ داغ، مرتبہ رفیق مارہروی)

حجاب حیدر آباد پہنچی تو اس پر مذہب کا رنگ چڑھ چکا تھا اور وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی۔ رمضان کے علاوہ بھی روزے رکھنے لگی تھی اور اوراد و وظائف سے بھی شغف پیدا ہو گیا تھا۔ میر یٰسین علی خاں نے، جنھوں نے اس وقت حجاب کو دیکھا تھا، اس کا حلیہ یوں بیان کیا ہے: "کوئی 45-40 کا سن ہوگا۔ رنگ صاف، آنکھیں بڑی بڑی، ناک اونچی، بالوں پر خضاب چڑھا ہوا، پتلے پتلے لب، میانہ قد، اونچی پیشانی، مانگ پھٹی پھٹی سی، تنگ اطلس کا پاجامہ، مغزی لگا ہوا لانبا کرتا اور اس پر سفید اوڑھنی، پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں میں انگوٹھیاں"

(نگار، جنوری 1953)

حجاب بھی توقع لے کر آئی تھی کہ داغ اس سے نکاح کریں گے۔ اس نے آنے سے پہلے ہی داغ کو لکھ دیا تھا کہ "جب تک نکاح نہیں کر لو گے، تمھارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں نے یہ تمام جھگڑا اس لیے نہیں کیا کہ شرعی باتوں کی خلاف ورزی کروں۔ تم اس بھروسے میں نہ رہنا کہ میں تمھارے سامنے آؤں۔"

داغ کے روزنامچہ نگار کا بیان ہے "ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں ہے..... مرزا صاحب فرما رہے تھے کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی" (22 جنوری 1903)

لیکن داغ حجاب کو اس رنگ میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے جانماز اور تسبیح بھجوانے کا

حجاب کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے یہ بھی کہلا بھیجا کہ'' جب تک تمھارے اوراد و وظائف نہیں چھوٹیں گے، اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہ بن سکو، اس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں۔''

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، داغ حجاب کو سو روپے ماہوار دینے لگے تھے مگر وہ اس رقم کو اپنی کفالت کے لیے ناکافی خیال کرتی تھی اور اس نے اِدھر اُدھر سے قرض لینا شروع کر دیا جس کی ادائگی بالآخر داغ ہی کو کرنی پڑتی۔ پھر حجاب نے کلکتے سے اپنے متوسلین کو بھی بلا لیا اور اس کے نتیجے میں روزمرہ کے اخراجات اور بڑھ گئے۔ داغ حجاب کی خاطر یہ اضافی اخراجات بھی شاید جھیل لیتے لیکن حجاب ان کے معمولات میں بھی دخیل ہونے لگی۔ داغ کا مشہور شعر ہے:

تو جو ہر جائی ہے، اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی

حجاب نے سوچا ہوگا کہ اب اِدھر اُدھر کے سارے رشتے توڑ کر وہ داغ کے پاس چلی آئی ہے تو انھیں بھی '' تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی'' کا رویہ ترک کر دینا چاہیے۔ ادھر داغ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ انھی دنوں جب حجاب کی حیدرآباد میں آمد آمد تھی اور وہ اسے ایسے عاشقانہ خطوط لکھ رہے تھے:

'' دشمنِ جانی، سلام شوق۔ عین انتظار میں تمھارا محبت نامہ دستیاب ہوا۔ کئی بار پڑھا اور آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا۔ تم لکھتی ہو مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ۔ یہ کرلو گے جبھی تمھارے پاس آؤں گی۔ خوب، تم کو میں بھول جاؤں:

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
نادان! کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آ جاؤ، پھر ہم ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔''

کہ ان کے شاگرد رشید نوح ناروی حیدرآباد آئے اور انھوں نے استاد کی خدمت میں الٰہ آباد کی ایک طوائف بنی جان کی تصویر سوغات میں پیش کی۔ داغ تصویر دیکھ کر ہی بنی جان پر لٹو ہو گئے اور انھوں نے اسے لکھا: '' کیوں جی! تم سے کیونکر ملیں، تم کو کیونکر دیکھیں، کیونکر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں؟''

(انشائے داغ، ص 66۔ خط پر 15 دسمبر 1901 کی تاریخ درج ہے)

خط میں '' کیونکر سنیں '' کے لفظ توجہ طلب ہیں۔ داغ کو گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ حجاب کے حیدر آباد آجانے کے بعد بھی انھوں نے اختر جان نامی ایک مغنیہ کو ملازم رکھا ہوا تھا جس سے کبھی کبھار داغ گانا سنا کرتے تھے۔ حجاب نے اس کی برطرفی کا بھی مطالبہ کیا اور عدت پوری ہوتے ہی نکاح کی بھی خواستگار ہوئی۔ داغ نے خود بھی یہی ڈھنڈورا پیٹا تھا کہ وہ حجاب سے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر اب سچ مچ یہ مرحلہ آیا تو وہ گھبرا گئے۔ ایک دن انھوں نے اپنے احباب سے کہا'' کچھ سنا؟ نکاح کا تقاضا ہو رہا ہے۔ بڈھے ہو گئے، منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں، نکاح کا ماحصل اور جزو اعظم دونوں کے پاس ندارد۔''

حجاب نے کچھ دن انتظار کیا کہ داغ اس کی راہ پر آجائیں، اُدھر داغ نے بھی نباہنے کی اپنی سی کوشش کی مگر دونوں ہی ناکام رہے۔ داغ سے مایوس ہو کر حجاب اگست 1904 میں کلکتے واپس چلی گئی۔۔۔ تمکین کاظمی '' معاشقۂ حجاب و داغ '' میں لکھتے ہیں:

'' یہ صرف وضع داری اور دل لگی تھی۔ اس جذبۂ تفریح کو محبت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دونوں طرف ایک ہی جذبہ کار فرما تھا۔ داغ اپنی دولت و ثروت اور عزت و امارت کا نقش حجاب کے دل پر بٹھانا چاہتے تھے اور حجاب کی نظر داغ کی دولت پر تھی '' (ص 61)

یہ خیال کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ داغ کے ایک مقطعے سے حجاب کے رویّے کی نشاندہی ہوتی ہے:

داغ سے کہتے ہیں سب دے دو مجھے
جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے

لیکن کم از کم داغ کے دل میں حجاب کے لیے نرم گوشہ ضرور تھا۔ حجاب کے کلکتے چلے جانے کے بعد داغ زیادہ زندہ نہیں رہے لیکن جب تک رہے، اسے ماہانہ کچھ بھجواتے رہے۔

حجاب اگست 1904 میں داغ سے خفا ہو کر کلکتے واپس چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے لگ بھگ سات مہینے بعد 16 فروری 1905 کو داغ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ '' دبدبۂ آصفی '' (شمارہ 9، جلد 8، صفحہ 29، 6 ذی الحجہ 1322ھ) میں داغ کے مرض الموت کی تفصیل شائع ہوئی تھی جس کے مطابق وہ آٹھ دن تک بستر علالت پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بائیں طرف فالج کے حملے کی وجہ سے جسم کا ایک حصہ بیکار ہو گیا تھا۔ نور اللہ محمد نوری نے عبدالمجید آزاد کے حوالے سے لکھا

ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں داغ کو زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے آزاد سے کہا تھا ''اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی، گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے، غزل کہنے اور سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے...... یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں:

ہوش و حواس، تاب و تواں، داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

(داغ دہلوی، ص24)

آصف سادس نے اپنے استاد کی رحلت کی خبر سن کر تجہیز و تکفین کے لیے خزانہ شاہی سے تین ہزار روپے بھجوائے۔ داغ کی نماز جنازہ عیدالضحیٰ کی صبح مکہ مسجد میں ادا کی گئی اور درگاہ یوسفین میں وہ اپنی رفیقہ حیات کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ وہیں ان کے ہمعصر امیر مینائی بھی آسودۂ خاک ہیں۔

●

ماخذ

01	جلوۂ داغ	احسن مارہروی	1902
02	آئینۂ داغ	محمد نثار علی شہرت	1905
03	ماہنامہ نگار، لکھنؤ	داغ نمبر	1953
04	بزمِ داغ	رفیق مارہروی	1956
05	داغ دہلوی	تمکین کاظمی	1960
06	جہاں استاد داغ دہلوی	کالی داس گپتا رضا	1997

●●●

3/141 C,
Krishna Kunj Extenstion,
Laxmi Nagar,
Delhi - 110092

فیروز احمد

تلمیذِ داغ ــــ نسیم بھرت پوری

داغ کے حلقۂ تلامذہ کا دائرہ کتنا وسیع تھا، اور وہ ملک کے اطراف و اکناف میں کہاں کہاں موجود تھے، آج اس کا صحیح طور پر اندازہ بھی آسان نہیں، یہی وجہ ہے کہ تلامذۂ داغ کی کوئی جامع فہرست اب تک مرتب نہیں ہو سکی۔ لیکن اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ داغ کی شہرت اور مقبولیت میں ان کے تلامذہ کا بھی اہم کردار تھا۔ (1) ان تلامذہ میں سے متعدد آگے چل کر اساتذہ کی صف میں شامل ہوئے اور انھیں نام و نمود بھی حاصل ہوا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ داغ کے شاگردوں میں اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل شعرا کی تعداد کم اور معمولی شاعروں کی تعداد زیادہ ہے مگر یہاں سوال شاگردوں کی کثرت اور قلت کا نہیں بلکہ اردو شاعری اور بالخصوص غزل کی ان شعری روایات کے احترام اور ان سے غیر معمولی رغبت کا ہے جو داغ اور ان کے معاصر امیر مینائی کی کوششوں سے وجود میں آئی اور جس کے فروغ و ارتقا میں ان اساتذہ کے تلامذہ بھی شریک رہے۔ اس روایت کو آسانی کے لیے زبانِ دہلی میں رنگِ لکھنؤ کی نمود سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے یہ روایت اپنی سرشت میں خالص دہلوی ہے اور نہ ہی لکھنوی بلکہ میری ناقص رائے میں 19 ویں صدی کے وسطی زمانے تک ان دونوں مراکز کی مسلمہ ادبی اقدار کے خلاف ایک ردِ عمل ہے اور چونکہ اس ردِ عمل میں مذکورہ دونوں شعری مراکز کے شعرا شامل ہیں اس لیے اس شعری روایت میں خاص طرح کی دلکشی اور کشش ہے جو موضوع اور بیان دونوں پر محیط ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس شعری روایت میں جو بیسویں صدی کی چند ابتدائی دہائیوں تک بے حد مقبول رہی، داخلیت کا فقدان ہے مگر یہ پوری طرح خارجیت کے بھی تابع نہیں۔ اس روایت سے ہم آہنگ شعرا کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شعر و ادب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے ذریعے زندگی میں لطف و انبساط کا سامان پیدا کیا جائے۔ ان میں سے متعدد شعرا تصوف کے روایتی

تصورات میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، مگر ان کے غالب اور حاوی میلان کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ متصوفانہ موضوعات امیر و داغ کی شعری روایت میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

ابھی ہم نے کہا ہے کہ داغ کے تلامذہ کی کوئی جامع فہرست اب تک مرتب نہیں ہو سکی۔ جب پہلی بار تلامذۂ داغ کی فہرست مرتب کی گئی تو داغ کے شاگردوں کی تعداد سو (100) تحریر کی گئی۔ اس فہرست کے مرتب "یادگار داغ" کے مصنف محمد اکبر علی خاں متخلص بہ افسوں تھے۔(2) بعد ازاں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے چند دوسرے ماخذات کے حوالے سے یہ تعداد 140 تک پہنچا دی۔(3) "تلامذۂ داغ" کے نام سے مرتبہ ایک دوسری کتاب میں داغ کے شاگردوں کی تعداد میں مزید اضافہ کیا گیا۔(4) اس اضافے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ فہرست اب بھی نا تمام ہے اور اس جانب مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

اکبر علی خاں اور ڈاکٹر محمد علی زیدی کی جن کتابوں کا ذکر کیا گیا، ان میں داغ کے اہم اور غیر اہم دونوں قسم کے شاگردوں کے نام ہیں۔ لیکن ان فہرستوں میں جس تلمیذِ داغ کا نام عزت و احترام کے ساتھ میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف نظام دکن کے فوراً بعد تحریر کیا گیا ہے، وہ ہیں نسیم بھرت پوری۔ نسیم بھرت پوری کا تعلق راجستھان سے تھا، جہاں ان کے علاوہ اور بھی تلامذۂ داغ موجود تھے اور اپنے دور کے خوش فکر شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ مگر آج انھیں زمانہ فراموش کر چکا ہے۔

نسیم کا اصل نام شبیر حسن تھا یا شبیر حسین، اس سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔ "تذکرۂ اقلیم سخن" کے مرتب ڈاکٹر محمد رضی راہی نے "گلدستۂ ادب" مرتبہ محمد حسین بیانوی (1912) کے حوالے سے ان کا نام شبیر حسن لکھا ہے(5) "زبان داغ" مرتبہ رفیق حسن مارہروی میں بھی شبیر حسن ہی ہے(6) البتہ اس کے ساتھ لفظِ سید کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ داغ کے ایک خط بنام احسن مارہروی سے بھی شبیر حسن کی تائید ہوتی ہے۔ اس خط کے جملے یہ ہیں:

"......میرے گھر کے لوگ مع انا بسم اللہ وغیرہ دس آدمی چلے گئے۔ شبیر حسن بھی ان کے ساتھ گئے......"(7) اس کے برعکس فیض بھرت پوری نے اپنے ایک مضمون بعنوان "بھرتپور کی تاریخ مرثیہ نگاری" (مشمولہ مراثی فیض جلد دوئم۔ ص 41) میں نسیم کا نام سید شبیر حسین تحریر کیا ہے(8) اور یہی نام نسیم بھرتپوری کے دیوان موسومہ "ریاض نسیم" کے مرتب سید ابرار حسین تپاں نے بھی لکھا

ہے (9) تپاں نسیم کے شاگرد تھے اور وہ اکبر آبادی ہونے کے باوجود نسیم سے بہت قربت رکھتے تھے، اس لیے ان کے تحریر کردہ نام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ اس بیان کو فیض بھرتپوری (10) کے تحریر کردہ نام سے بھی تقویت پہنچتی ہے، اس لیے میرے خیال میں ان دونوں حضرات نے نسیم کا جو نام تحریر کیا ہے، وہی درست ہے اور اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

نسیم کے اصل نام کی طرح ان کے وطن کے متعلق بھی شبہات موجود ہیں۔ بھرتپور (راجستھان) میں چونکہ نسیم کا قیام بسلسلۂ ملازمت اخیر دم تک رہا، اس لیے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بھرتپور ان کی جائے پیدائش بھی ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ نسیم کی ولادت پہرسر میں ہوئی تھی جو بھرتپور سے تقریباً 20 کلومیٹر دور ایک موضع ہے۔ یہ موضع زمانہ قدیم سے اپنی تاریخی حیثیت کے سبب راجستھان کے ممتاز علاقوں میں شمار کیا گیا ہے۔ (11) یہاں اور اس سے ملحق ہیلک اور بیانہ میں آزادی سے قبل اہل سادات کی بستیاں تھیں جو تقسیم ملک کے وقت بھڑ کے فسادات کے سبب باقی نہ رہیں۔ سید ظہیر الحسن رضوی اپنی محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''1941 کی مردم شماری کے مطابق باشندگان موضوع (پہرسر) کی تعداد 1506 تھی۔ عموماً یک جدی سادات جعفری کی آبادی تھی، سادات رضویہ بھی کافی تعداد میں آباد تھے۔ دونوں کا مذہب امامیہ تھا۔'' (12) یہی مصنف پہرسر کی مذہبی تقریبات پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ ''راقم الحروف کے زمانے میں چندہ ڈیڑھ پٹی (پہرسر کے ایک محلے کا نام) کی مجلس میں خاص طور پر سیّد شبیر حسین صاحب جعفری نسیم پہرسری اپنا تصنیف مرثیہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ ان کے بعد ان کے یا اپنے کلام کو ان کے شاگرد پڑھتے تھے.... شب شہادت دسویں محرم الحرام کو ہر عزا خانے کی زیارت کو علاوہ اہل پہرسر دیہات گرد و نواح سے غیر اقوام کے مرد عورت بھی بکثرت آتے تھے اور ہر قسم کی منتیں مانگتے۔'' (13)

ہیلک اور بیانہ کی طرح پہرسر کا الحاق بھی ریاست بھرتپور سے تھا، اور یہاں آباد شرفا چونکہ زیادہ تر تعلیم یافتہ تھے اس لیے مہاراجہ جسونت سنگھ والیِ ریاست بھرتپور کے زمانے تک پہرسر میں انھیں عروج حاصل رہا۔ اس کے بعد حالات میں تبدیلی آتی چلی گئی تا آنکہ تقسیم ملک کی آندھی نے یہاں کے سادات کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔

نسیم کا تعلق اسی پہرسر سے تھا۔ اور جیسا کہ محولہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے، وہ جعفری سید تھے

اور نسیم پہرسری کہلاتے تھے۔ ہمارے پیش نظر متعدد ایسے شعری گلدستے بھی ہیں جن میں پہرسر سے تعلق رکھنے والے اکثر شعرا کے نام کے ساتھ کبھی پہرسری لکھا گیا ہے اور کبھی بھرتپوری۔ نسیم کا روزگار چونکہ بھرتپور میں تھا اس لیے نام کے ساتھ جب کبھی ان کے وطن کی وضاحت مقصود ہوتی تو 'پہرسری' بھی لکھ دیا جاتا......اس صراحت سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ نسیم پہرسری اور نسیم بھرتپوری دو الگ الگ شخصیتوں کے نام نہیں بلکہ دونوں ایک ہیں اور یہ کہ ان کا اصل نام سیّد شبیر حسین جعفری تھا۔

سید ابرار حسین متخلص بہ تپاںؔ تلمیذِ نسیم کا ذکر اوپر کی سطروں میں گزر چکا ہے۔ نسیم کے انتقال کے بعد جب تپاں نے اپنے استاد کا دیوان مرتب اور شائع کیا تو اختصار کے ساتھ انھوں نے نسیم کے حالات زندگی بھی تحریر کیے تھے۔ چونکہ نسیم کا دیوان اب نایاب ہو چکا ہے، اس لیے تپاں کے دیباچے کی بھی عموماً اہلِ علم حضرات کو اطلاع نہیں۔ حالانکہ یہ دیباچہ بعض اعتبار سے بہت اہم ہے۔ تپاں کے اس دیباچے میں نسیم کی شاعری یا ان کے شاعرانہ کمالات سے زیادہ ان واقعات کا بیان ہے جن میں سے بیشتر کے راوی بہ گمان غالب خود نسیم ہوں گے۔ چونکہ ان واقعات سے نسیم کی شاعرانہ شخصیت کا گہرا تعلق ہے، اس لیے ذیل میں ''ریاضِ نسیم'' سے اس کے ضروری اور اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں:

''نام سید شبیر حسین تخلص نسیم، جعفری سیّد، میر التماس حسین صاحب مرحوم کے اکلوتے صاحبزادے۔ قصبہ پہرسر کہ ریاست بھرتپور میں ایک مردم خیز سادات کی بستی ہے، آپ کا جنم بھوم اور آپ کے آباد اجداد کی جاگیر ہے۔ آپ کی ولادت 1278ھ (60-1859) میں ہوئی۔ تاریخی نام 'نظیر حسن' قرار پایا۔ عربی و فارسی کی تعلیم سیّد محمد صاحب مرحوم سونی پتی سے پائی۔ مولوی صاحب حکیم مومن خاں صاحب مومن اور امام بخش صہبائی کے مشہور شاگردوں میں تھے۔'' (14)

''......حضرت نسیم کو عروسِ سخن کی دلفریبیوں نے ابتدائے عمر میں ہی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ جو کچھ مشقِ سخن کرتے تھے اپنے شفیق استاد کو دکھا لیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب مشقِ سخن کو ہر چند کہ ترک کر چکے تھے لیکن ہونہار شاگرد کی طبع موزوں میں حدت اور روانی دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ آپ نے فیاضِ ازل کی سرکار سے حافظہ قوی اور ذہن رسا اور فنِ شعر سے قدرتی لگاؤ پایا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں عربی و فارسی عروض و طب سے بہرۂ تمام حاصل کر لیا۔ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ 1876 میں سن رسیدہ استاد کی ایما سے نواب مرزا داغ دہلوی کو اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجی

اور ہمیشہ انھی کی شاگردی کو مایۂ ناز و افتخار سمجھا۔ فن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں میر خورشید علی صاحب نفیس مغفور کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ آپ 9 محرم 1327ھ کو امراض جگر میں مبتلا ہوئے اور 7 ربیع الاوّل 1327ھ کو بمقام بھرت پور رحلت فرمائی۔" (15)

ان سوانحی اشاروں کے بعد تپاں نے داغ اور نسیم کی پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں کہ فصیح الملک داغ دہلوی رامپور میں ملازم تھے، نسیم کی غزلوں میں زبان کی صفائی اور غیر معمولی جدت دیکھ کر حضرت داغ کو اپنے نادیدہ شاگرد کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور طلب کیا۔ ان کو بھی اپنے باکمال استاد کی زیارت کی آرزو بے چین کر رہی تھی۔ فوراً رامپور حاضر ہوئے۔ حسن اتفاق سے رامپور میں اس وقت ایک عجیب و غریب کاملین کی صحبت تھی۔ وہاں قاعدہ تھا کہ ہفتے میں دو ایک مرتبہ کسی خاص مقام پر تمام باکمال جمع ہوتے تھے۔ مصرعہ طرح کیا جاتا، وہیں بیٹھے ہی سب طبع آزمائی کرتے تھے اور داد لیتے تھے۔ حضرت داغ اپنے اس ہونہار شاگرد کو اس صحبت میں لے گئے۔ کاملین فن سے ملایا، جودت طبع اور حسن فکر کی تعریف کی۔ خواجہ اسد قلق ان کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ سید صاحب کچھ ہمیں بھی سنائیے۔ نوجوان شاعر کا دل بڑھا، فوراً تعمیل ارشاد کی۔ شباب کا عالم، چلبلی طبیعت، مشق سخن ترقی پر، سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق۔ چنانچہ اس زمانے میں ایک غزل کہی تھی جس کا قافیہ منقار اور ردیف چنگی میں تھی، سنائی۔ دو تین شعر غزل میں اس پایے کے تھے کہ حاضرین نے خیال کیا کہ حضرت داغ نے ضرور نوجوان شاگرد کی حوصلہ افزائی کے لیے خود غزل کہہ دی ہے اور خواجہ اسد قلق تو اپنے اس خیال کو دبا ہی نہ سکے۔ بول اٹھے کہ میاں صاحبزادے غزل تم ہی نے کہی ہے، کیا تم دو چار شعر اس زمین میں اور بھی کہہ سکتے ہو؟ ان کو اتنا سننے کی کہاں تاب۔ اول تو نوجوانی کا عالم، اس پر جوشیلی طبیعت، سر تسلیم خم کر کے جواب دیا کہ حاضر ہوں۔ دوات قلم لے کر ایک طرف ہو بیٹھے۔ بات کی بات میں سترہ (17) شعر کی غزل کہہ ڈالی جس کا مطلع یہ ہے:

دکھائے معجزے گروہ بت عیار چنگی میں   تو بولے طائرِ رنگِ حنا ہر بار چنگی میں

حاضرین جلسہ غزل سن کر وجد کرنے لگے۔ تحسین و آفریں کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں، ارباب ذوق مزے لینے لگے.... خواجہ قلق نے بے اختیار تعریف کی، ہونہار نوجوان کے سر پر دست شفقت پھیرا، امیر مینائی نے اٹھ کر گلے لگا لیا، فصیح الملک نے فخر سے پیشانی چومی، منشی منیر اور دیگر

کاملین نے ترقی علم وکمال اور خیر و برکت کی دعائیں دیں۔ بزرگوں کی دعائیں اور استاد کی شفقتیں کہیں رائگاں جاتی ہیں۔ دو تین سال ہی میں اصناف سخن پر ایک خاص قدرت حاصل کر لی۔" (17)

نسیم اور داغ کی دوسری ملاقات کا ذکر تپاں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"1889 میں جناب داغ کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ فصیح الملک مرحوم ان کو اپنا کلام سناتے تھے اور داد لیتے تھے، ان سے سنتے تھے اور فخر کرتے تھے۔ اس موقع پر حقیر کاتب الحروف (تپاں) بھی حاضر خدمت تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ حافظ محمد یوسف تشنہ بلند شہری نے کہا کہ ہم لوگوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہم کو ایسا استاد عطا کیا ہے کہ جس کا عدیل و نظیر نہیں ہے۔ حضرت نسیم نے کہا کہ بیشک۔ داغ مرحوم بولے کہ جس طرح تم کو یہ فخر ہے کہ ہمارا استاد داغ ہے، اسی طرح مجھے بھی ناز ہے کہ میرا شاگرد نسیم ہے۔ ایک دن فصیح الملک کے دولت خانے پر بہت سے شاگرد جمع تھے۔ اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ہائے کیا صحبت تھی۔ ایک شاگرد کے منہ سے نکلا کہ امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض گورکھپوری کا جواب نہیں ہے۔ داغ نے مسکرا کر نسیم کی طرف دیکھا اور کہا کہ میرا ریاض نسیم ہے"۔ (18)

اس کے بعد کے واقعات کا تعلق بھی نسیم کی شعری و ادبی شخصیت سے ہے جن کا خلاصہ یہ ہے:

(1) داغ کو نسیم کی شاعرانہ صلاحیتوں پر اعتماد تھا، چنانچہ 1881 سے 1903 تک فصیح الملک داغ کلام پر جس قدر اعتراضات ہوئے، ان میں سے بیشتر کے جواب نسیم نے دہلی پنچ، لاہور میں شائع کیے۔ نسیم کا رسالہ "تازیانہ" اسی سلسلے کی ایک یادگار ہے۔

(2) داغ کے دیوان سوم "مہتاب داغ" کی ترتیب میں نسیم بھی شامل تھے جنھیں داغ نے خط لکھ کر حیدر آباد بلایا تھا۔

(3) نسیم کے ایک مضمون بعنوان "توبۃ النسیم" مطبوعہ "نیر اعظم" مراد آباد سے مترشح ہوتا تھا کہ نسیم نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اس مضمون سے مطلع ہو کر داغ نے انھیں لکھا کہ "کیوں صاحب یہ توبہ کیسی! ہم کو تو امید تھی کہ ہمارا نام روشن کرو گے۔"

(4) منشی رکن الدین متخلص بہ جادو ریاست بھرتپور میں نائب میر منشی تھے، اکثر داغ کے پاس حیدر آباد میں اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجتے۔ داغ نے انھیں لکھا کہ آپ کے پاس نسیم موجود

ہیں، زبان کے معاملات میں ان سے ہی مشورہ کرلیا کیجیے، تپاں کا اس سلسلے میں یہ بھی کہنا ہے کہ ''آخری زمانے میں جو غزلیں داغ مرحوم کے پاس اصلاح کے لیے آیا کرتی تھیں انھیں نسیم کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہ استاد کی جانب سے حک و اصلاح کیا کرتے تھے۔''

(5) تپاں نے حیدر آباد کے ایک مشاعرے کا بھی ذکر کیا ہے، جس کی طرح تھی:

یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

تپاں کے بقول ''اس طرح پر زمانے بھر نے غزلیں کہیں، جناب امیر مینائی نے اپنی اور اپنے شاگرد جلیل کی غزل حضرت داغ کی تفریح کے لیے بھیجی۔ یہاں سے داغ مرحوم نے اپنی غزل روانہ کر دی اور نسیم کی غزل بھی اس فقرے کے ساتھ بھیجی کہ دیکھیے غزل یوں کہا کرتے ہیں۔''(19)

(6) داغ کے انتقال کے بعد جب ان کی جانشینی کا مسئلہ درپیش آیا تو تپاں کے لفظوں میں ''احسن و وجاہت اور افسوں وغیرہ شاگردانِ داغ نے نسیم کو جانشینی کے لیے مجبور کیا، مگر نسیم کے اس جواب کے بعد کہ شاعری کوئی خانقاہ یا درگاہ نہیں کہ جس کا سجادہ نشیں مقرر کیا جائے، احباب خاموش ہو گئے۔''(20)

(7) تپاں نے نسیم کے انتقال کی تاریخ 7 ربیع الاول 1327ھ (مطابق 1909) تحریر کی ہے اور لکھا ہے کہ تقریباً دو مہینے کی علالت کے بعد ان کا انتقال بھرت پور میں ہی ہوا تھا لیکن تدفین اسی دن نسیم کے آبائی وطن پہرسر میں ہوئی۔ یوں،

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

●

نسیم نے اپنے بزرگ سید محمد سونی پتی کے مشورے پر 1876 میں داغ کی شاگردی اختیار کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نسیم اور داغ کے درمیان استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ وفاتِ داغ (1905) تک قائم رہا، جس کی مدت تخمیناً 29 برس ہوتی ہے۔ اس طویل عرصے میں نسیم رامپور، دہلی اور حیدر آباد بھی گئے، اور استاد کی خدمت سے فیض یاب ہوتے رہے، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ''زبانِ داغ'' اور ''انشائے داغ'' کے خطوں میں نسیم کے نام داغ کا ایک خط بھی نہیں جب کہ دیگر مکتوب الیہم کے نام داغ کے خطوں میں نسیم کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً 27 اکتوبر 1902 کے ایک خط

بنام احسن مارہروی میں داغ لکھتے ہیں:

'' آپ کے خط کا جواب پورا میں نے نسیم کے پاس بھجوا دیا، وہ آپ کے پاس پہنچ گیا تھا یا نہیں......''(21) رفیق مارہروی نے جنھوں نے ''زبانِ داغ'' کو مرتب اور شائع کیا، نسیم کا تعارف ایک حاشیے میں تحریر کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں: ''نسیم تخلص اور نام سید شبیر حسن تھا۔ ریاست بھرت پور کے رہنے والے تھے اور ریاست بھرت پور ہی میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ داغ کے دورِ دوم کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے، بڑے صاحب دل اور صاحب طرز شاعر تھے۔ ایک مختصر سا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے، عین جوانی میں انتقال کیا۔''(22)

نسیم کے اس تعارف میں رفیق مارہروی نے انھیں داغ کے ''دورِ دوم'' کے شاگردوں میں شمار کیا ہے، اس سے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ نسیم نے داغ شاگردی اس وقت اختیار کی جب داغ اپنی قسمت آزمائی کے لیے 1891 میں دوسری بار حیدر آباد پہنچے، تو یہ صحیح نہیں اور اسے رفیق مارہروی کی صورتِ حال سے عدم واقفیت پر محمول کیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کے حیدر آباد جانے سے تقریباً 15 برس پہلے ہی نسیم رام پور میں ایک شاگرد کی حیثیت سے داغ کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اور جیسا کہ تپاں نے اشارتاً لکھا ہے، خط و کتابت کے ذریعے اصلاحِ کلام کا سلسلہ تو اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ رام پور کے اس سفر کی جو روداد تپاں نے تحریر کی ہے، اس سے اس بات کا مزید ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ نسیم کے مزاج اور ان کی شعری صلاحیتوں سے داغ بخوبی واقف ہو چکے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو تپاں کی صراحت کے مطابق خواجہ قلق اور امیر مینائی کی محفل میں داغ ایک نومشق شاعر کو فخریہ پیش نہ کرتے۔

رفیق مارہروی کے محولہ بالا اقتباس میں نسیم کے دیوان کا بھی ذکر آیا ہے، اس دیوان کی اشاعت ''ریاضِ نسیم'' کے نام سے مطبع ابو العلائی، آگرہ سے اس وقت عمل میں آئی جب نسیم کے انتقال کو کم از کم ڈیڑھ برس گزر چکا تھا۔ ''ریاضِ نسیم'' ڈیمائی سائز کے 232 صفحات پر مشتمل ہے اور فی الوقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس کے سرورق پر سنِ اشاعت درج نہیں، لیکن دیوان میں موجود سید ابو الحسن متخلص بہ شمیم بھرت پوری کے قطعۂ تاریخ سے اس کے سنِ اشاعت 1328ھ/ 11-1910 کا قطعی تعین ہو جاتا ہے۔

شبیر حسین صاحب نازک خیال نے دیواں لکھا ہے اپنا بہ آئین نادرہ
ہم نے جو سال طبع میں کی فکر اے شمیم تاریخ ہے اصول مضامین نادرہ
(1328ھ)

دیوان کے آخر میں تپاں کی ایک مختصر تحریر بعنوان ''خاتمہ'' بھی درج ہے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ تپاں نے نسیم کی ایما سے ترتیب دیوان کا کام ان کے انتقال سے ذرا قبل شروع کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

''خاتمے پر جس بات کا ذکر ضروری ہے وہ ریاض نسیم کی ترتیب ہے۔ آغاز 27ھ میں حضرت مصنف کے ارشاد کے موافق خاکسار نے دیوان کا ترتیب دینا شروع کیا، افسوس کہ ابھی دیوان کی ترتیب ناتمام ہی تھی کہ حضرت مصنف فردوس کی سیر کے عازم ہو گئے۔''(23)

اسی سلسلے میں تپاں مزید لکھتے ہیں:

''... مجھ سے جس طرح ہو سکا بڑی دقتوں کے بعد کلام کو میں نے جمع کیا۔ بہت زیادہ افسوس کے قابل دو باتیں ہیں۔ اول یہ کہ تمام و کمال دیوان نظر ثانی سے محروم رہ گیا۔ دوم یہ کہ بے انتہا تلاش اور تجسس کے بعد بھی قصائد کا پتہ نہ چلا۔ ہائے میرے استاد کے قصائد اب مجھے کہاں ملیں گے...... غزلیں بھی بہ دقت مختلف مقامات سے دستیاب ہوئی ہیں جو نذر ناظرین کی جاتی ہیں۔''(24)

''ریاض نسیم'' میں بہ صورت موجودہ جو کلام شامل ہے، وہ صرف ایک ''قطعۂ فارسی در توصیف ای اے فریزر'' سے قطع نظر تمام و کمال غزلیات پر مشتمل ہے، جن کی مجموعی تعداد 254 ہے۔ غزلیں عموماً چھوٹی بحروں میں ہیں اور ہر غزل میں اوسطاً نو (9) شعر ہیں۔ تین غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں 27، 29 اور 31 اشعار ہیں۔ نظر ثانی ٹھیک سے نہ ہونے کے سبب ایک غزل دو مختلف جگہوں پر درج ہو گئی ہے۔ دیوان میں مراثی اور قصائد شامل نہیں۔ ان اصناف کے ''ریاض نسیم'' میں شامل نہ ہونے کا افسوس تپاں کو بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نسیم کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے استاد کے دیوان کو شائع کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر وہ نسیم کے دوسرے شاگردوں یا احباب سے رجوع کرتے تو اس کا امکان تھا کہ نسیم کے قصائد اور مراثی تک بھی ان کی رسائی ہو جاتی۔ مجھے نسیم کے قصائد کا تو علم نہیں، لیکن ان کے آٹھ مطبوعہ مرثیوں کی خبر ضرور ہے۔(25) ان مراثی کی تفصیلات سے قبل اس

بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ''ریاضِ نسیم'' میں دو مخمسات کے علاوہ تاریخی قطعات بھی ہیں، جن کی تعداد گیارہ ہے۔ نسیم کے جن آٹھ مرثیوں کا ذکر ابھی کیا گیا، ان کے مطلعے درج ذیل ہیں:

بہارِ باغِ ارم ہے گلِ سخن میرا	(درحال حضرت عباس)
طرۂ تاجِ فصاحت ہے طبیعت میری	(درحال حضرت عباس)
اے تیغِ نظم آج تو کس بل دکھا مجھے	(درحال حضرت علی اکبر)
میں ہوں زینت دہِ ایوانِ طلاکارِ سخن	(درحال حضرت علی اکبر)
گلگونۂ رخسارِ سخن مدحِ نبی ہے	(درحال حضرت علی اکبر)
میں شانہ کشِ گیسوئے لیلائے سخن ہوں	(درحال عون و محمد)
جب بے چراغ مرقدِ خیرالوریٰ ہوا	(درحال پائمال لاشہ ہائے شہدائے کربلا)
عروسِ نظم دل افروز ہے کلام امرا	(درحال حضرت قاسم)

نسیم کی غزلیات کے مقطعوں میں بھی شہدائے کربلا سے ان کی جذباتی وابستگی موجود ہے:

نسیم اس شاہ کا شیدا ہوں دل سے	جو ہے زہرا و احمد کا جگر بند
دل سے یہی دعا ہے مری ہر گھڑی نسیم	یارب ہو میرا حشر شہِ کربلا کے ساتھ
کرو نہ ترک کبھی مدحِ خاندانِ نبی	نسیم دم میں ہے جب تک کہ دم زباں منہ میں
دہشتِ روزِ قیامت ہے عبث تم کو نسیم	ہیں شفاعت کو پیمبر کے گھرانے والے

نسیم اور داغ کی وفات میں تقریباً پانچ برس کا وقفہ ہے۔ اس مختصر عرصے میں داغ کے بعض تلامذہ نے زبان و بیان نیز فنِ شاعری پر نسیم کی قدرت کا اندازہ کر کے ان سے رجوع کیا اور باقاعدہ ان کی شاگردی اختیار کی...... ایسے شعرا میں سیّد حمید الحسن متخلص بہ قتیل پہرسری اور سیّد مصطفیٰ حسین رضوی متخلص بہ بدر پہرسری (26) کا نام سرفہرست ہے۔ ان میں قتیل کتنے پُر گو تھے اس کا اندازہ درج ذیل مقطعے سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے:

ہو چکے ترتیب چھ دیواں قتیل	کیا لکھو گے ساتویں دیوان میں

قتیل کا انتقال جے پور میں 1927 میں ہوا تھا۔

ان کے علاوہ ''مراثی فیض'' (حصہ دوم)، ''جدید اردو مرثیہ پاکستان میں'' (مرتبہ سیّد ضمیر اختر)

اور ''راجستھان میں اردو مرثیہ'' (مرتبہ سیّد یاد علی جعفری) میں نسیم کے مزید دو شاگردوں کے نام ملتے ہیں۔ سیّد اکرام حسین کلیم پہرسری (وفات 1955 کراچی) اور سیّد موسیٰ رضا رضوی شاد بھرتپوری (وفات، کراچی)۔ نسیم کے ایک اور شاگرد سید عبداللہ متخلص بہ شوخ کا ذکر پیام یار مطبوعہ جون 1902 کے صفحہ تین پر ملتا ہے۔ راقم الحروف کو ان کے علاوہ دوسرے کسی شاگرد نسیم کا علم نہیں۔ سیّد یاد علی جعفری (27) نے نسیم کی پہلی برسی کے موقعے پر پہرسر میں منعقدہ ایک مجلس کا ذکر کیا ہے۔ اس مجلس میں جن ذاکروں اور مرثیہ نگاروں نے شرکت کی ان میں سید وزیر حسن رضوی متخلص بہ فضل پہرسری شاگرد میر انس لکھنوی اور قتیل پہرسری بھی شامل تھے۔ ایصال ثواب کی اس مجلس میں قتیل نے حضرت حُر کے حال میں جو مرثیہ پڑھا، اس کے ابتدائی بندوں میں نسیم کی رحلت پر بھی رنج و غم کا اظہار تھا۔ ذیل میں اس مرثیے کے پانچ بند ملاحظہ کیجیے:

پھول پھل رنگ پہ ہیں، جوش پہ ہیں نخلِ چمن — آتی جاتی ہے اداؤں سے نسیمِ گلشن
پر ہے اس نام سے جو دل پہ مرے رنج و محن — دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من
گھر ہو شادی کا بھلا خاک دلِ شیدا میں
افصح الہند نسیم آج نہیں دنیا میں

ماضیہ سال میں جو زیب تھا اس ممبر کی — عمر بھر جس نے ثنا کی پسرِ حیدر کی
واسطے جس کے زبانوں پہ یہ تھا اکثر کی — اس نے پائی ہے زباں دھوئی ہوئی کوثر کی
مدحتِ آل میں مصروف ثنا خوانی تھا
اس میں کچھ شک نہیں بے مثل تھا لا ثانی تھا

اہلِ محفل کریں اس وقت ذرا دل میں خیال — ایسا اکمل جو اٹھے، عام ہو کیوں کر نہ ملال
ایسی کاہش ہو تو کیوں بدر نہ گھٹ کر ہو ہلال — کس طرح ہو نہ تپاں صورتِ بسمل بے حال
رنج و آفت میں نہ کیوں یہ دل مجبور پڑے
دل میں نکہت کے نہ کس طرح سے ناسور پڑے

چمنِ دہر میں ماتم کے یہ ظاہر ہیں نشاں — فرطِ آلام سے خاموش ہے سوسن کی زباں
دل میں لالہ کے پڑا داغ یہ سب پر ہے عیاں — روتے روتے ہوئیں نرگس کی بھی آنکھیں حیراں

یاد میں بلبل خوش لہجہ بکا کرتی ہے
اور نسیم آپ دم سرد بھرا کرتی ہے

عمر بھر روئیں گے مرحوم کو بانالہ و آہ پر بجز صبر کے چارہ نہیں کوئی واللہ
سب تو آمین کہیں میں کہوں غفر اللہ ختم تاریخ پہ ہو اس کی وفات جانکاہ

یاں پڑھے اور وہاں ان کو بشارت پہنچے 1327ھ
جسم سے روح نکل کر سوِ جنت پہنچے

●

نسیم کا دستیاب کلام زیادہ تر غزل اور چند مرثیوں پر مشتمل ہے۔قصیدہ یا دیگر اصناف مثلاً قطعہ یا رباعی کو بھی اگر انھوں نے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تو فی الوقت وہ ہماری دسترس میں نہیں۔یوں بھی نسیم کو جس صنف سخن کے سبب شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ قصیدہ یا مرثیہ نہیں، غزل ہے، اور غزل بھی وہ جو امیر و داغ کے حلقۂ اثر میں رہ کر عوام و خواص کے لیے بہار زیست کا سامان بنی۔نسیم غزل کی اس روایت کے ترجمان تھے جو 19 ویں صدی کے نصف آخر میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی اور جس سے شغف کا سلسلہ 20 ویں صدی میں بھی دیر تک جاری رہا۔

نسیم، داغ کے شاگرد تھے مگر وہ امیر مینائی کے بھی معترف اور مدّاح تھے۔ان کی نظر میں اگر داغ ''زیب اورنگِ فصاحت'' اور ''سلطانِ نظم'' تھے تو امیر مینائی ''نیر چرخِ فصاحت''، یوں بیک وقت دو اساتذۂ فن کے ساتھ ذہنی قربت نے نسیم کی شاعرانہ شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔انھوں نے شاعری کی ابتدا بیشک سید محمد سونی پتی کی معیت میں کی جو مومن اور صہبائی کے ارشد تلامذہ میں تھے مگر فنِ شاعری کے جملہ رموز و نکات کا درس انھوں نے داغ سے لیا تھا، جن کا اپنا مخصوص شعری مزاج تھا۔ وہ حسن پسند ہی نہیں حسن پرست تھے اور خود اپنے قول کی روشنی میں ''حسینوں کو دیکھ کر خوبصورت شعر کہنے کی تمنا'' ان کے دل میں کروٹیں لینے لگتی تھی۔بیخود دہلوی اس پر مزید تبصرہ کرتے ہیں کہ ''استاد کو آہو چشموں سے کچھ اس بلا کا عشق تھا کہ ان کی مفارقت سے وحشت ہوتی تھی اور ان کی موانست سے طبع چابک دست چوکڑیاں بھرنے لگتی'' (28) مگر ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ داغ کے کلامِ رنگیں اور اس کی رندانہ وضع نے نوجوان نسیم کے شعری کردار کو کس حد تک متاثر کیا۔

"ریاض نسیم" میں داغ کا تصرف اور ان کا اثر جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ متعدد غزلیں داغ کی معروف و مشہور زمینوں میں ہیں۔ پہلے یہ دیکھیں کہ کلام داغ کے تئیں نسیم کا فکری ردعمل کیا ہے۔

"مہتاب داغ" کی طباعت کے موقعے پر کہے گئے ایک قطعے کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

اور ہے ایسا کوئی جادو بیان — اور ہے ایسا کوئی نازک خیال
یہ ہے اردوئے معلیٰ دیکھیے — دیکھیے کہتے ہیں اس کو بول چال
عقل حیراں ہے کہ اس کو کیا کہوں — معجزہ ہے یہ کہ ہے سحر حلال
دیکھ کر ہر شعر کی بانکی ادا — کٹ رہے ہیں دل میں کیا کیا خوش جمال
یہ مضامیں یہ ادا بندی کی شان — یہ تری بندش یہ پاکیزہ خیال
ہاں یہی میوہ غذائے روح ہے — گلشن تفریح کا یہ ہے نہال
ہے اسی سے گرمیٔ بازارِ عشق — ہے اسی سے رونقِ حسن و جمال

ان ستائشی اشعار میں داغ کے شعری موضوعات سے زیادہ ان کی زبان اور بیان کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ گویا نسیم کا مطمح نظر یہ ہے کہ موضوعاتِ شعر خواہ کچھ بھی ہوں اگر ان کی پیش کش میں جدت اور طرفگی نہیں تو شعر معجزہ بنے گا اور نہ ہی سحرِ حلال۔ یہ معنی پر لفظ کی فوقیت کا وہ نظریہ ہے جسے نسیم نے اپنی شاعری کے ارتقائی سفر میں ہمیشہ مدِ نظر رکھا اور چونکہ داغ کی برتری اور ان کی کامیابی کا راز نسیم کی فہم کے مطابق اسی نکتے میں پوشیدہ تھا، اس لیے استاد کی روش پر چلنا انھوں نے اپنے لیے باعث فخر سمجھا اور اس کا کھلے بندوں اظہار بھی کیا:

آ گیا اور ہی کچھ رنگ طبیعت میں نسیم — ہاتھ جب داغ سخن سنج سا استاد آیا
دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر — شاگرد ہے داغ دہلوی کا
نسیم سر پہ سلامت ہے داغ سا استاد — پھلوگے گلشنِ ہستی میں بوستاں ہو کر
اے نسیم اب سوائے داغ کوئی — خلق میں صاحب ہنر ہی نہیں
نسیم استاد کا صدقہ ہے سارا — تری شہروں میں شہرت ہو گئی ہے

درج ذیل مقطع بھی خاص اہمیت کا حامل ہے:

شاعری محس ہو یا سعد ہو کچھ بھی ہو نسیم
شغل اچھا ہے طبیعت کے بہلنے کے لیے

اس مقطعے سے نسیم کے شعری کردار کی تفہیم بہت آسان ہو جاتی ہے۔ جب نسیم یہ کہتے ہیں کہ داغ سا صاحب ہنر خلق میں کوئی دوسرا نہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ داغ اور ان کی شاعری نسیم کے لیے ایک ایسا آئیڈیل ہے جس کی تقلید از بس ضروری ہے۔ داغ کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے صفائی زبان کے ساتھ عشقیہ جذبات کے برملا اظہار پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس طرح انھوں نے جو کچھ اور جس انداز میں کہا اسے پڑھ کر اقبال کا یہ خیال سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے:

تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے

نسیم کی شاعری بھی مستثنیات سے قطع نظر، داغ کی طرح معاملات حسن و عشق کی شاعری ہے اور اس میں بھی وہ تمام لوازات موجود ہیں جو نہ صرف داغ بلکہ ان کے عہد کے دوسرے شعرا کو عزیز تھے۔

سن کے میرے شعر وہ بولے نسیم — آدمی خوش فکر، خوش گفتار ہے

خوش فکری یا خوش خیالی اصلاً 'خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است' کے مترادف ہے، جب کہ خوش گفتاری کا تعلق نسیم کے شعری لہجے اور انداز بیان سے ہے۔ ایک سے زندگی اور ادب کے تئیں نسیم کے فکری میلان کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے سے ان کے فن کی انفرادیت کا۔ نسیم دونوں پر نازاں ہیں۔ ذیل میں نسیم کی خوش فکری اور خوش گفتاری کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

تڑپ جائے جسے دل دیکھ کر معشوق ایسا ہو — ستم ایجاد ہو، بد خو ہو، پر صورت کا اچھا ہو
معشوق حور وش ہو کوئی یا پری جمال — کچھ بھی نہیں مزاج میں گر شوخیاں نہیں
تہ و بالا کیا ہے تو نے عالم — قیامت کی جوانی پھٹ پڑی ہے
جوش پر آ کے یہ نہیں رکتا — دل مرا آپ کی جوانی ہے
رات دن چھٹتا نہیں اس ماہوش کے ہات سے — اوج پر ہے آج کل تقدیر پشتِ آئینہ
دیکھی آئینے میں صورت جو ذرا بن ٹھن کر — میں تو کیا ٹوٹ کے خود ان کی طبیعت آئی
یہ حظ نہ ہو یہ لطف نہ ہو یہ مزا نہ ہو — کچھ بھی نہ ہو جو عشق بتِ مہ لقا نہ ہو

حسرت نہ ہو امید نہ ہو آرزو نہ ہو — کچھ بھی نہ ہو جو اے دل بیتاب تو نہ ہو
فریاد، نالہ، آہ، فغاں، درد، غم، قلق — یہ سب لگے پڑے ہیں دل مبتلا کے ساتھ
ہمارے دل کے ہاتھوں بادشاہت عشق کرتا ہے — یہ دولت اس کی مٹھی میں ہے یہ سرکار چٹکی میں
پردہ ہے خود تجلی عارض شباب میں — ناحق چھپاتے ہو رخ روشن نقاب میں
ہوگیا زندہ جو میں سن کے صدا پازیب کی — کیا ہی جھلائے وہ اپنی شوخی رفتار پر
اودغا باز سکت کچھ ترے پیاں میں نہیں — کہ نہیں میں تری ہاں ہے تو تری ہاں میں نہیں
سودائے زلف لاکھ چھپایا نہ چھپ سکا — دنیا کے لوگ تاڑنے والے بلا کے ہیں
وصل دشمن کی خبر ہم کو بھلا کیا معلوم — کھوئے جانے سے مگر آپ کے پا جاتے ہیں
جو میں نے کہہ دیا نکلی نہیں کچھ وصل میں حسرت — تو آنکھیں ڈال کر آنکھوں میں وہ بولے نہیں نکلی

''ریاض نسیم'' کے شاعر کا بنیادی رنگ و آہنگ یہی ہے۔ اسے معاملات حسن و عشق کو لفظی رعایتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں پیش کرنے کا ہنر معلوم ہے۔ حشو و زوائد سے حتی الامکان بچنے کے علاوہ زبان کے استعمال میں وہ بے حد محتاط ہے۔ چنانچہ جو مثالیں پیش کی گئیں ان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس میں غزل کی روایت کے برخلاف کسی مشکل یا ادق لفظ کا استعمال کیا گیا ہو۔ آسان، عام فہم اور سلیس الفاظ کا استعمال نسیم کے شعری مزاج کا خاصہ ہے۔ زبان و اسلوب کا یہی انداز عہد نسیم کی شعری روایت میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، اور نسیم نے اس انداز پر مکمل عبور حاصل کر لیا تھا۔ ان کی شاعری کا دائرہ زیادہ وسیع نہ سہی مگر اس میں مخصوص طبائع کی دلچسپی کے سارے سامان موجود ہیں۔

نسیم کی شاعرانہ شخصیت کے ایک اور پہلو کی جانب اشارہ بے محل نہ ہوگا جو اس روش سے قدرے مختلف ہے جس کا ذکر ہم نے کیا۔ اس پہلو کی جاذبیت کا راز نسیم کے مندرجۂ ذیل اشعار کی ظاہری سطح میں نہیں بلکہ ان کے باطن میں پوشیدہ ہے۔ ''ریاض نسیم'' میں اس قسم کے اشعار قابل لحاظ تعداد میں اور تقریباً ہر غزل میں موجود ہیں:

چراغ شام غریبی تھا میں زمانے میں — کسی نے آکے نہ ٹھنڈا کیا، جلا کے مجھے
دامن مژگاں ذرا بھی آنسوؤں سے نم نہیں — دیکھنا کس قہر کی حدت مری آنکھوں میں ہے
شب غم ضبط سے عاشق تمھارا کام لیتا تھا — دباتا تھا کبھی پہلو کبھی دل تھام لیتا تھا

ہے اگر یہ زندگی رنج و مصیبت کے لیے
اور دے اک عمر یارب عیش و عشرت کے لیے

کیا حال بنایا ہے تم نے یہ نسیم اپنا
کس واسطے بیخود ہو یہ بیخبری کیوں ہے

یا خدا دل سے داغ دل نہ مٹے
میرے اک دوست کی نشانی ہے

کیا ڈھونڈتی ہیں سینے میں دزدیدہ نگاہیں
جز داغ دل اب کچھ مرے پہلو میں نہیں ہے

آنکھیں ملی ہیں ہم نے ہر اک جا زمین پر
جس جس جگہ نشان ترے نقش پا کے ہیں

کافور ہوئی تابش خورشید قیامت
کیوں زاہدو کام آیا ہے کیا دیدۂ تر آج

کلام نسیم کی یہ شعری فضا اپنے موضوع اور بیان کے لحاظ سے خاصی اثر انگیز ہے۔ یہ اثر انگیزی پہلے درج کیے گئے اشعار میں مفقود ہے۔ وہاں شادکامی اور حصول مسرت کا جذبہ ہے اور یہاں حرماں نصیبی کا احساس۔ یہ حرماں نصیبی خواہ حالات و حادثات کی پیدا کردہ ہو یا اس کا سبب عشق کی ناکامی ہو، دونوں صورتوں میں اس سے کلام نسیم کو ایک نئی جہت حاصل ہوئی ہے۔ ''ریاض نسیم'' کی طباعت اوّل 500 جلدوں پر مشتمل تھی۔ دوسری اشاعت کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ چنانچہ نسیم کا کلام اب بہ آسانی دستیاب نہیں۔ کلام نسیم کی کمیابی بلکہ نایابی کے اسی احساس نے مجھے ان کے انتخاب کلام پر مجبور کیا۔ یہ انتخاب نسیم کی شاعرانہ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔

●

انتخاب ریاض نسیم

جدھر دیکھا اودھر پایا نشاں تیری جلالت کا
ہر ایک شے میں نظر آتا ہے جلوہ تیری قدرت کا

بھروسا ایک مجھ کو ہی نہیں تیری شفاعت کا
بڑا تکیہ ہے تجھ پر سب گنہگاران امت کا

نہیں کچھ خوف مجھ کو حدت روز قیامت کا
بنے گا سایۂ طوبیٰ تصور تیرے قامت کا

تن اطہر ترا ہے وحدت اللہ کا شاہد
یہی تو وجہ ہے سایہ نہ تھا جو تیرے قامت کا

زہے صنعت بنایا پنجتن کو نور واحد سے
دکھایا لطف صانع نے عجب وحدت میں کثرت کا

خدا وندا سوئے ملک عدم آیا ہوں ہستی سے
فسانہ عالم امکاں میں سن کر تیری رحمت کا

چلا جاتا ہوں یارب گرمی روز قیامت سے
ادھر کو بھی کوئی چھینٹا سحاب جود و رحمت کا

نسیم اب نان جو کھا کر کرو شکر خدا ہر دم
کہ حیدر سے چلا آتا ہے یہ ترکہ قناعت کا

قیس و فرہاد کی ہستی کیا ہے — کوہ میرا ہے بیاباں میرا
اب تو وہ دن بھی دکھا دے یارب — ہاتھ ان کا ہو گریباں میرا

●

کہنے سے نہ غیر کے کرو ظلم — غم دو لیکن مری خوشی کا
یہ حسن یہ شوخیاں یہ کج دھج — ایسے سے مزا ہے دوستی کا
مٹ جائے گا سب نشان آخر — رہ جائے گا نام آدمی کا
سجدہ ہی کٹے بنی ملک کو — اللہ رے وقار آدمی کا
دلکش نہ ہوں کیوں نسیم کے شعر
شاگرد ہے داغ دہلوی کا

●

آتشِ عشق دل میں پھر بھڑکی — ہاں مری چشمِ تر خبر لینا

●

تو ستا مجھ کو میں دعائیں دوں — وہ ترا کام ہے یہ کام مرا
آہ دل سے نکل کے کہتی ہے — عرشِ اعظم پہ ہے مقام مرا
نیم جاں چھوڑ کر نہ جا قاتل — کام للّٰلہ کر تمام مرا

●

بہار آئی سمایا سر میں پھر سودا بیاباں کا — بندھا پھر تار چاک جیب و دامان تر گریباں کا
خدا رکھے تو پردہ موسم گل میں رہے میرا — بہت پیچھا لیا ہے دستِ وحشت نے گریباں کا
نقاہت سے ہوا ہے پیرہن تک جسم پر بھاری — نہیں کم طوقِ آہن سے مجھے حلقہ گریباں کا
نسیم اس رنگ سے نفرت ہے میری طبع رنگیں کو
نہیں، مشکل نہیں، لکھنا مضامینِ گریباں کا

●

ہماری فغاں کا اثر دیکھ لینا — وہ خود آ کے لیں گے خبر دیکھ لینا

دمِ صبح گھر جاتے جاتے غضب تھا
کسی کا وہ منہ پھیر کر دیکھ لینا

نسیم ان کو دیتے تو ہو دل تم اپنا
مگر پہلے نفع و ضرر دیکھ لینا

●

نہ یہ تلخی نہ یہ تیزی نہ یہ خوشبو واعظ
پھر بتا بادۂ کوثر میں مزا کیا ہوگا

شکوۂ جور حسینوں سے نسیم
ہو گیا تجھ کو مرے یار یہ کیا

●

اگر ان کے دل پہ قابو نہ دیا تھا مجھ کو تو نے
تو مرے ہی دل پہ یارب مجھے اختیار ہوتا

تمھیں غیر سے ہے نفرت یہ درست ہے، بجا ہے
دلِ مضطرب کو لیکن نہیں اعتبار ہوتا

●

عشق آخر وبال ہو ہی گیا
ہم کو جینا محال ہو ہی گیا

چال رفتار یار چل ہی گئی
دل مرا پائمال ہو ہی گیا

●

وہ دل سے نہ ہوتا جو کیا جذبۂ دل
گھبرا کے وہ گھر سے نہ سرِ شام نکلتا

●

محبت میں جو ہو گیا ہو گیا
بُرا ہو گیا یا بھلا ہو گیا

تڑپنے سے تسکین سی ہو گئی
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

●

یاس و ارمان و غم و رنج بھرے رہتے ہیں
کبھی خالی نہیں ہوتا ہے خزانہ دل کا

●

ہم تو سمجھے تھے کہ پابند شریعت ہے نسیم
وہ تو کم بخت نہ کافر نہ مسلماں نکلا

●

کیا بتاؤں کہ خدا جانے جوانی کیا تھی
جاگتے جاگتے اک خواب مگر دیکھ لیا

●

ناصح ہماری جان خدا کے لیے نہ کھا
اس فتنہ گر سے عشق جو ہم نے کیا کیا

•

تمھیں زندگی اپنی دشوار ہوگی
جو تم پر کوئی مرنے والا نہ ہوگا

•

تم خوش نہ ہو لے کر دلِ دیوانہ کسی کا
یہ تھا نہ کسی کا کبھی ہوگا نہ کسی کا

•

نہ پاس آیا مرے کوئی دشتِ وحشت میں
جو ساتھ آیا بھی سایہ تو دور دور آیا

•

معمور ہیں اک جلوے سے تیرے حرم و دیر
کچھ ہم کو تمیزِ حق و باطل نہیں ہوتا

•

ہوتی اگر وفا بھی طبیعت میں آپ کی
دنیا میں پھر جواب خدا کی قسم نہ تھا

•

اگر عدو سے سلام و پیام کرنا تھا
تو پہلے کام ہمارا تمام کرنا تھا

•

رہے گا آپ کا ہو کر، ہمیں کیونکر یقیں آئے
ہمارا ہو کے جب یہ دل ہمارا ہو نہیں سکتا

•

واعظ میں اب کہاں ہے جو وحشت تھی پیشتر
رندوں میں بیٹھ بیٹھ کے انسان ہو گیا
کرتے تو ہو شکایت بیداد اے نسیم
اچھا، اگر وہ شوخ پشیمان ہو گیا
آتے ہی بہر عیادت وہ عدو کے ہمراہ
مژدہ اے نزع کہ مرنا مجھے آساں ہوگا

•

خدا کی بھی نہیں سنتا وہ کافر
بھلا میں کیا مری آہِ رسا کیا
مجھے چپ دیکھ کر کہتا ہے ظالم
کسی پر ہو گئے ہو مبتلا کیا
جو دل سا دوست الفت میں دغا دے
شکایت غیر کی پھر کیا گلا کیا

ان بتوں کی ہے خدائی جب سے ہو گیا خانۂ اسلام خراب
اس کا آغاز بہت اچھا ہے اس محبت کا ہے انجام خراب

●

کیوں دیں ہم عدو سے کیا مطلب کچھ سبب، وجہ، مدعا، مطلب
ہائے کہنا کسی کا صبحِ وصال اب تو بر آیا آپ کا مطلب

●

بے وفا ہم ہیں، بے مروّت ہم با مروّت ہیں، باوفا ہیں آپ

●

جنس اچھی ہو تو گاہک لاکھوں دل سلامت ہے تو دلدار بہت
ہیں وہ ناراض تو رہنے دو نسیم اور دنیا میں طرحدار بہت

●

عرش پر جاتے ہیں محبوب خدا آج کی رات مرحبا آج کا دن، صلِ علیٰ آج کی رات
اللہ اللہ ملا قرب احد احمدؐ کو درمیاں میں کوئی پردہ نہ رہا آج کی رات
نور کے مشعل و قندیل ہیں گھر گھر روشن دشت ایمن کی ہے یثرب میں فضا آج کی رات
بام گردوں پہ ندا دیتے ہیں جبریل امیں مہرباں اہل زمیں پر ہے خدا آج کی رات
آج در رحمتِ خالق کے کشادہ ہیں نسیم
مانگنی ہو جو تجھے مانگ دعا آج کی رات

●

کر کے پیدا آسماں سے لاگ ڈانٹ مفت کر لی اک جہاں سے لاگ ڈانٹ
رہ کے دریا میں مگر سے دشمنی میکشو پیر مغاں سے لاگ ڈانٹ

●

میں سخت جاں نہ تھا ترا خنجر رکا عبث ہے امتحان میں یہ نرالی ادا عبث
ہنستا جو کل وہ آج شب غم میں ہو گیا اب رنج فکر و دہشت روز جزا عبث

دل آ گیا کہیں نہ کہیں آپ کا ضرور — میری طرح سے آپ بھی ہیں بےقرار آج

●

کافور ہوئی تابشِ خورشید قیامت — کیوں زاہدو کام آیا ہے کیا دیدۂ تر آج

●

دکھائیں زخم جگر ان کو کس بھروسے پر — وہ دردِ دل کو بھی سنتے ہیں داستاں کی طرح
نسیم دل ہی ٹھکانے نہیں کہیں کیا خاک — کہاں کے شعر کہاں کی غزل کہاں کی طرح

●

نسیم اس شاہ کا شیدا ہوں دل سے — جو ہے زہراؑ و احمدؐ کا جگر بند

●

سن کے میرا ذکر ابرو چڑھ گئے — کھل گئیں باچھیں عدو کے نام پر
اچھی کہی کہ غیر سے کیا واسطہ ہمیں — سنیے تو ذکر کیا ہے ہر اک کی زبان پر

●

کل تھی ملنے میں وہاں بات کچھ اور — آج ہے طرزِ ملاقات کچھ اور
لاکھ اعجاز نما ہوں عیسیٰ — ان لبوں میں ہے مگر بات کچھ اور
ختم کر پند و نصیحت ناصح — تجھ کو آتی نہیں کیا بات کچھ اور

●

دیکھے ہیں جب سے پھول سے رخسار آپ کے — کرتی ہے عندلیب گُلِ تر سے چھیڑ چھاڑ
بس بس نگاہِ ناز کو اب روکیے ذرا — بس بس نہ کیجیے دلِ مضطر سے چھیڑ چھاڑ

●

تم رکھو غیر کا سر زانو پر — اور گزرے نہ مجھے بارچہ خوش
اس بتِ شوخ پہ مائل ہے نسیم — اپنا منہ دیکھ مرے بارچہ خوش

●

یہ فرقت میں ہے زورِ ناتوانی — اجل ہو جائے مجھ کو دیکھ کر غش

شبیہِ زلف و رخ پیش نظر ہے — نہ آئیں کیوں مجھے شام و سحر غش

●

ہم تو جاتے ہیں ملک سوئے عدم — بیکسی اب ترا خدا حافظ

●

تیرے پرتو سے نہ ہمسر ہوں اگر ہو جائیں ایک — چاندنی خورشید محشر دھوپ سونے کا ورق

آفتاب حشر سے کیا ڈر، انھیں بخشائے گی — اہل دیں کو روز محشر دھوپ سونے کا ورق

اس زمیں میں امتحان طبع مشکل ہے نسیم — ہر جگہ ہو جائے کیوں کر دھوپ سونے کا ورق

●

فسانہ شب ہجر کا کچھ نہ پوچھو — یہ قصہ نہیں ہے سنانے کے قابل

●

رہا پہلو میں باقی آبلہ سا — لہو بن بن کے اشکوں میں بہا دل

یہ ڈالا تفرقہ الفت نے تیری — نہ میں دل کا نہ میرا آشنا دل

●

قسمیں نہ کھاؤ سچ ہے بجا ہے درست ہے — تم کو ہمارے حال کی مطلق خبر نہیں

●

ہجر میں کیوں کر کٹے گی زندگی — یہ تو کہتے جایئے ہم کیا کریں

●

لذت جور خدا کی قسم احساں میں نہیں — جو مزا تیری نہیں میں ہے تری ہاں میں نہیں

●

اس سلیقے کی جفا چرخ بھلا کیا جانے — ظلم سہہ سہہ کے تجھے لوگ دعا دیتے ہیں

●

آنکھیں ملی ہیں میں نے ہر اک جا زمین پر — جس جس جگہ نشان ترے نقش پا کے ہیں

●

اس کا جلوہ کہاں نہیں موجود　　کوئی دیکھے بھی کھول کر آنکھیں
کیا مزا ہو جو خط کے ساتھ نسیم　　میری لے جائے نامہ بر آنکھیں

●

سن بھی نہیں سکتے ہیں فرشتے اسے دم بھر　　مدت سے مصیبت جو بشر دیکھ رہے ہیں
سینہ میں وہ شور دل دیوانہ نہیں ہے　　کل رات سے سنسان یہ گھر دیکھ رہے ہیں

●

اس لگی کا کوئی علاج نہیں　　کل کسی طرح دل کو آج نہیں
پوچھتے ہیں وہ دل پہ رکھ کر ہاتھ　　سچ بتا اب تو اختلاج نہیں
جب کہا چاہتے ہو غیر کو تم　　بولے اس وہم کا علاج نہیں

●

دل کے لینے میں ہے ادا بھی شریک　　صرف چالاکی نظر ہی نہیں

●

تھا ابھی تو دل بیتاب مرے پہلو میں　　لے گیا آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا جانے کون
دلدہی کے لیے موجود تو ہیں درد و الم　　اور آئے دل بیتاب کو بہلانے کون

●

پردہ ہے خود تجلیِ عارض شباب میں　　ناحق چھپاتے ہو رخ روشن نقاب میں
لکھا تھا جو نصیب میں آیا وہ سامنے　　لکھتے وہ اور کیا مرے خط کے جواب میں
یاروں میں بوئے مہر و محبت نہیں نسیم　　کیا خاک اڑ رہی ہے جہانِ خراب میں

●

خموشیِ گل صد برگ کے ہیں ہم قایل　　کہ سو زبان پہ گویا نہیں زباں منہ میں
بھرا ہے سوز محبت نے موتیوں سے دہن　　یہ آبلے نہیں اے گرمیِ فغاں منہ میں
کرو نہ ترک کبھی مدح خاندان نبیؐ
نسیم دم میں ہے جبتک کہ دم زباں منہ میں

طریق عشق کے سالک بڑی مشکل میں رہتے ہیں | کہ خطرے رات دن درپیش اس منزل میں رہتے ہیں
اچنبھا مجھ کو آتا ہے تعجب مجھ کو ہوتا ہے | وہ او جھل آنکھ سے کیوں ہیں جو میرے دل میں رہتے ہیں

●

نہ سہی تم کو اگر ہم سے سروکار نہیں | ضد نہیں بحث نہیں شر نہیں تکرار نہیں

●

دے کے دل ان کو لگایا جی کا روگ | آپ اپنا باعثِ آزار ہوں

●

تڑپ رہا ہے دل بیقرار پہلو میں | ترے خدنگ کا ہے انتظار پہلو میں
بہا سرشکوں میں آخر کو دل لہو ہو کر | تڑپ کو چھوڑ گیا یادگار پہلو میں

●

دہنِ زخم کی مانند ہے ہنسنا میرا | عین گریہ ہے جو آتا ہے تبسم مجھ کو

●

اس کے سوا نہیں ہے کوئی دل کی آرزو | یارب مجھے نصیب عدو کا نصیب ہو
بھرتا ہے دم تمھاری محبت کا ہر حسیں | واللہ رے نسیم بڑے خوش نصیب ہو

●

لذت جور و ستم لینے دو | زیر شمشیر تو دم لینے دو
نگہ مست کو روکو نہ ابھی | بزم کا رنگ تو جم لینے دو

●

اثر جذب محبت کا ہوا آہستہ آہستہ | عدو سے کھنچ کے وہ مجھ سے ملا آہستہ آہستہ

●

ذکر عدو ہے دعویٔ مہر و وفا کے ساتھ | لائے ہو تم کہاں کا یہ جھگڑا لگا کے ساتھ
مجھ کو دیا فریب بتوں نے تو کیا عجب | اُن کا جو بس چلے تو نہ چوکیں خدا کے ساتھ
دل سے یہی دعا ہے مری ہر گھڑی نسیم | یارب ہو میرا حشر شہہِ کربلا کے ساتھ

دم عرض مطلب وہ کہنا کسی کا
بڑھے اپنی حد سے نہ انساں زیادہ
ستایا ہے کس کی محبت نے ان کو
وہ مجھ سے بھی ہیں کچھ پریشاں زیادہ

●

بڑھ کے روز عید سے یہ رات ہے
ان کی گردن ہے ہمارا ہات ہے
وصل میں کیسی حیا کس کا حجاب
بات لیجے یہ بھی کوئی بات ہے
مجھ کو اور ناصح صلاح ترک عشق
وہ کیا کہنا ترا کیا بات ہے
ہے یہ جوبن چار دن کی چاندنی
مان کہنا پھر اندھیری رات ہے

●

زمانے میں کس کی زباں پر نہیں ہے
فسانہ ہمارا کہانی تمھاری
اٹھاؤ بھی پردہ، دکھاؤ بھی جلوہ
کہاں تک سنیں لن ترانی تمھاری

●

اک میں ہوں کہ اپنوں سے خفا ہوں ترے پیچھے
اک تو ہے کہ غیروں کو منائے مرے آگے

●

اف رے بیدردی صیاد قفس میں بھی یہ قید
حکم یہ ہے کہ زباں تک نہ ہلائے کوئی
لاکھ باتوں کی یہ اک بات میں کہتا ہوں نسیم
بھول کر دل نہ حسینوں سے لگائے کوئی

●

مانگتے موت کے آنے کی دعا خالق سے
کیا کریں ہوش ٹھکانے نہ شب غم میں رہے
شب غم یاد جو آ جاتی ہے کانپ اٹھتا ہوں
یا الٰہی کوئی دشمن بھی نہ یوں غم میں رہے

●

جلا ہے جو نازوں سے وہ دل یہی ہے
جلاتے ہو تم اُس کو مشکل یہی ہے
کسے پھینکے دیتے ہو شیشہ سمجھ کر
مری جاں یہی ہے مرا دل یہی ہے
نتیجہ نہیں عشق کا کچھ بجز غم
کرو لاکھ تدبیر حاصل یہی ہے

رہِ عشق میں پانوں رکھنا نہ اے دل
جو سب سے کڑی ہے وہ منزل یہی ہے

•

بہت وعدے سنے تیری زباں سے
تسلّی اب نہیں سے ہے نہ ہاں سے
شبِ غم کا سنا قصہ تو بولے
ہمیں نفرت ہے جھوٹی داستاں سے
سمجھ جاؤ تمھیں جو مدعا ہے
میں کہہ سکتا نہیں اپنی زباں سے

•

کس قدر خلد میں پریشاں ہیں
بیٹھنے والے تیری محفل کے
ہم تھے اور صبح اک قیامت تھی
وہ تو رخصت ہوئے گلے مل کے

•

کر رہا ہے علاج وحشتِ دل
چارہ گر کی دوا کرے کوئی
پردۂ ظلم میں جو لطف کرے
ایسے پُر فن کا کیا کرے کوئی

•

شوق آرائش ہے ان کو آج کل
آئینہ بن جائے حیرانی مری
ہو گئے ششدر وہ مجھ کو دیکھ کر
چھا گئی ان پر بھی حیرانی مری

•

ہم کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا
دیکھ لی ہم نے دوستی دل کی

•

فکرِ دنیا فکرِ عقبیٰ فکرِ دشمن فکرِ دوست
یہ بکھیڑے چار دن کی زندگی کے واسطے
صدمہ و آلامِ دنیا سے پریشاں ہے نسیم
اس پہ یارب رحم کر آلِ نبی کے واسطے

•

شبِ غم روزِ محشر سے بڑی ہے
مجھے سو سو برس اک اک گھڑی ہے
جنوں میں جب کیا ہے قصدِ صحرا
تو بیڑی پانوں میں آکر پڑی ہے

•

دل جوئی انھیں آہ ذرا بھی نہیں آتی
یہ اور ستم ہے کہ جفا بھی نہیں آتی
حیران ہوں کس سے خبرِ یار میں پوچھوں
مدت سے ادھر باد صبا بھی نہیں آتی

•

کوئی تدبیر تو سوچو مری دلداری کی
کوئی پہلو تو نکالو کہ مرا دل ٹھیرے
اس بتِ شوخ سے اللہ نبھے گی کیونکر
جو تصور میں بھی آئے تو بمشکل ٹھیرے

•

میرے اشکوں کی کیا روانی ہے
شرم سے ابر پانی پانی ہے
مضمحل غم نے کر دیا ہے نسیم
ننگِ پیری مری جوانی ہے

•

باعث عذر و تامل نہیں کھلتا کیا ہے
آپ دل لیتے ہیں، ہم دیتے ہیں، جھگڑا کیا ہے

•

دونوں کو ترکِ رسم کا رنج و ملال ہے
جو میرا حال ہے وہی ان کا بھی حال ہے
آتا ہے کس کے دیدۂ مخمور دیکھ کر
کچھ آج تو نسیم کی مستانہ چال ہے

•

مبتلا آفت سی آفت میں دلِ رنجیدہ ہے
مشدہ ہے ہیں جس پہ ہم وہ غیر کا گرویدہ ہے

•

کریں گے سفارش نسیم ان سے جا کر
اگر وہ نہ مانیں تو قسمت تمھاری

•

آثار تغافل سے عیاں اور ہی کچھ ہے
بدظن ترے دل میں تو گماں اور ہی کچھ ہے
تم کہتے ہو کچھ غیر سے مطلب نہیں ہم کو
مشہور تو لوگوں میں یہاں اور ہی کچھ ہے
کہنے کو نسیم اور بھی شاعر ہیں ہزاروں
لیکن ترا انداز بیاں اور ہی کچھ ہے

•

تمنا یوں تو جیتے جی نہ میرے دل سے نکلے گی
گلے مل کر کسی دن خنجر قاتل سے نکلے گی

کوئی فتنہ جو اٹھے گا ترے کوچے سے اٹھے گا
جو شر کی بات نکلے گی تری محفل سے نکلے گی

نسیم ایسی زمیں میں تم نے لکھی ہے غزل ایسی
کہ خود تحسیں زبانِ بیخود و ساقی سے نکلے گی

•

کیا کروں فکر شب ہجر سنبھلنے کے لیے
دل مچلتا ہے کسی بزم میں چلنے کے لیے

•

دم نکلتا ہے نہ ارمان، بڑی مشکل ہے
کس مصیبت میں پڑی جان بڑی مشکل ہے

•

یوں لے گئے وہ دل کو اڑا کر کہ میں تو کیا
میرے فرشتوں کو بھی نہ مطلق خبر ہوئی

پہلے تو عاشقوں کے نہ ہوتے تھے سر قلم
یہ رسم تیرے عہد میں جاری مگر ہوئی

آیا نہ عاشقی کا سلیقہ ذرا نسیم
کرتے ہوئے یہ کام تمھیں عمر بھر ہوئی

•

اب وہ کرتے ہیں منتیں میری
انقلابات ہیں زمانے کے

•

ہمیں خیال تھا الفت میں دل لگی ہوگی
یہ کیا خبر تھی کہ مر مر کے زندگی ہوگی

نئی ہے عمر نیا شوق جو رہے ان کا
جفا بھی ہم پہ جو ہوگی تو نت نئی ہوگی

•

شب فرقت قضا نہیں آتی
لاکھ کہتا ہوں آ، نہیں آتی

دل میں کیوں حسرتوں کا دم نہ گھٹے
اس مکاں میں ہوا نہیں آتی

شیشۂ دل ہے کس قدر نازک
ٹوٹنے کی صدا نہیں آتی

•

ذکر ایفا کچھ نہیں وعدہ ہی وعدہ ہم سے ہے
رات دن شام و سحر امروز و فردا ہم سے ہے

کون سی خوبی ہے ہم میں جس پہ نازاں ہوں نسیم
جو زمانے سے بُرا ہے وہ بھی اچھا ہم سے ہے

•

نئے انداز تم نے بزم میں یہ کس سے برتے ہیں
حیا میں کیوں یہ شوخی ہے یہ شوخی میں حیا کیوں ہے

کہاں سے آرہے ہو منہ اندھیرے ہم سے بھی کہہ دو　　نظر جھپکی ہوئی کیوں ہے یہ منہ اترا ہوا کیوں ہے

●

کوہکن ہے کوئی مشہور تو مجنوں کوئی　　اپنے دیوانے کا نام آپ نے کیا رکھا ہے

●

کسی کے سامنے کیوں جاؤں التجا لے کر　　نسیم کیا نہ سنے گا مرا خدا میری

فراق یار میں برسوں رہی ہے ہم کو یہ وحشت　　کبھی گلشن میں آ نکلے کبھی صحرا میں جا نکلے

●

جناب شیخ کو دیکھا شراب خانے میں　　طواف شیشہ و پیمانہ و سبو کرتے

ملوں میں ہر کس و ناکس سے کیوں نہ جھک کے نسیم　　فروتنی ہے بجا نخلِ بارور کے لیے

●

حواشی

1۔ بقولِ داغ۔۔ ''شاگردوں کی بڑی تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ ضرور ہے کہ شاگردوں کی بڑی تعداد ایک شاعر کی مقبولیت پر گواہ ہوتی ہے۔'' بحوالہ نقوش (شخصیات نمبر۔ جلد اول) ص۔ 1497

2۔ یادگار داغ ص۔ 75-61 بحوالہ مطالعۂ داغ ص۔ 343

3۔ مطالعۂ داغ ص۔ 347-346 مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ 1974

4۔ داغ کے اہم تلامذہ: مرتبہ اسعد بدایونی مطبوعہ علی گڑھ (یوپی) 1936

5۔ تذکرۂ اقلیم سخن ص۔ 65 مطبوعہ کراچی 1984

6۔ زبان داغ ص۔ 59 مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ

7۔ ایضاً۔ ص 158

8۔ مراثی فیض (جلد دوم) ص۔ 41 مرتبہ جعفر زیدی، کراچی

9۔ ریاض نسیم کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

''من تصنیف لطیف شاعر عدیم السہیم ہم پایۂ طالب و کلیم عالی جناب منشی شبیر حسین صاحب نسیم مرحوم شاگرد و جانشین حضرت فصیح الملک داغ دہلوی مغفور''

10۔ فیض کے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (1) تذکرۂ مرثیہ نگاران اتر پردیش (2) مراثی فیض (جلد دوم) (3) راجستھان میں اردو مرثیہ

11۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ تاریخ سادات بھرتپور مصنفہ سید ظہیر الحسن مطبوعہ کراچی

12۔ تاریخ سادات بھرتپور ص۔ 75

13۔ ایضاً۔ ص۔ 76

14۔ ریاضِ نسیم۔ ص۔1، مطبوعہ ابو العلائی پریس، آگرہ

15۔ ایضاً۔4-2

16۔ یہاں بظاہر تپاں سے سہو ہوا ہے۔ یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے اور ریاضِ نسیم میں موجود ہے۔ اس کا مقطع یہ ہے:

لیا تھا اس زمیں میں امتحاں طبع یاروں نے
کہے موزوں یہ ہم نے اے نسیم اشعار چٹکی میں

17۔ ریاضِ نسیم۔ ص۔3

18۔ ریاضِ نسیم۔ ص۔4-3

19۔ اس طرحی مشاعرے کا ذکر داغ نے اپنے خط بنام کنور امتیاز علی خاں متخلص بہ حسرت میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" آجکل اعلیٰ حضرت کو شعر و سخن سے کمال توجہ ہے۔ یہ مصرعہ طرح ہے۔ یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے پڑی بلا، گڑی قافیہ ہے۔ میں نے بھی 42 شعر ایک دن میں کہے۔ حضور پرنور نے 112 شعر کی چار غزلیں کہیں......"

اس خط میں نسیم کی اس غزل کا ذکر نہیں ہے، جو انھوں نے اسی زمین میں لکھی تھی۔ ممکن ہے کہ داغ نے اس خط کے لکھے جانے تک نسیم کی غزل امیر مینائی کے پاس نہ بھیجی ہو۔

20۔ جانشینیِ داغ کا معاملہ ذرا الجھا ہوا ہے، اور اس سلسلے میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ خود نوشتِ نوح (1941) سے اخذ کردہ حالاتِ نوح ناروی مطبوعہ نقوش (آپ بیتی نمبر) مطبوعہ 1964 کے ص۔1448 پر یہ عبارت ملتی ہے:

" حضرت داغ کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلے۔ اور بطور خود اس کے مدعی بہت سے لوگ تھے۔ لیکن سائل دہلوی نے خیال کیا کہ ایک شخص پر یہ شرف کیوں محدود کر دیا جائے جتنے قابل شاگرد ہیں، وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے مجھے جانشینی کی سند عطا کی۔"

ممکن ہے کہ سائل کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے تپاں نے نسیم کو بھی جانشینِ داغ متصور کیا ہو۔

21۔ زبانِ داغ۔ ص، 59

22۔ ایضاً۔ ص، 59

23۔ ریاضِ نسیم۔ ص، 232

24۔ ایضاً ص 232

25۔ مراثی فیض (جلد دوئم) ص 41

26۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: تذکرہ مخانۂ جاوید (جلد اوّل) ص 550

27۔ :راجستھان میں اردو مرثیہ ص 202-201 مولفہ سیّد یاد علی جعفری مطبوعہ 1999

28۔ بحوالہ زبانِ داغ ص، 161-160

●●●

Deptt. of Urdu & Persian
University of Rajasthan
Jaipur 302004 (Rajasthan)

قاضی جمال حسین

کلام داغ کے چند نمایاں امتیازات

داغ نے اپنے اشعار میں جو دنیا خلق کی ہے اور اسے جن کرداروں سے آباد کیا ہے وہ قاری کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ معشوق، عاشق، ناصح اور قاصد اگرچہ اردو شاعری کے روایتی کردار تھے اور بزم یار و کوچۂ دلدار کی سرگرمیاں بھی، کلاسیکی غزل کی روایت سے آگاہ اردو کے ایک عام قاری کے لیے کچھ نئی نہیں تھیں، لیکن داغ نے جلوت و خلوت میں، محبوب کی شخصیت کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور وصال و ہجر کی کیفیات کو جس زاویے سے دیکھا ہے، وہ داغ کا اختصاص ہے۔ روایتی کرداروں کا غیر روایتی انداز اور جانی پہچانی جگہوں میں انجانی جگہوں کا سا لطف پیدا کر دینا، داغ کی معجز بیانی اور طلسم بندی کا کرشمہ ہے۔

داغ کی غزلوں کے کرادار اپنی پیش قدمی، طرحداری اور جرأت اقدام سے حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ اس شعری کائنات میں کرداروں کی گفتگو اور ان کے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت، زندگی کی حرارتوں سے ایسی معمور ہے کہ قاری دیر تک اس شہر کی دریافت پر سرشار رہتا ہے۔ قاری کی یہ سرشاری دراصل نشاط آگہی کی ایک صورت ہے کہ اس شہر ہوس میں اس کے خوابوں کی تعبیر اور آرزوؤں کی تسکین کا سامان فراہم ہے۔ داغ کی اس شعری کائنات میں یوں تو کچھ بھی ایسا نہیں جسے انوکھا کہیے۔ وہی افسانۂ الفت ہے جسے ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں ہمیشہ کہتا آیا ہے لیکن داغ نے اپنے محدود سرمایۂ الفاظ کے باوجود جس طرح اس قصے کی جزئیات بیان کی ہیں اور جس طرح کرداروں کی شخصیت کو روشن کیا ہے، اس سے اس کہانی کا پورا Pattern متاثر ہوا ہے۔

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی قصہ ہے الفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

بلاشبہ داغ کے تجربات میں اس اعتبار سے تنوع نہیں کہ "حرف مدعا" بس ایک مرکز ثقل کے گرد

گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن حرف مدعا کی پیشکش ہر گردش میں ایک نیا (Pattern) بناتی ہے۔
داغ کے سلسلے میں ناصر کاظمی نے نہایت پتے کی بات کہی ہے کہ.....

''داغ کی غزل بساط شطرنج کی مثال ہے جس میں گنے چنے مہروں کی طرح چند الفاظ ہیں لیکن شطرنج کی چالوں کی طرح ہر مرتبہ ایک نیا لہجہ اور انداز بیان دیکھ کر پڑھنے والے کا دل پھڑک اٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داغ جس کسی دوسرے شاعر کی زمین میں غزل کہتا ہے اسے اپنی غزل بنا لیتا ہے۔''
(خشک چشمے کے کنارے صفحہ 143)

داغ کا مخصوص رنگ اور اس کی منفرد طرز اسی حرف مدعا کے مخصوص پیرایۂ اظہار سے عبارت ہے۔ یہاں تشبیہات کی کثرت ہے نہ استعاروں کی ندرت اور نہ ہی پیکروں کے ہجوم لیکن بہ ظاہر سادہ سا شعری تجربہ روز مرے اور لہجے کی مدد سے ایک نئے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ شعری تجربے کی اس سادگی کا احساس جتنا عام ہے، اس کی پیشکش میں پرکاری کا تجزیہ اتنا ہی دشوار ۔

میرا طریق عشق جدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہگور کو میں

جہان سے جدا داغ کے اس طریق عشق میں ہماری توجہ کا مرکز سب سے پہلے محبوب بنتا ہے۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ایسا Normal اور روشن خیال محبوب، غزل کی پوری روایت، میں خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ محبوب اسی زمین کی مخلوق ہے۔ چنانچہ اس کا پورا رویہ زندگی کے تئیں بھی اور عاشق کے لیے بھی، ارضی اور انسانی ہے۔ ذہنی بیماری کی حد تک وہ نہ تو ستم پیشہ و جفا کار ہے نہ ہی کسی نفسیاتی مریض کی طرح خود بیں و خود پسند۔ بلکہ جذبات کے فطری اظہار پر تہذیب اور روایت کی حد سے بڑھی ہوئی پابندیاں بھی اسے گوارا نہیں۔ سہل آمیز ہے، محبت کا جواب محبت سے دینے کا حوصلہ رکھتا ہے جسمانی مطالبات کا بھی احترام کرتا ہے اور شب وصل تمکین و ضبط میں گزار دینے کے بجائے ہنس ہنس کے عاشق سے چھیڑ چھاڑ کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اسے عاشق کی دلآزاری بھی منظور نہیں چنانچہ صنفی رسومیات کے تحت لاتعلقی کے اظہار میں بھی ربط و تعلق کا رنگ، اس کی شخصیت کو مزید دلآویز بنا دیتا ہے۔ اس کردار کے صحیح خد و خال داغ کی زبانی ملاحظہ ہوں ۔

ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں شب وصل وہ مجھ سے
چھیڑو گے تو پھر ہم سے ملاقات نہ ہوگی

گئے وہ اٹھ کے پہلو سے تو یہ کہتے گئے مجھ سے
ذرا سا صبر کر لو، تم سے اتنا ہو نہیں سکتا

انکار وصل منہ سے نہ نکلا کسی طرح
اپنے دہن سے تنگ وہ غنچہ دہن ہوا

وصل کی ان سے ہو گئی امید
سلسلہ جب کلام کا نکلا

شریر آنکھ نگہ بے قرار چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لیے

ارمان ہم آغوشی سن سن کے ڈھٹائی سے
اس کہنے کے میں صدقے "پھر کہیے تو کیا ہوتا"

کھل کھیلیے کھل جایئے دل کھول کر ملیے
کب تک گرہ بند قبا کو کوئی دیکھے

جو دل میں تمھارے ہے وہی ہے مرے دل میں
میں کہہ دوں اگر تم سے بیاں ہو نہیں سکتا

شہر ہوس کا یہ کردار، کسی بھی عام قاری کے لیے دلچسپی کا ہزار سامان رکھتا ہے۔ اس کی کشادہ دلی، خوش خلقی اور دلآسائی، مفلس کی فکر پریشاں کو ایک مرکز فراہم کر دیتی ہے۔ اس کردار کی قوت یہ ہے کہ احساسِ گناہ یا احساس ندامت، معاملہ بندی کی اس فضا کو کہیں بھی آلودہ نہیں کرتا۔ دونوں طرف ربط و تعلق کی حرارت بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔ جنسی جذبے کی طرف داغ کا یہ رویہ Perversion یا فحاشی کے بجائے فطری اور صحت مند ہے۔ بقول حسن عسکری، جو شاعری یا جو محبت جسمانی خواہش کی پاکیزگی محسوس نہ کر سکے وہ قوت اور عظمت سے بھی پاک ہوگئی ....اور یہ کہ جنسی خواہش کے باوجود بلکہ

شاید جنسی خواہش کی مدد سے آدمی محبوب کے حسن میں ساری کائنات کا حسن دیکھ سکتا ہے۔

(ستارہ یا بادبان ص 209)

معاملہ بندی کے اسی قسم کے اشعار کے پیش نظر داغ کے بارے میں عام طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ....

''داغ کی شاعری کے لیے سب سے زیادہ موزوں لقب ''عیاشانہ شاعری'' ہے۔ داغ کا کلام انھیں لوگوں میں ضرورت سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری سے واقف نہیں ہیں۔ مثلاً ارباب نشاط کا فرقہ داغ کو اپنا پیغامبر سمجھتا ہے۔ داغ کی شہرت محض اس لیے ہے کہ ان کا کلام عموماً ان جذبات اور خواہشات نفسانی کی تصویر ہے جو عوام کے دل میں امنگ پیدا کرنے کے لیے جادو کا اثر رکھتی ہے۔'' (مضامین چکبست)

اس قسم کے خیالات کے سلسلے میں اصولی بات تو یہ ہے کہ شاعری کا مطالعہ اجتماعی زندگی کی مذہبی اور اخلاقی قدروں کی روشنی میں کہاں تک درست ہے؟ یعنی جو باتیں ہماری حقیقی اور خارجی زندگی میں خلاف تہذیب ہیں لفظوں سے بنائی گئی اس طلسمی دنیا میں بھی ناشائستہ ہی قرار دی جائیں گی؟ پھر تو شاعری کا پورا سرمایہ ہی اس سوال کی زد پر ہے۔ بت کافرادا کی پرستش، محبوب کا قاتل ہونا، اس کی نخوت اور خود بینی، یہ تمام کارگزاری غیر اخلاقی ہے۔ جب کہ ظاہر ہے کہ شاعری کی قلم رو میں اس کے اپنے اصول اور خوب و ناخوب کے اپنے معیار ہیں۔ جس طرح شاعری میں قتل وخوں ریزی یا دشنہ و خنجر کا حقیقی قتل وخوں ریزی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض ایک پیرایۂ اظہار ہے اسی طرح معاملہ بندی کے اشعار میں بھی '' ہے عبارت ہی عبارت مدعا کچھ بھی نہیں'' یہ شاعرانہ مضامین ہوائے دل کے لیے کھڑکیاں ہیں جہاں قاری اپنے جذبات کی جسمانی تجسم میں ایک نوع کی طمانیت اور آسودگی کا احساس کرتا ہے۔

پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نوع کے اشعار کی تعداد کیا ہے؟ وصل کی شوخیوں کے سوا اور کھل کھیلنے کے علاوہ اس کردار کے دیگر مشاغل کیا ہیں؟ اور کیا صفات ہیں جن سے اس کردار کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ آدمی ادھوری تصویر پر حکم لگانے سے پہلے اس کردار کے دوسرے اہم پہلو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ترے عالم کو جب سے ہم نے دیکھا
تماشائی ہے اک عالم....ہمارا

تو قیامت کی چال کرتا ہے
بے چلے پائمال کرتا ہے

غنیمت ہے چشم تغافل بھی ان کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں
لوگ کہتے ہیں انھیں بیمار یہ کیا

ہم اب سے لیں گے بوسۂ گل تیرے سامنے
کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا

مجنوں کے طرفدار بنے ہیں کئی دن سے
فرماتے ہیں وہ آپ سے کیا بات میں کم تھا

جب دیکھتے ہیں داغ کو، ہوتا ہے یہ ارشاد
معلوم نہیں زندہ ہے یہ کس کی دعا سے

کہا ظالم نے میرا حال سن کر
وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا

دم رخصت یہ چھیڑ تو دیکھو
مجھ سے کہتے ہیں کب ملیں گے آپ

حشر کے دن تو ملو گے یہ کیا میں نے سوال
سوچ کر دیر میں ظالم نے کہا مشکل ہے

ان اشعار سے محبوب کی جو تصویر ابھرتی ہے اس میں داغ نے اپنی فنکاری اور لہجے پر غیر معمولی قدرت سے روایتی مضامین میں نیا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ داغ کے مضامین تو عموماً سادہ ہوتے ہیں لیکن پیرایۂ اظہار میں قدرے پرکاری سے کام لے کر فصیح الملک کوئی گرہ بھی ڈال دیتے ہیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس پرکاری کے سبب مضمون، بیان واقعہ کی سطح سے بلند ہو کر شعری تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عام قاری کی دست رس میں ہونے کے سبب ایک بڑے حلقے کو متاثر کرتا ہے۔ داغ کی غیر معمولی مقبولیت میں سادگی اور پرکاری کے اس حسن تناسب کو غیر معمولی دخل ہے۔

مثال کے پہلے ہی شعر میں محبوب کی دلکشی کے لیے "عالم" کا لفظ معنی کے جن وسیع امکانات پر مشتمل ہے ان کا احاطہ آسان نہیں اور غالباً کوئی دوسرا لفظ اتنی تہہ داری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ محبوب کی شخصیت کے جملہ ظاہری اور باطنی محاسن اس عالم کے عناصر ترکیبی ہیں۔ پھر دوسرے مصرعے میں عالم کا لفظ شعر کی کیفیت میں مزید اضافے کا سبب ہے۔ داغ فقط محبوب کی دلآویزی اور دلربائی کا عالم بیان نہیں کرتے بلکہ شعر کے متکلم کی سرشاری، محویت اور بے خودی کو بھی پیش منظر میں نمایاں کرتے ہیں۔ حیرانی اور بے خودی کا دراز تر ہوتا یہ سلسلہ بالآخر ایک خلقت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کہ عاشق کا حال اور اس کی کیفیت ایک عالم کے لیے دیدنی منظر یا انوکھا تجربہ ہے جس میں خلقت تماشائی بن گئی ہے۔ گو عاشق اور خلقت سب پر ایک عالم طاری ہے اور سبھی کا عالم ان کے حسب حال ہے۔ معشوق پر عالم حسن و جمال، عاشق پر عالم بے خودی و سرشاری اور خلقت پر عالم حیرانی۔

اسی طرح رفتار یار کے پامال مضمون میں داغ نے ایک نیا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ رفتار یار کی فتنہ گری اور اس کے سبب لوگوں کا قتل ہونا ایک روایتی مضمون ہے لیکن بے چلے ہی عاشق کو اپنی چال سے پامال کر دینا، داغ کے محبوب کا امتیاز ہے۔ رفتار یار کے مضمون کا یہ انوکھا پہلو شاید کہیں اور دیکھنے کو نہ مل سکے۔ اس انوکھے پہلو کا تمام تر لطف "چال کرنا" اور "چال چلنا" کے محاورے پر قائم ہے۔ طریقۂ کار کی اس انفرادیت کے سبب داغ نے اپنی اردو پر فخر کرنے کے ساتھ ہی شاعری میں اپنی طرز خاص پر بھی بجا طور پر فخر کیا ہے۔

نہیں ملتا کسی مضموں سے ہمارا مضموں
طرز اپنی ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

داغ معجز بیاں ہے کیا کہنا
طرز سب سے جدا نکالی ہے

اسی طرح چشم یار کا مضمون بھی نیا نہیں ہے لیکن داغ نے روزمرے اور مخصوص لہجے کی مدد سے اس پامال مضمون میں دلکشی کا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ شعر کا حسن ظاہری سطح پر یہ ہے کہ اچھی اور بیمار کا تقابل شاعرانہ لطف کا سبب ہے کہ محبوب کی آنکھیں نہایت اچھی ہیں پھر اسے بیمار کی صفت کے ساتھ ترکیب دے کر چشم بیمار کیوں کہا جاتا ہے؟ وہ اس شاعرانہ ترکیب کو غلط قرار دینے کے بجائے اظہار تعجب کرتا ہے۔ لیکن شعر کی اصل کیفیت شعر کی مخصوص قرأت اور لہجے میں پوشیدہ ہے۔ ''تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں'' کا پیرایۂ اظہار محبوب کی آنکھوں کو دیکھ کر متکلم کی محویت اور پھر خود کلامی کا منظر پیش کرتا ہے جو اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ آنکھوں کی جملہ تشبیہات اور تمام استعارے اس کے حسن کا بیان کرنے سے عاجز ہیں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''تیری آنکھیں تو بہت اچھی ہیں۔''

محبوب کی حاضر جوابی، بے تکلفی اور بذلہ سنجی اس کی آنکھوں میں ذہانت اور شوخی کی چمک پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ مثال کے آخری پانچ اشعار، محبوب کے کسی عمل (Action) کے بجائے اس کے طرز کلام کو نمایاں کرتے ہیں جس میں اس کی شوخی اور طرحداری کے ساتھ ہی شخصیت کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ داغ کے کلام میں جس شوخی کا ذکر تقریباً سبھی نقادوں نے کیا ہے وہ بڑی حد تک محبوب کے طرز کلام یا ان کے کرداروں کے باہمی مکالے کی رہین منت ہے۔ غزل کی صنفی رسومیات میں محبوب کے رویہ اور ایک عاشق کی گفتگو کے جو آداب مقرر ہیں، داغ کا محبوب اور ان کا عاشق جا بجا اسے توڑتے اور ان صنفی رسومیات سے انحراف کرتے ہیں۔ صنفی رسومیات کی خارج سے عائد کردہ پابندیوں کے بجائے یہ محبوب انسانی فطرت کی آزادہ روی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ عاشق سے بلا تکلف ملتا ہے، باتیں کرتا ہے اور مساویانہ سطح پر معاملہ کرتا ہے۔ تمکین وضبط کا غیر فطری مظاہرہ کر کے وہ وصل کی لذتوں کو ہجر کی کلفتوں میں تبدیل کر دینے کا قائل نہیں۔ آزادی کا یہی رویہ اس کی اداؤں میں شوخی کی ضمانت ہے۔ وقت رخصت عاشق سے چھیڑ چھاڑ کو وہ اپنے منصبی آداب کے منافی نہیں سمجھتا اور ''کب ملیں گے آپ'' کہہ کر شوخی اور بے تکلفی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ واقعے اور ظاہری صورت حال میں تضاد کا تناؤ رخصت کے اس منظر کو شعری تجربے میں تبدیل کر دیتا

ہے۔اسی طرح روز حشر جب جملہ خلائق یکجا ہوں گی، ملاقات کے سوال پر محبوب کا تامّل اور غور وفکر کے بعد یہ کہنا کہ ''مشکل ہے'' شعر میں ڈرامے کا لطف پیدا کر دیتا ہے۔

حشر کے ساتھ جو تصورات وابستہ ہیں ان کے پس منظر میں معشوق کی یہ شوخی اور غور وفکر کے بعد یہ فرمانا کہ ملاقات مشکل ہے، لطف سے خالی نہیں پھر یہ کہ ''مشکل ہے'' کا مختصر فقرہ کس بات کا جواب ہے۔ملاقات مشکل ہے یا یہ سوال مشکل ہے جس کا جواب محبوب کے پاس نہیں۔ابہام کا یہ پہلو شعر میں ایسی تہہ داری اور پیچ پیدا کر دیتا ہے جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے اوسط ذہانت، معمولی علم اور تھوڑا سا مذاق سخن کافی ہے داغ کی انفرادیت اور مخصوص رنگ کو چمکانے میں اس طریقۂ کار کو بہت دخل ہے۔

داغ کے شہر ہوس کا دوسرا کردار عاشق ہے جو اس شہر کی گرمیٔ بازار کا سبب ہے۔یہ ایک مجلسی، تجربہ کار اور عشق ومحبت کے معاملات میں اقدام کرنے والا جرأت مند شخص ہے۔آزاد منش ہے لذت ونشاط کا جویا۔محبوب کی ناز برداری اس کار آزمودہ شخص کے نزدیک وقت کا زیاں ہے۔خوش باش اور خوش اوقات یہ شخص زندگی سے بھرپور محبت کرتا ہے اور کار دنیا کو بے فائدہ اور عبث نہیں جانتا۔

لیکن عاشق کے کردار کا یہ پہلو اپنی بے حجابی اور بے باکی کے سبب تناسب سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے اور بیشتر ناقدین نے انھیں اشعار کے پیش نظر داغ کو عیش ونشاط کا امام اور عیاشانہ شاعر کا پیغامبر قرار دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ داغ کے فنی محاسن نظر انداز ہو گئے۔اس موقف کو داغ کے سوانحی کوائف سے بھی تقویت حاصل ہوئی۔بیک وقت مختلف طوائفوں سے ربط وضبط نے داغ کی شاعری سے متعلق رائے عامہ کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔بہر حال اس ہوس پرست اور عاشق مزاج کردار کی دلچسپیاں اور مشاغل ملاحظہ ہوں۔

وہ ہرجائی اگر ہے داغ، ہو تم بھی تو آوارہ
تمھیں کب صبر ہے بیٹھے ہوئے تم ایک پر کیا ہو

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

ہم لطف کے بندے ہیں خدا کی قسم واعظ
ہم سے نہ کبھی بار ستم گر کے اٹھیں گے

لے لیے ہم نے لپٹ کر بوسے
وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا

محشر میں بعد پرسش اعمال دیکھنا
ہم دیکھتے پھریں گے تماشا اِدھر اُدھر

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے
تمھیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

کچھ تذکرۂ عشق رہے حضرت ناصح
کانوں کو مزہ دیتی ہے گفتار محبت

ہزار کام مزے کے ہیں داغ الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

ان اشعار میں روز مرے اور لہجے کی مدد سے کسی حد تک شاعرانہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔لیکن جذبے کی عدم تہذیب اور عشق کے آداب کا پاس ولحاظ نہ کرنے کے سبب داغ کی شاعری پر علی الاطلاق عیاشانہ شاعری کا حکم لگا دیا گیا۔1905 میں چکبست نے داغ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔لکھتے ہیں.....

''داغ کا معشوق ہمیشہ بازاری معشوق ہے اور داغ کے نزدیک عشق،نفس پرستی کا دوسرا نام ہے۔اس صورت میں داغ کی شاعری کو عاشقانہ شاعری کہنا زیبا نہیں۔کیوں کہ داغ حسن وعشق کے اعلیٰ مفہوم سے بےخبر تھے۔داغ کی شاعری عیاشانہ شاعری ہے۔''

(انتخاب مضامین چکبست ص149)

چکبست کے اس بیان پر اظہار خیال یا محاکمے کے بجائے داغ کے یہ اشعار سنیے۔

ہم اب سے لیں گے بوسۂ گل تیرے سامنے
کیا ایسا لعل ہے ترے لب میں لگا ہوا

بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنی کیا
تمھارے کان میں اک حرف ہم نے ڈال دیا

خاموشی سنی رہتی ہے پہروں شب فراق
تصویر یار کو ہے مری گفتگو پسند

داغ وارفتہ کو ہم آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

دن ڈھلے آنے کا وعدہ ہے کسی سے لیکن
آج یہ دن وہ قیامت ہے کہ ڈھلتا ہی نہیں

فلک سے طور قیامت کے بن نہ پڑتے تھے
اخیر اب تجھے آشوب روزگار کیا

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبئ تقدیر سے حال اچھا ہے

اس قسم کے اشعار کی تعداد داغ کے یہاں کم نہیں جس میں ہوس پرستی اور معاملہ بندی کے بجائے، عاشق کا روحانی اضطراب قاری پر ایک کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ یہاں عاشق کی تمام سرگرمیاں اور اس کی زندگی کے تمام مشاغل عشق کے مرکزی جذبے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ جذبے کی تہذیب اور اس کی فنکارانہ پیشکش اس کے سوا اور کیا ہے؟ ان اشعار کی موجودگی میں یہ خیال کہ داغ کی شاعری کا ماحصل ایک عیاش شخص کی فتوحات کا بیان ہے، محل نظر ہے۔ مذکورہ تمام اشعار اپنی پرفریب سادگی، روزمرے کی پابندی اور سبک روی کے ساتھ ہی معنی کے وسیع تر امکانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ شعر کا

ظاہری مفہوم خود اپنی دلالتوں سے دست و گریباں ہے اور معنی کو کسی ایک سطح پر ٹھہرنے نہیں دیتا۔ محبوب کے لبوں کی نزاکت اور خوش رنگی کے بیان کا اس سے بہتر پیرایہ اور کیا ہوگا؟ عاشق بوسۂ گل محبوب کے سامنے لیا کرے گا محبوب کے لبوں میں ایسی کیا خاص بات ہے جو گل میں نہیں؟ یہاں لعل لگنے کا محاورہ فقط برجستہ عام بول چال کا لطف ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ معنی کی توسیع کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ لعل کی سرخی، رنگ گل اور لب یار کو یکجا کر دیتی ہے۔ لیکن محاورے کے حاوی مفہوم کو بے دخل کر کے اگر لغوی سطح پر مصرعے کو پڑھیں تو ''کیا'' حرف استفہام، لعل پتھر کی سرخی کو پیش منظر میں نمایاں کر دیتا ہے۔ اور استفہام انکاری گل کی سرخی کو محبوب کے لب کی سرخی سے زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرتا ہے۔ لیکن معنی کی دونوں صورتوں میں، عاشق کی نارسائی اور اس کا احساس شکست نمایاں ہے۔ محبوب کے لبوں کی ناکام حسرت بوسۂ گل میں پناہ ڈھونڈتی اور گل کو بھی رسوا کرتی ہے۔

داغ کے کلام کی ایک اور خوبی جس پر کم توجہ دی گئی، محاکات اور ڈرامائی کیفیت ہے۔ تصویریں بنانے اور معجز بیانی سے انھیں زندہ اور متحرک کر دینے کا، داغ کو خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ اس قسم کے اشعار میں کسی صورت حال یا تجربے کو بیان کرنے کے بجائے داغ اسے آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دکھاتے ہیں۔ قاری اس منظر میں ذاتی تجربے کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو سننے سے زیادہ دیکھنے کی کیفیت رکھتے ہیں۔

آنکھیں ترے تلوؤں سے ملیں کس نے پئے وصل
وہ پھول سے نرگس کے بنے ہیں کف پا میں

دیکھنا پیر مغاں حضرت ناصح تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو

نام ناصح کا لیا تھا میں نے
اے لو حضرت وہ چلے آتے ہیں

حضرت داغ یہ ہے کوچۂ قاتل اٹھیے
جس جگہ بیٹھتے ہیں آپ تو جم جاتے ہیں

کم بخت وہی داغ نہ ہو دیکھو تو جا کر
بے چین کیے دیتی ہے فریاد کسی کی

مذکورہ اشعار میں اولاً تو لہجے اور عام بول چال کی زبان نے شعر کی فضا کو بڑی حد تک غیر رسمی اور بے تکلف بنا دیا ہے۔ بے تکلفی کی اسی فضا کے سبب کرداروں کے باہمی تعلق میں ایک نوع کی یگانگت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان تصویروں میں شعر کا راوی کمال خاموشی اور سہولت سے اپنی شخصیت کو منظر سے الگ کر لیتا ہے کہ قاری کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ شعر سننے کے بجائے منظر کو دیکھنے کے عمل میں مصروف ہے۔ راوی جب پیر مغاں سے یہ کہتا ہے کہ " کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو" تو قاری کو بھی پس خم ڈرے سہمے حضرت ناصح کے عمامے کا گوشہ نظر آنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے قاری یہ بات بھول جاتا ہے کہ اس واقعے کا کوئی راوی بھی ہے۔ اسی طرح محبوب کے کف پا میں نرگس کے پھول صاف دکھنے لگتے ہیں۔

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں غالباً ان کی اسی خوبی کو نشان زد کیا ہے۔

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

داغ نے اپنی غزلوں میں جو دنیا آباد کی ہے اس میں دل و جان کی تسکین کے ہزاروں سامان ہیں۔ اس شہر ہوس کے کردار، ان کی گفتگو میں زندگی کی حرارت اور موانست کی گرمی، ہوس سے لے کر صوفیانہ تجربے تک عشق کے صد ہا رنگ قلعۂ معلیٰ کے محاورے، شوخی، حاضر جوابی، اور ناصح سے چھیڑ چھاڑ، غرض ایسی رونق اور گرم بازاری ہے کہ بس!

● ● ●

Deptt. of Urdu
A.M.U. Aligarh
(U.P)

شین کاف نظام

نواب مرزا خاں داغ

نواب مرزا خاں داغ سے متعلق متضاد باتیں پڑھنے سننے کو ملتی ہیں لیکن زیادہ تر باتیں کچھ اس نوعیت کی ہیں۔

- داغ کا کلام ان لوگوں کو زیادہ پسند آتا ہے جو اعلیٰ درجے کی شاعری سے واقف نہیں ہیں۔
- داغ کا معشوق بازاری ہے۔
- ان کی شاعری عیاشانہ شاعری ہے۔
- داغ کی زبان دلّی کی مستند زبان نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

دوسری طرف ان کی تعریف و تحسین میں بھی انگنت باتیں مشہور ہیں۔ داستاں طرازی ہمارے معاشرے کا مزاج ہے۔ مبالغہ اس سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ مبالغہ خوبی بھی ہے لیکن اس خوبی کی خرابی یہ ہے کہ یہ حقیقت کو چھپاتا ہے۔ داغ کے باب میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ داغ کا عہد عدم اطمینانیوں میں اطمینان اور اندھیرے میں اُجالے کی تلاش کا عہد ہے۔ اس کے بعد کا عہد ادب کے سماجی اور سیاسی سروکاروں پر زور دینے والا ہے یعنی '' کیا کہا گیا'' ہے کا عہد ہے جب کہ داغ '' کیسے کہا گیا ہے'' کی شعری روایت کے شاعر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ داغ کی مطابقت ہی مشکوک ہو کر رہ گئی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سبب خواہ کچھ بھی رہا ہو ہم نے داغ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مندرجہ بالا اقوال ہی سے گفتگو کا آغاز کریں کہ کلامِ داغ کو پسند کرنے والے اعلیٰ شاعری سے واقف نہیں۔ یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں:

ایک صحبت میں (غالب) نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے(1)

مرزا داغ کو یہ مضمون پسند تھا چنانچہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں۔

یہ کشش تھی حسنِ جاناں کی کہ اس کی بزم میں
شمع کے نزدیک شب کو کوئی پروانہ نہ تھا

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ خود حالی نے مرزا داغ کے لیے کہا ہے۔

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا محمد علی جیسا ثقہ آدمی قرآن پاک کے ساتھ اپنے پاس ''دیوانِ داغ'' کا بھی ایک نسخہ رکھتا تھا اور شبلی جیسا عالم دین بھی داغ کے اس شعر پر جھوم گیا۔

بات کرنی تک نہ آتی تھی تمھیں ☆
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے''(2)

اگر غالب، حالی، شبلی اور مولانا محمد علی جیسے لوگ بھی اعلیٰ درجے کی شاعری سے واقف نہیں تھے تو پھر وہ کون لوگ ہیں جن کے مذاقِ شعر اور معیار ادب کو ان حضرات کے ذوقِ جمالی اور شوقِ شعر پر فوقیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کا ذکر تو میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہے کہ ان کی تعریف کو کہیں شاگرد کا مبالغہ آمیز مرثیہ نہ سمجھ لیا جائے۔

اردو غزل پر یہ اعتراض تو ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ اس میں عورت کی جو چھب ابھرتی ہے اور اس کے جو ڈھب ہیں وہ سب کے سب بازارو عورتوں جیسے ہیں پھر اس تعیم کی تخصیص کیوں، ہمارے کس بڑے غزل گو پر یہ الزام عائد نہیں ہوسکتا؟ لیکن یہ نزلہ بھی داغ ہی پر گرتا تھا۔ بقول داغ

بات کیا چاہیے جب مفت کی حجت ٹھہری

اس گنہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

داغ کا بچپن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں دلّی کے لال قلعے اور رام پور میں گزرا۔ شاہی ماحول نے ان کے مزاج کو بھی متاثر کیا ہوگا۔ ان کی والدہ کا جو حال احوال ہم تک پہنچا ہے اس نے بھی داغ کے مزاج کی تشکیل و تعمیر میں کچھ نہ کچھ رول ادا کیا ہوگا۔ شہزادوں کی مصاحبت اور صوفی کی صحبت میں فرق ہے۔ داغ شہزادوں کے مصحوب تھے۔ بے پناہ ذہانت اور طباعی کے مالک تھے۔ بذلہ سنجی اور شوخی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی لیکن ریاکاری اور تصنع سے عاری طبیعت پائی تھی۔ اس لیے جو ہے زندگی اپنی وہی ہے شاعری اپنی ان کا تخلیقی دستور العمل رہا۔ ان کی عاشقی، جسے عیاشی کہا گیا، ذہنی تعیش نہیں بلکہ ایک صحت مند مرد کی تندرست عاشقی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی عاشقی ہے جسے اپنے مردانہ وقار کا احساس بھی ہے اور ادراک بھی۔ یہ شخص اپنے اس احساس کا اظہار بے باکانہ اور بے تکلفانہ کرتا ہے۔ وہ حسن کا پرستار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا طلب گار بھی ہے۔ لیکن وہ وصل کی دریوزہ گری نہیں کرتا۔ اگر وہ معشوق کی معصومیت، شوخی اور چلبلے پن کا بیان کرتا ہے تو اپنی مردانہ طلب اور اعتماد کا ذکر بھی کرتا ہے۔ ان کے عشق میں کڑھن اور رونا جھینکنا نہیں ہے۔ وہ عشق میں کامیاب ہیں۔ ان کی یہ کامیابی ناکام معاشرے کے لیے نئی ہے اور اس کامرانی کا اظہار مخرب الاخلاق۔ پھر داغ تو ڈانٹ ڈپٹ کا جواب بھی بغیر لاگ لپیٹ کے دیتے ہیں۔

دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں
رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں

داغ سے پہلے اظہار کا یہ انداز اگر کہیں ہے تو مومن کے یہاں۔ ورنہ عاشق کا ایسا لب و لہجہ تو ہمارے یہاں معیوب ہے۔ معشوق سے اس طرح بات تھوڑے کی جاتی ہے لیکن داغ تو ترکی بہ ترکی جواب دینے والے ٹھہرے۔ تصنع اور تکلف سے ان کے عشق کا کیا تعلق؟ اس طرح کیا یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ داغ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شعری روایت اور سماجی معمولات کی دیواریں منہدم کی ہیں۔ سماج میں عورت کی وہ حیثیت کبھی نہیں رہی جو شاعری میں نظر آتی ہے۔ شاعری میں

عورت کو جو معنوی وقار، احترام، ادب، مرتبہ وغیرہ حاصل ہے سماج میں اس کا شائبہ تک نہیں۔ شاعری کی دنیا میں جہاں مرد معشوق کے پیر کی جوتی بلکہ جوتی کی خاک اور جوتی بھی ایسے تنک مزاج کی جو" واہ سر چڑھنے لگی پیروں کی ٹھکرائی ہوئی" کہتے نہیں تھکتا وہاں اصلی زندگی میں سب کچھ الٹا ہے۔ داغ نے شاعری کی حد تک ہی سہی ظالم و جابر، خودسر و خود بیں، بے حیا و بے وفا شعری معشوق سے برابری کا سلوک کیا ہے۔ داغ نے معشوق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات ہی نہیں کی بلکہ اپنی غیرت وخودداری کا اظہار بھی کیا:

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی
کوئی کھنچا کھنچے، کوئی ہم سے ملا ملے

آتے ہی کیوں پیام ہے جانے کا، جائیے
گر آپ کو ہے کام تو مجھ کو بھی کام ہے

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں

داغ نے معشوق سے شکوہ بھی کیا ہے لیکن اس میں بھی لہجہ بدلا ہوا ہے۔ یہ عاجزی نہیں ناراضی ہے طنز ہے۔

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

تمھاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی

تمام رات کہیں ہو، کہیں ہو سارے دن
وفا کریں گے، نبھائیں گے، بات مانیں گے
تمھیں بھی یاد ہے کچھ یہ کلام کس کا تھا

بات صرف اتنی سی ہے کہ داغ کامیاب عاشق ہیں اور عشق میں اپنی اس کامیابی کا وہ بے باکانہ اظہار بھی کرتے ہیں۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ داغ سیاہ فام تھے لیکن وہ معشوق فریب بھی تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت شہزادوں جیسی ہوئی۔ ہندوستان کے ولی عہد مرزا فخرو کی سرپرستی انھیں میسّر ہوئی۔ آخری تاجدارِ ہند نے ان کے کلام کی تعریف وتحسین کی تھی مرزا فخرو ہی کے سبب سہی، وہ ذوق کے منظورِ نظر شاگرد تھے اور ذوق بادشاہ کے استاد تھے ان سب باتوں کے علاوہ ایک اہم بات یہ تھی کہ داغ کو کم عمری میں جو مقبولیت مل گئی تھی وہ لوگوں کو حینِ حیات میں بھی نہیں ملتی۔ ان تمام باتوں نے اگر داغ کو محسود بنا دیا ہو تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں ناکام لوگوں کی تعداد کامیاب لوگوں کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ ہمارا معاشرہ بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ سیاسی وجوہ نے محرومی ومحزونی میں اور اضافہ کردیا۔ ایسے میں کامیابی سے کوفت اور کامران سے حسد کوئی ان ہونی بات نہیں۔ داغ کے نجیب الطرفین ہونے میں شک کیا گیا تو اسی حسد کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگوں نے یہ تک کہہ دیا کہ داغ کی شہرت کا باعث ''گلزارِ داغ'' کا بہترین حصہ ان کی تصنیف ہی نہیں ہے۔ یہ تو شیخ ابراہیم ذوق کا نتیجۂ فکر ہے۔ حسد کو حقیقت نظر نہیں آتی۔ تنگیر حاسد کی طبیعت کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔

معلوم نہیں دتی کی مستند زبان سے کیا مراد ہے۔ داغ کی ولادت چاندنی چوک میں ہوئی۔ بچپن لال قلعے میں بیتا۔ ذوق کی شاگردی کی، مرزا غالب کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے ساتھ شطرنج کی بساط بچھائی۔ غرض کہ عمر کے تقریباً تیس برس دتی کے مشاہیر سے مستفیض ہوئے۔ اس کے باوجود ان کی زبان دلی کی مستند زبان نہیں تو پھر کس کی زبان دلی کی مستند زبان ہے۔

نثار علی شہرت لکھتے ہیں کہ جب انھوں نے غالب سے استفسار کیا کہ داغ کی اردو کیسی ہے؟ تو غالب نے فرمایا کہ ''ایسی عمدہ کہ کیا کسی کی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ نہ صرف

پال رہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے۔'' کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں'' اس بیان کے آخری الفاظ غالب کے نہیں ہیں البتہ مفہوم غالب ہی کے بیان کا ہوسکتا ہے جسے شہرت نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ تاہم زبان کے متعلق داغ کی خدمت کا صحیح اعتراف ہے اور یہ اعتراف غالب کی زبان سے ہوتو اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔(3) رضا صاحب نے مندرجہ بالا بیان کے آخری الفاظ پر شبہ کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے مفہوم کو تو مشکوک نہیں مانا ہے نہ؟

''دلّی کا دبستانِ شاعری'' کے مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''داغ ذوق کے شاگرد ہیں پھر بھی ان کی زبان میں وہ بے قیدی یا بے قاعدگی نہیں ہے جو ناسخ کے اصول کے مطابق ذوق کے یہاں نظر آتی ہے ... ذوق کے یہاں مضمون اعلیٰ ہے۔ داغ کے یہاں روانی اور زبان کی خوبی زیادہ ہے یعنی (داغ) ذوق سے فصیح تر ہے۔''(4)

اپنی بات کی وضاحت میں ڈاکٹر ہاشمی لکھتے ہیں:

''دہلی کی زبان داغ کے یہاں سب سے زیادہ صاف بامحاورہ باقاعدہ اور سلیس نظر آتی ہے اس میں دہلی کا روزمرّہ بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اصول بھی ہیں جو لکھنؤ میں وضع ہوئے اور رام پور میں دونوں جگہ کے کاملین فن کے اجتماع کے باعث ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے۔ امیر نے داغ کا رنگ ومعانی کا اثر لیا تو داغ نے امیر جلال کی بندشوں کی خوبی اور ترکیبوں کی خوش نمائی کو اپنی فصاحت میں سمویا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان میں وہ نکھار پیدا ہوا جو دہلی یا لکھنؤ کے کسی استاد کو ان کے زمانے میں حاصل نہ ہوا۔''(5)

داغ کی زبان اگر اس لیے مستند نہیں ہے کہ ان کے یہاں دلّی کا روزمرہ اور لکھنؤ کے اصول ملتے ہیں تو اس کا جواب مرزا غالب کا وہ خط ہے جو انھوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا تھا۔ غالب نے یہ خط 23 مئی 1861 کو لکھا تھا۔ لکھا ہے:

''ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی

رہی، باقی ہر فن کے لوگ موجود ہیں۔'' (6)

یعنی اگر اس بنا پر داغ کی زبان مستند نہیں ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے کچھ اصول مان لیے تو کیا غضب کیا؟ 1861 میں تو مرزا غالب بھی دلی کی زبان کو مشتبہ مانتے ہیں۔ حالی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں'' دلی میں ذوق ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت اور صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے۔'' ان اور ایسی دوسری شہادتوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ داغ کی تخلیقی طبعیت میں انتخاب وانجذاب کا عنصر تھا، جسے اعتراف وانحراف کے عمل نے خوب چمکایا۔ انھوں نے لکھنؤ کے اہلِ کمال کی قابلِ قبول باتوں کو اپنے یہاں رواج دیا لیکن دلی کی مستحسن باتوں سے دستبردار بھی نہیں ہوئے۔ صرف ایک مثال تذکیر و تانیث کے باب میں ملاحظہ ہو۔ احسن مارہروی نے داغ کے اس شعر۔

نہیں ملتا کسی مضموں سے ہمارا مضموں
طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں

کے متعلق استفسار کیا کہ'' آفتاب داغ'' میں یہ شعر طرز کی تذکیر کے ساتھ موجود ہے۔ جب کہ آپ کے ارشاد اور استعمال کی رو سے اسے تانیث ہونا چاہیے۔ اگر یہ کاتب کی غلطی نہیں ہے تو یہ بات ہم لوگوں کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ خواہ مونث لکھیں خواہ مذکر۔ داغ کا جواب ہے'' یہ لکھنؤ والوں نے اصلاح دے کر چھاپا ہوگا۔ میں نے اس وقت'' آفتابِ داغ'' دیکھا، طرز مونث ہے ہرگز مذکر نہیں۔ (7)'' غیرہ یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ داغ کی یہ روش ایک سچے فن کار کی روش تھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے فراق کے حوالے سے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

'' داغ کی شاعری میں جو بے تکلفی اور بے ساختگی اور ہلکی پھلکی کیفیتوں کی سچی ترجمانی ہے اس کی بنا پر داغ کی شاعری پر شعرائے لکھنؤ کی طرح کہیں تصنع بناوٹ یا کرتب کا گمان نہیں گزرتا۔ ایک طرح سے لکھنؤ کی شاعری اپنی نکھری ہوئی شکل میں داغ کے یہاں ملتی ہے۔ داغ کی شاعری لکھنؤ کی اصلاح زبان والی تحریک کا ایک خوش گوار نمونہ ہے اور غالباً اس تحریک کا آخری باب۔'' (8)

داغ کے باب میں، چکبست لکھنوی کی اس بات سے تو انکار ممکن نہیں ہے کہ ''کسی شاعر کا عام فہم ہونا اس کے کمالِ شاعری پر دلالت نہیں کرتا۔'' (9) لیکن عام فہم ہونا کوئی ایسا عیب بھی تو نہیں ہے کہ جس کے سبب کسی شاعر کے شعری اوصاف پر خاک ڈال دی جائے۔ جس طرح عام فہم ہونا کمالِ شاعری پر دلالت نہیں کرتا اسی طرح عام فہم نہ ہونا بھی کمالِ شاعری کی بنیادی شرط کب ہوئی؟ ہماری شعریات میں کثیر المعنویت کمالِ شاعری ہے مگر عام فہم ہونا کثیر المعنویت میں مانع ہرگز نہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں ایسے متعدد شعرا موجود ہیں جن کی شاعری عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر المعنویت کے وصف سے بھی مالا مال ہے۔ اردو میں میر عام فہم اور سادہ گو شاعر مانے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ع: کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے۔ سچی بات یہ ہے کہ عام فہم شاعری میں الفاظ کا انسلاک ع: دھوکا دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا کے مصداق ہوتا ہے۔ کبیر ہمارے سامنے ہیں۔ دراصل شاعری کا عام فہم ہونا یا نہ ہونا اس کے اضافی اوصاف میں شامل ہے اس کے بنیادی اوصاف میں نہیں۔

یہ ماننا کہ داغ پر مندرجہ بالا قسم کے اعتراضات کرنے والوں کو ان باتوں کا ادراک نہیں تھا غلط بھی ہوگا اور ان بزرگوں کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں ان کا جذبہ ان کی عقل کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

داغ کے زمانے میں شاعری کا معیار زبان، محاورہ، روزمرہ، عروض وغیرہ ہی تھا اس لیے داغ پر جو اعتراضات کیے گئے وہ بھی زبان و بیان ہی سے متعلق تھے۔ اگر ان میں سے چند پر بھی گفتگو کی جائے تو دفتر درکار ہوگا۔ اس لیے صرف ایک حرف حصر یعنی ہی پر بات کرتے ہیں اور اس اعتراض کی حقیقت دیکھتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی اپنی کتاب ''نکاتِ سخن'' کے باب دوم ''معائبِ سخن'' میں لکھتے ہیں:

''ہی حرفِ حصر کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ اس کو اس لفظ کے بعد ہی بلا فصل استعمال کرنا چاہیے جس پر زور دینا منظور ہو۔ مگر آج کل اہلِ پنجاب عموماً اور کبھی کبھی اہلِ دہلی اس کے خلاف بھی لکھ جاتے ہیں مثلاً داغ۔

اس میں ہی کوئی وصل کی صورت نکل آتی
عکس آپ کا آئینے سے باہر نہیں ملتا

ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گزاری تمام رات☆
تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا

''پہلے شعر میں ہی کو اس کے بعد ہونا چاہیے تھا یعنی ''اس ہی'' جس کو اردو زبان میں اسی کہتے ہیں...... دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں بھی ''تم نے ہی'' کے بجائے تم ہی نے یا تمھیں نے ہونا چاہیے جیسا کہ پہلے مصرع میں موجود ہے۔''

آگے بڑھنے سے پہلے مومن کا یہ شعر دیکھ لیں۔

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

اس قسم کی تنقید کا پہلا وصف یہ ہے کہ وہ یہ مان کر چلتی ہے کہ شاعر کی ہر غلطی کم علمی پر مبنی ہے۔ جب داغ کے پہلے مصرع میں ''تمھیں'' موجود ہے تب یہ تو ہمیں ماننا ہی چاہیے کہ داغ کو تمھیں لفظ کی حقیقت معلوم ہے۔ اس کے باوجود جب دوسرے مصرعے میں ''تم نے ہی'' لکھا ہے۔ تو کیوں لکھا ہے؟ تقریباً دو ہزار شاگردوں کے استاد کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ دوسرے مصرع میں مولانا کی منشا کے مطابق یا قاعدے کے مطابق تمھیں نظم کر دیتا پھر داغ نے انگنت مقامات پر تمھیں، ہمیں، اسی وغیرہ لکھے ہیں۔

خیر، آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ علامہ نظم طباطبائی کا اس باب میں کیا خیال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہی کا استعمال اہلِ دہلی اس طرح ہی کرتے ہیں کہ حرفِ معنویہ کے بعد اسے لے آتے ہیں مثلاً ہم نے ہی لکھا۔ تم نے ہی لکھا۔ اس نے ہی سنا اہلِ لکھنؤ ہمیشہ ہی کو مقدم کر کے کہتے ہیں۔ ہمیں نے

لکھا۔ تمھیں نے سنا.....مثلاً وہ کہیں گے دل کی دل میں ہی رہی اور یہ کہیں گے دل کی دل ہی میں رہی۔"(10)

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ دہلی کے کلام میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں:

ع ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب (غالب)

ع ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں (مومن)

(بجائے مجھی سے)

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات

پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے (مومن)

یہ بات صحیح ہے کہ اہلِ لکھنؤ ہم نے ہی، تم نے ہی کے بجائے ہمیں نے، تمھیں نے لکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی غلط نہیں کہ ہم ہی اور تم ہی کے بجائے ہمیں اور تمھیں اہلِ لکھنؤ کے نزدیک فصیح ہے لیکن اہلِ دہلی کے کلام میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ جب میر، غالب، ذوق، ظفر، مومن کے یہاں ایسی مثالیں موجود ہوں تب یہ کہنا کہ ہی کا یہ استعمال غلط ہے، نامناسب ہے۔ بعض اوقات تو اہلِ لکھنؤ بھی ہمیں کے بجائے ہم ہی کو فصیح جانتے ہیں۔ غالب کے اس شعر۔

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

کے باب میں مولوی عبدالباری آسی الدنی "مکمل شرح دیوانِ غالب" میں لکھتے ہیں "اگرچہ بجائے ہم ہی کے ہمیں لکھنا فصیح ہے مگر اس جگہ ہم ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔"(11)

دراصل اس قسم کے تمام اعتراضات اسکولی امتیازات کی دین ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے سید رفیق مارہروی کی کتاب "زبانِ داغ" میں داغ کے خطوط امیر مینائی کے نام ملاحظہ ہوں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے موقع نہیں کہ جس طرح انیس اور دبیر ایک دوسرے کا احترام اور حفظِ مراتب کا خیال رکھتے تھے اسی طرح داغ اور امیر مینائی بھی ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن جس طرح

اعیسے اور دبیر یے ایک دوسرے سے موقع بے موقع الجھتے رہتے تھے اسی طرح داغ اور امیر کے شاگرد بھی الجھتے رہتے تھے اور داغ کی کامرانیوں سے جلنے بھننے لوگ ان جھگڑوں کو ہوا دیتے تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، داغ کے زمانے میں جس شعری روایت کو مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ''کیا کہا'' کو نہیں ''کیسے کہا'' کو اساسی اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے ایسے میں چستی بندش، روانی، محاورے کی صفائی وغیرہ ہی شعر کی پرکھ کے معیار تھے۔ ایسے میں کسی شاعر کا رنگ بھی اس کے کہنے کے انداز ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ داغ کے رنگِ سخن کی تفہیم کے لیے مندرجۂ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شمع و گل و پروانہ و بلبل ہمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن (حافظ)

پروانہ پاس شمع کے، بلبل ہے گل کے پاس
اک میں کہ تیری بزم میں خلوت گزیدہ ہوں (داغ)

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند (حافظ)

کچھ سعی سے اقبال میسّر نہیں ہوتا
ہر آئینہ گر داغ سکندر نہیں ہوتا (داغ)

بارش کی علامت ہے کہ ہو جائے ہوا بند
ہوتی ہے ہوا تیز تو بارش نہیں ہوتی (ناسخ)

دم رکتے ہی سینے سے نکل پڑتے ہیں آنسو
بارش کی علامت ہے جو ہوتی ہے ہوا بند (داغ)

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی (مومن)

مر گئے ہم تو وضعداری میں
دوستی کی تباہ نے مارا (داغ)

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو (میر)

مٹی کی مورت اس سے تو اے داغ خوب ہے
معشوق کیا جو شوخ نہ ہو خوش گلو نہ ہو (داغ)

سب گئے دل دماغ و تاب و تواں
میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں (میر)

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا (داغ)

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا (مومن)

گیا رقیب کے گھر بارہا شب وعدہ
بہت ذلیل مجھے تیری جستجو نے کیا (داغ)

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میر)

یہاں آئے ہیں جانے کے لیے ہم
یہ ہستی پہلی منزل ہے عدم کی (داغ)

قسمت کی خوبی دیکھو کبوتر کا گر پڑا
وہ پر کہ جس میں تھا مرا نامہ بندھا ہوا (میر)

وائے ناکامی کہ جس میں ہم نے باندھا خطِ شوق
وہ ہی مرغ نامہ بر کا نوٹ کر شہپر گرا (داغ)

وہ بولے دیکھ کر تصویرِ یوسف
سنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا (ذوق)

اس نے حیرت سے کہا دیکھی جو لیلیٰ کی شبیہ
قیس دیوانہ ہوا تھا اس بلا کو دیکھ کر (داغ)

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا (غالب)

آپ کی جنبشِ لب نے تو کیا کام تمام
اسی اعجاز پہ کہتے ہو مسیحا ہوں میں (داغ)

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا (غالب)

خدا جانے فلک کو داغ مجھ سے کیا عداوت ہے
کسی فن میں نہ لائق ہوں نہ فائق ہوں نہ کامل ہوں (داغ)

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)

جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے مے کدے کو ہم
آتے ہوئے اُدھر سے کئی پارسا ملے (داغ)

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے (غالب)

ساعتِ وصل کے لیے ہم داغ

پوچھتے رہتے ہیں برہمن سے (داغ)

کیا ان امثال سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ داغ نے مروّج مضامین اور مشہور موضوعات کو بالکل اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ مثلاً حافظ جہاں بیا او رحم بہ تنہائی ما کن لکھتے ہیں داغ وہاں صرف خلوت گزیدہ کہہ کر سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ حافظ کے شعر میں تنہائی کی شدت ہے یعنی راوی بالکل اکیلا۔ یک و تنہا ہے اور تنہائی کے اس احساس کو شمع و پروانہ اور گل و بلبل کا ساتھ ہونا بڑھاتا ہے۔ داغ بزم میں ہے اور خلوت گزیدہ ہے۔ حافظ رحم کے طلب گار ہیں۔ داغ کے یہاں طنز ملیح ہے۔ اسی طرح ذوق کے شعر میں وہ (معشوق) یوسف کی تصویر دیکھ کر کہتا ہے کہ ع: سنا جیسا اسے ویسا نہ پایا لیکن داغ کے یہاں پہلے مصرع میں حیرت کا لفظ ہے تو دوسرا مصرع اس حیرت کی تفسیر ع: قیس دیوانہ ہوا تھا اس بلا کو دیکھ کر۔ اس بلا کو دیکھ کر میں جو تحقیر، طنز اور نسوانی رشک و حسد کے جذبے کا اظہار ہے کیا وہ داغ کی انفرادیت کو اجاگر نہیں کرتا؟ داغ کا معشوق تو یہ ہے۔

سن کے اللہ کی تعریف کہا اس بت نے

تو نے ہم میں تو کوئی عیب نکالا ہوتا

وہ اگر لیلیٰ کو حقارت سے ''اس بلا'' کہہ کر حیرت کا اظہار کرتے تو تعجب کیسا؟ داغ کی شوخی، چلبلا پن اور معشوق سے منہ زوری جرأت سے مشابہت رکھتی ہو کہ مومن سے مماثلت، ہے وہ داغ ہی کی۔ طبیعت کو مزاج اور مزاج کو محاورے کے سہارے معیار بنانے کا جو ہنر داغ کو ملا وہ اردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ داغ بڑے شاعر ہوں کہ نہ ہوں ان کی مطابقت ان کے اسی وصف کے سبب ہمیشہ بنی رہے گی۔ بین المتونیت کا مطلب اتنا بھر نہیں ہوتا کہ پہلے سے کہے ہوئے موضوع کو مروّج و معاصر شعری محاورے میں نظم کر دیا جائے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ ایسی آمیزش کی جائے کہ اس سے موضوع مذکور کے مخفی گوشے بھی منور ہو جائیں۔ اردو کا رثائی ادب اس کی بہترین مثال ہے تو سنسکرت کے بالمیکی اور تلسی داس اس کی دوسری مثال۔

اس ضمن میں ایک بات اور عرض کرنا چاہوں گا۔ اردو غزل میں دشنام اور گالیوں پر انیک شعر موجود ہیں اور سب نے اپنے اپنے انداز سے اس مضمون کو باندھا ہے۔ ہم یہاں تین اشعار دیکھتے ہیں:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا (غالب)

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نشیں نزاکت آواز دیکھنا (مومن)

ہم آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتے ہیں گالیاں
کانوں کو پڑ گیا ہے مزہ کوئی کچھ کہے (داغ)

غالب کے شعر میں گالیاں رقیب کو مل رہی ہیں لیکن وہ بے مزہ نہیں ہو رہا ہے اور اس کا سبب ہے معشوق کے لب کی شیرینی۔ مومن کے یہاں دشنامِ یار دکھی دل پر اس لیے گراں نہیں گزرتی کہ وہاں آواز کی نزاکت ہے۔ مومن اور داغ دونوں آواز کے عاشق ہیں۔ غالب لب کی شیرینی کے۔ مومن اپنے ایک مشہورِ زمانہ شعر میں معشوق کو غیرتِ ناہید تو کہتے ہیں لیکن مخاطب کو متوجہ آواز کی طرف ہی کرتے ہیں۔ داغ بھی خوش گلو معشوق کو پسند کرتے ہیں (جس کی مثال میر کے شعر سے تقابل کرتے وقت آ گئی ہے) مومن اور داغ دونوں میں فرق یہ ہے کہ داغ چھیڑ چھاڑ کر کے آواز گالیوں کے روپ میں اس لیے سن رہے ہیں کہ کانوں کو مزہ پڑ گیا ہے۔ یہ مزہ آواز کا کم گالیوں کا زیادہ ہے۔ اس وقت بحث اعلیٰ و ادنیٰ کی نہیں نہ اخلاق و اقدار معرضِ بحث میں ہے۔ بحث ہے شعری روایت میں رہتے ہوئے مزاج کے تفرّق کی۔ بات صرف اتنی ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کا مطالعہ اسی مذاق و معیار کے پیشِ نظر کرنا چاہیے۔ جس کی مدد سے اس نے شعر سازی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ اور ماحول اس میں شامل ہے۔

داغ نے اپنی زبان پر ہمیشہ ناز کیا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ان کے حریف کم نہ تھے لیکن انھوں نے اپنی روش کو کبھی ترک نہیں کیا۔ وہ لوگ جو غالب کے مندرجہ ذیل شعر

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگور از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب اپنے اردو کلام کو ہیچ یا پوچ خیال کرتے تھے صحیح نہیں ہیں اس میں چھیڑ کا عنصر غالب ہے۔ غالبؔ اپنے اردو کلام کو ''رشکِ فارسی'' سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے تھے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

داغ اس امر میں رانی کیتکی والے انشا کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

کہتے ہیں اسے زبانِ اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

لکھنؤ کے عمائد و اراکین کو جس میر نے یہ کہہ کر شعر سنانے سے انکار کر دیا تھا کہ ''میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہلِ اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم ہیں'' وہی میر داغ کے آدرش ہیں۔ داغ کہتے ہیں۔

مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

میر کہتے ہیں۔

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے

تو داغ کہتے ہیں۔

کیوں داغ دہلوی کی زباں مستند نہ ہو
پیدا کیا خدا نے اسے تخت گاہ میں

تخت گاہ میں پیدا ہوتا تو ''دریائے لطافت'' سے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' تک فخر و مباہات کی بات رہی ہے تو داغ کا یہ کہنا غلط کیسے ہو سکتا ہے۔

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زباں نہیں

اس زمانے کے اکثر شعرا کے آدرش حافظ شیرازی رہے ہیں۔ داغ بھی طرزِ حافظ کا مقلد ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

اے داغ مقلد ہیں اسی طرز کے ہم بھی
ہر شعر میں ہو بلبلِ شیراز کا انداز

لیکن ان کا شعری رویہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اردو کو منفرد زبان مانتے تھے اور اس پر دوسری زبان کی تقلید یا تتبع کو فرض نہیں گردانتے۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اہلِ عجم کے سر پر اہلِ زبان کا تاج مان کر اردو کو ان کے آگے خود سپرد نہیں کیا۔ ان کے نزدیک محاورۂ اہلِ اردو ہی معتبر و مستند تھا۔ وہ شرفا کے خاندان کو، قلعۂ معلیٰ کے بعد، زبان کے معاملے میں سب سے زیادہ مستند مانتے تھے۔ داغ کی بیوی کے انتقال پر امیر مینائی تعزیت کا خط لکھتے ہیں۔ اس کے جواب میں مرزا داغ کا یہ قول ملاحظہ ہو:

"مرحومہ زبان اردو پر بہت قابض تھیں، اکثر محاوروں میں مجھ کو مدد ملتی تھی۔" (13)

اس میں اہل عجم کی ہتک نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بلبلِ شیراز کا انداز اختیار کرنے کی کیا مجبوری ہو سکتی ہے ہاں یہ اپنی زبان پر اعتماد اور اس کی خود مختاری کا اعلان ضرور ہے۔ داغ کی اس روش کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا۔ چنانچہ ان کے شاگرد بیخود دہلوی کہتے ہیں۔

بولنی آ گئی جسے اردو
سامنے اس کے فارسی کیا ہے

داغ نے اپنی اس روش سے نہ صرف یہ کہ اردو کی انفرادیت پر اصرار کیا بلکہ اسے اعتماد بھی عطا کیا۔ کیا داغ کی یہ دین ان کی مطابقت کو مستحکم نہیں کرتی؟ مختلف و مخالف تحفظات و تعصبات کے سبب ہم نے داغ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ اپنی ادبی روایتوں کی تفہیم کے لیے تلاش و تجسس ناگزیر عمل ہے اور داغ کی تفتیش اور تخلیقی تفحص کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

●

حواشی

1۔ یادگارِ غالب: الطاف حسین حالی ص، 83، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی دوسرا عکسی ایڈیشن 1996

2۔ فکروفن: خلیل الرحمٰن اعظمی ص، 112 آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی باراوّل 1956

3۔ جہاں استاد داغ دہلوی: کالی داس گپتا رضا ص، 145 اسباق پبلی کیشنز پونہ (مہاراشٹر) 1997

4۔ دتی کا دبستانِ شاعری: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: ص، 9-408 ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ 1971

5۔ ایضاً ص، 411

6۔ غالب کے خطوط: جلد دوم: خلیق انجم ص، 524 غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1985

7۔ زبانِ داغ: سید رفیق مارہروی: ص، 43: نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ سنہ اشاعت ندارد و پیش لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1956 ہوگا۔

8۔ فکروفن: خلیل الرحمٰن اعظمی: ص، 111

9۔ مضامینِ چکبست: ص، 78 انڈین پریس (پبلی کیشن) لمٹیڈ الہ آباد ص۔ 1955

10۔ نکاتِ سخن: سید فضل الحسن حسرت موہانی ص، 119 انتظامی پریس، حیدرآباد اشاعت کا سال ندارد

11۔ مقالاتِ طباطبائی: مرتب ڈاکٹر اشرف رفیع ص، 220 چھتہ بازار، حیدرآباد: 1984

12۔ مکمل شرح دیوانِ غالب: مولوی عبدالباری آسی الدنی ص، 80 صدیق بک ڈپو لکھنؤ باراوّل ۔ سنہ اشاعت ندارد۔

13۔ زبانِ داغ: سید رفیق مارہروی ص، 117

☆ انتخاب کلامِ داغ مرتب ڈاکٹر محمد عقیل اور انتخاب غزلیات داغ مرتبہ: قاضی جمال حسین میں مصرع اوّل یوں ہے۔
بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمھیں۔

☆ داغ کا مصرع ہے ع: "ہاں ہاں" تڑپ تڑپ کے گزاری تمھیں نے رات" تمام رات کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

• • •

Kalla's Street
Jodhpur
(Rajasthan)

آفتاب احمد آفاقی

داغ کی شاعری

داغ اردو کے ان نامور شعرا میں ہیں جن کی جگہ اردو کی ادبی تاریخ میں محفوظ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اردو کے صاحب طرز اور نمائندہ شعرا کی کوئی فہرست مرتب کی جائے اور اس میں داغ کا نام شامل نہ ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ داغ امیر مینائی کے ساتھ مل کر اردو کی ادبی تاریخ کا ایک نیا باب مرتب کرتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ولی و سراج، میر و میرزا، مصحفی و انشا، آتش و ناسخ اور غالب و مومن اردو شاعری کے مختلف ادوار و ابواب کی نمائندگی کرتے اور اپنے علاحدہ رجحان اور طرز و اسلوب سے پہچانے جاتے ہیں۔

عام طور پر داغ کو دبستان دہلی کا آخری شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان پر صرف دہلویت کا لیبل چسپاں کر کے ان کی تفہیم اور قدر شناسی ممکن نہیں۔ داغ صرف دہلویت کے ترجمان نہیں کہے جا سکتے بلکہ حقیقتاً اردو کی اس شعری روایت کے ورثہ دار تھے جس کا ولی اور امیر و میرزا سے لے کر داغ تک مسلسل ارتقا ہوا جس میں دہلویت اور لکھنویت یا دوسرے لفظوں میں داخلیت اور خارجیت دونوں عناصر شامل ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو غزل میں ادا بندی کی باضابطہ ابتدا میر سوز سے ہوئی جو جعفر علی حسرت، جرات، انشا اور رنگین سے ہوتی ہوئی داغ تک پہنچی۔ میر سوز کے اس طرز شاعری کی وجہ سے انھیں لکھنوی رنگ کا بانی اور پیش رو بھی کہا جاتا ہے حالانکہ ان کا تعلق دہلی سے تھا۔ داغ کی شاعری جو معاملہ بندی پر مبنی ہے۔ اردو شاعری اور غزل کی وسیع تر روایت کے چوکھٹے ہی میں رکھ کر دیکھی جا سکتی ہے ورنہ اس کی جو بھی تعبیر کی جائے گی وہ یک رخی اور غلط ہوگی۔ داغ کی شاعری جس رنگ میں ابھری ہے اس میں اردو شاعری اور غزل کی پوری روایت کا عکس دیکھا جا سکتا ہے جو اس کے تخلیقی مزاج اور عمل میں تحلیل ہو کر ایک نئے اور منفرد

انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔

داغ کی شاعری ان کی شخصیت اور معاصر عہد کی تصویر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ داغ کا کلام ان کی آپ بیتی اور جگ بیتی کی یکجائی سے پیدا ہونے والی کیفیات کی روداد ہے جسے شاعر نے خوبصورتی سے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حسن پرستی اور شاہد پرستی داغ کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ وہ عیش و نشاط کے خوگر اور خوبصورت چہروں کے رسیا اور نغمہ و موسیقی کے دلدادہ تھے۔ وہ خود کہتے ہیں'' رات دن عیش ہے جلووں میں بسر کرتے ہیں'' ایک جگہ لکھتے ہیں'' جس شخص کی گھٹی میں حسن پرستی اور نغمہ پرستی ہو وہ کس طرح قید و بند کی زندگی کو برداشت کر سکتا ہے (1)۔'' انھوں نے اپنے متعدد خطوط میں اپنی عاشق مزاجی، حسن پرستی اور نغمہ و موسیقی سے اپنی والہانہ دلچسپی اور دل لگی اور یار باشی کی طرف اپنے فطری میلان کا اظہار کیا ہے۔ ایک موقع پر اپنے شاگرد بے خود دہلوی سے یوں گویا ہوتے ہیں۔'' تُو تو جانتا ہے کہ حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں'' (2) ایک دوسری جگہ اسی کیفیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں'' جو عاشق مزاج ازلی ہو جو حسن و جمال دیکھ کر جیتا ہو، اس سے یہ نہ پوچھیے کہ حجاب (3) کے لیے کتنا اشتیاق اپنے دل میں رکھتا ہے (4)۔ ان کے یہ فقرے تو اس پر مستزاد ہیں'' میری عاشق مزاجی کا شاہد واقعی میرا کلام ہے۔ جب معشوق سامنے ہوتا ہے تو سو (100) سرور حاصل ہوتے ہیں، مجھ کو شراب پینے کی ضرورت نہیں (5)۔'' صاف ظاہر ہے کہ داغ کا کلام ان کے اسی مزاج اور میلان طبع کا اظہار ہے۔ داغ کی زندگی اور عہد جو بھی تھا اب اس پر کوئی پردہ نہیں رہ گیا ہے۔ احسن مارہروی اور ان کے صاحب زادے رفیق مارہروی نے ان کے خطوط اور چشم دید واقعات یادداشتوں کی شکل میں شائع کر کے ان کے متعلق بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کا موقع فراہم کر دیا ہے اور اس کی روشنی میں داغ کی شاعری کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔ داغ کی ادبی اور ذہنی نشو و نما جس طرح ہوئی اس نے ان کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی ساخت پرداخت لال قلعہ کے رنگین اور عیش پرور ماحول میں ہوئی۔ یہیں انھوں نے شعر گوئی کے آداب سیکھے اور ان کے ذہن و مزاج کی مخصوص انداز میں اٹھان

ہوئی۔ پھر رام پور اور حیدر آباد میں عیش و فراغت کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملا اور ان کی رنگین مزاجی ان کی شخصیت اور سیرت کا جزو بن گئی۔ ناقدین نے ان کی شاعری کے اس پہلو کو بالخصوص سامنے رکھا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور احتشام حسین نے داغ کی شاعری میں چلبلا پن، چھیڑ چھاڑ، مزاح اور طبیعت کی شوخی پر لال قلعہ کی رنگین فضا کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ افتخار عالم نے، جنھوں نے داغ کی زندگی کے واقعات ڈائری کی شکل میں مرتب کیے ہیں، انھیں چھوٹے پیانے پر واجد علی شاہ قرار دیا ہے (6)۔

داغ کے عہد میں جاگیردارانہ تہذیب و تمدن کے زیر اثر تعیش پسندی اور عیاشی و سرمستی کی طرف عام میلان تھا جس میں پورا معاشرہ مبتلا تھا۔ طوائفوں کو اس دور میں خاصی اہمیت حاصل تھی جو روٗسا کے لیے تفریح اور دلچسپی کا مرکز بن گئی تھیں اور ان کے بالا خانے ایسے ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے تھے جہاں تہذیبی اور مجلسی آداب سکھائے جاتے تھے اور شعر و سخن کے چرچے ہوتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری عورتیں حرم کی زینت بھی بنتی تھیں اور کسی محفل کا ارباب نشاط کے بغیر تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اس دور کا مخصوص تہذیبی انداز تھا۔ اس دور میں معاشرتی پابندیوں اور پردے کی رسم نے گھریلو عورتوں اور مردوں کے درمیان واضح حد فاصل قائم کر رکھا تھا۔ ایسی صورت میں جنسی دل بستگی اور تفریح و تعیش کے لیے طوائفوں کے گھر مخصوص کیے گئے اور ان سے وابستگی کو ایک لازمۂ زندگی جانے لگا۔ داغ کے یہاں جو معاملہ بندی اور شباب و سرمستی کی تصویریں ہیں اور حسن و محبت کی کیفیات کے اظہار میں جو شوخی اور بے حجابی ہے اس کو اس صورت حال سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اردو شاعری میں عاشق و معشوق کا یہ کردار ہمارے تہذیبی انحطاط کے دور میں ابھرا ہے۔ داغ کی غزل اسی تہذیبی انحطاط کی عکاس ہے اسی لیے ان کے یہاں عشق و عاشقی کی کیفیات کا اظہار بلند تر روحانی سطح پر نہ ہو سکا اور بعض ناقدین کو ان سے بجا طور پر شکایت پیدا ہوئی مثلاً آل احمد سرور کو یہ کہنا پڑا کہ داغ تغزل میں شائستگی کے معیار کو برقرار نہ رکھ سکے (7)۔ تاہم ان کے یہاں حسن و عشق کی واردات و کیفیات کے اظہار میں وہ بے اعتدالی نہیں جسے مصحفی نے چھنالے کی شاعری سے تعبیر کیا ہے جس کی

جھلک رنگین اور جرأت کے یہاں ملتی ہے۔ جرات نے اپنی غزلوں میں معشوق کو عورت کے روپ میں پیش کیا ہے جو ان کے یہاں پوری دلربائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ورنہ ان سے قبل غزل میں معشوق کی جنس واضح نہیں تھی۔ وہ بیک وقت مرد بھی تھا اور عورت بھی۔ میر نے عشق و محبت سے لبریز جذبات کی بڑی مؤثر تصویریں کھینچی ہیں مگر انھوں نے بھی معشوق کی جنس کی تخصیص نہیں کی۔ غالب کے محبوب کی باتوں میں صاف عبارت، اشارت اور ادا کی کارفرمائی ہے اور مومن اپنے محبوب کے پردہ نشیں ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ داغ کے یہاں محبوب کا تصور اسی پس منظر میں ابھرا ہے بہ ظاہر وہ جرأت کے رنگ کے شاعر نظر آتے ہیں۔ لیکن داغ کی معاملہ بندی جرأت کی معاملہ بندی سے مختلف ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی میں ذہنی عیاشی کی جھلک ملتی ہے جب کہ داغ کے یہاں یہ ذہنی آسودگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جرأت اور داغ کے معشوق میں بہت کچھ مماثلت پائی جانے کے باوجود دونوں کے کردار جداگانہ ہیں۔ جرأت محبوب کے لوازم حسن کا جس تفصیل سے تذکرہ کرتے اور بسا اوقات کھل کھیلنے لگتے ہیں، داغ اس سے اجتناب کرتے ہیں اور اس معاملے میں اجمالی اور ایمائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

کیوں تغافل ہم سے ہے چشم عداوت ہی سہی
کیا نگاہِ ناز میں اب قہر بھی کم ہو گیا

یہ ناز یہ نگاہ یہ چھلبل یہ شوخیاں
تم اس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں

کہتا ہوں تو رکتی ہے زباں سامنے اس کے
لکھتا ہوں اگر حال تو لکھا نہیں جاتا

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

ان کو بغیر چھیڑ کیے چین ہی نہیں　　　کتنی شریر طبع ہے کیا چلبلا مزاج

داغ کا محبوب اپنے مادی اور جسمانی وجود سے پہچانا جاتا ہے۔ داغ کے یہاں عاشق و معشوق کے درمیان جنسی رشتے کا واضح اعلان ہے، اس میں مومن کی طرح پردہ داری کی کیفیت نہیں ہے۔ پھر بھی داغ کے انداز میں رکھ رکھاؤ ضرور ہے اور یہیں جرأت اور داغ کا فرق نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ داغ کا معشوق اپنے بازاری پن کے باوجود پاس وضع کا خیال رکھتا ہے، اس کی شوخی اور البیلا پن اس کی شانِ محبوبی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ جرأت اپنے محبوب کو عریاں کر دیتے ہیں جبکہ داغ اپنے محبوب کے بیان میں ایمائیت کے پہلو کو برقرار رکھتے ہیں۔ داغ کے رنگ تغزل میں مومن کا نمایاں اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ وقار عظیم نے اس پر اپنے مضمون ''طرز داغ میں رنگ مومن کی جھلکیاں'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں مومن کا محبوب جس شکل میں سامنے آیا ہے وہ اردو شعرا کے روایتی محبوب سے یکسر مختلف ہے ان کا دعویٰ ہے کہ ''محبوب کے روایتی حسن کو چھوڑ کر شاعر اس کا ذکر اس انداز خاص سے کرتا ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن ہر لفظ میں صاف سنائی دیتی ہے(8)۔ مومن کا محبوب پردہ نشیں ہے جسے وہ بے حجاب کرنا نہیں چاہتے۔ داغ کے محبوب کا شیوہ اس کے برعکس ہے۔ داغ کے یہاں محبوب اور عاشق دونوں ایک خاص تمکنت کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ داغ کے عاشق و معشوق کے تیور ان اشعار میں علی الترتیب ملاحظہ ہوں ۔

اک نہ اک ہم لگا کے رکھتے ہیں　　　تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا

پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر　　　اک نئے آدمی سے ملنا تھا

مومن کا عاشق اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی بات نرم لہجے میں کہتا ہے اور محبوب کی شان بے نیازی کے مقابلے میں اس کے یہاں خود پسندی کا احساس کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ معشوق کو مطعون بھی نہیں کرتے۔ لیکن داغ کا انداز یہ ہے:

کہو کیا کروگے مرے وصل کی جو مشہور جھوٹی خبر ہو گئی

تجھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی

داغ کی مومن سے اثر پذیری مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے جن کی تفصیل کا موقع نہیں۔ تاہم مومن اور داغ کے درمیان اس فرق پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ مومن کی عاشقانہ شاعری میں جو ذہن کا عنصر ہے اس نے بہ قول خلیل الرحمٰن اعظمی ان کے شعری اظہار کو کلاسیکل وقار عطا کر دیا ہے جس سے جرأت اور داغ کی شاعری محروم ہے(9)۔

داغ کا اصل امتیاز یہ ہے کہ وہ زبان اور واردات عشق کے شاعر ہیں اور اپنے رنگ میں لاجواب۔ اردو شاعری میں داغ نے پہلی بار اردو کی شعری دنیا کو نغمہ و نشاط کی فضا سے ہم آہنگ کیا اور قنوطیت کی جگہ رجائیت کا راگ الاپا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے شوخی اور سرمستی کی جو راہ دکھائی اس نے اردو شاعری کی غم آلود فضا میں ایک نئی تازگی اور تھرتھراہٹ پیدا کی اور داغ کا کلام ہزاروں لوگوں کے دلوں میں جا گزیں ہو گیا۔ خلیل الرحمن اعظمی اس پس منظر میں ان کے نشاطیہ لب و لہجے کو ان کا سب سے بڑا اکتساب بتاتے ہیں۔

داغ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو ایک نئی قوت اور توانائی عطا کی، اور اس کو رسمی مضامین اور دور از کار خیال بندی سے نجات دلائی اور ایک ایسا انداز اختیار کیا جس سے زیادہ رچا ہوا انداز اس سے قبل اردو کی غزلیہ شاعری کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث ان کی عشقیہ شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''ایک ایسے زمانے میں جب معاشرتی آزادی کا وہ انداز نہ تھا جو آج ہے اور مردوں عورتوں کا ملنا ممکن نہ تھا اور نہ پسندیدہ۔ یہ بات قطعاً تعجب خیز نہیں کہ ہمارے شعرا بازاری عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ داغ کا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ انھوں نے اس حقیقت کو ذرا بے جھجک ہو کر بیان کر دیا''۔(10)

داغ کی شاعری محض عشق و عاشقی کے جذبات کے بیان تک محدود نہیں۔ ان کے یہاں ایسے

اشعار کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں ان کی عشق پرستی کے علاوہ ایسے مضامین بھی ہیں جو زندگی کے دوسرے معاملات ومسائل سے ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ نے اردو شاعری کو ایک نیا انداز عطا کیا جس میں دہلویت اور لکھنویت دونوں کے عناصر شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں سوز وگداز کی کمی ہے جو دہلوی شاعری کا خاصہ ہے مگر جذبات کی کارفرمائی ضرور ہے (11)۔

داغ اپنے رنگ سخن کے اعتبار سے منفرد ہیں اور اردو غزل میں ایک نئے طرز کے بانی جس میں ان کی رنگین اور طرح دار شخصیت پوری آن بان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔ اردو غزل کے روایتی عناصر بھی ان کے یہاں نئے اور بدلے ہوئے انداز میں رونما ہوئے ہیں۔ ناصح، دشمن، رقیب اور واعظ وغیرہ علامات ایک نئی بصیرت کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں اور انھیں نیا مفہوم دیا گیا ہے۔ داغ اپنے محبوب کی بے مہری اور بے وفائی اور ظلم وستم کا اس انداز میں شکوہ نہیں کرتے جس طرح اردو کے روایتی غزل گو شعرا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک نیا تیور اور نیا انداز ہے۔ داغ معشوق کی نفسیات کو ایک نئے زاویے سے پیش کرتے ہیں اور گلے شکوے کا وہ انداز اختیار نہیں کرتے جو غزلیہ شاعری کی روایت بن چکی تھی۔ ان کی غزلیں اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ ان میں ہجر وفراق کی کیفیت کے اظہار میں غلو سے کام نہیں لیا گیا۔ وہ اصلاً وصل کے شاعر ہیں، ہجر کے نہیں اور یہ کیفیت صرف داغ سے مختص ہے۔ داغ کی غزل گوئی کے بارے میں مولوی عبدالحق کا یہ بیان برحق ہے۔ ”داغ غزل کے شاعر تھے اور غزل میں جو رنگ ان کا تھا وہ انھیں پر ختم ہوگیا (12)۔ ان کے یہاں تغزل کی جو لطیف شکل نشاطیہ آہنگ کے ساتھ ابھری ہے، اس نے داغ کی غزل گوئی کو اردو کی روایتی غزل سے بڑی حد تک مختلف بنا دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو داغ کے نمائندہ اشعار ہیں:

کبھی بیٹھے کبھی اٹھے کبھی لوٹے کبھی تڑپے   تماشا دید کے قابل ہے تیرے بیقراروں کا

ہم جانتے ہیں خوب تری طرز نگہ کو   ہے قہر کی آنکھ اور محبت کی نظر اور

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح — یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

غصے نے اور رنگ ترا سرخ کر دیا — اچھی بنی بگاڑ میں صورت عتاب کی

وعدہ ابھی کیا تھا ابھی کھائی تھی قسم — کہتے ہو پھر کہ ہم تمھیں پہچانتے نہیں

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا — تمام رات قیامت کا انتظار کیا

فراق کے نزدیک داغ کے اسلوب کا اولین نقش اگر کہیں ملتا ہے تو ذوق کے یہاں (13)۔ ان کے خیال میں "آتش اور شاگردانِ ذوق نے بھی زبان کو اس طرح صاف اور رواں دواں کیا جیسے ذوق نے، ہاں اس میں خاص تیور اور بانکپن اور چستی سے پیدا ہونے والی روانی کا اضافہ بھی کر دیا (14)۔" فراق کا یہ خیال بھی قابل غور ہے جو انھوں نے اسے مضمون "داغ" میں ظاہر کیا ہے کہ دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔...... بول چال کی زبان پر جیسی قدرت داغ کو تھی ایسی قدرت کسی اور شاعر کے یہاں ڈھونڈ نا سعی لا حاصل ہے۔ اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے سمٹ کر داغ کی زبان میں جذب ہو گیا تھا (15)۔" داغ کی زبان اور طرز کلام کی یہ خصوصیت اردو کی شعری روایت کے وسیع تر پس منظر میں ابھری ہے جس کی ابتدا ولی سے ہوتی ہے۔ داغ کی زبان اور لہجے میں اس روایت کے عناصر ایک موج تہ نشیں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ داغ نے قلعۂ معلی میں اردو سیکھی تھی جو بول چال کی زبان کا سب سے زیادہ معیاری نمونہ سمجھی جاتی تھی اور صفائی و شگفتگی کے اعتبار سے اس کا جواب نہ تھا۔ داغ کی نظر میں دہلی کی زبان ہی مستند تھی اور وہ لکھنؤ کی زبان کے مقابلے میں اس کو قابل تقلید سمجھتے تھے۔ نثار علی شہرت "آئینۂ داغ" میں داغ کا یہ قول

نقل کرتے ہیں" جس طرح کان میں سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعۂ معلٰی اور دہلی سے اردو زبان نکلی ہے جس کے محاورے لعل و یاقوت کو پرے بٹھاتے ہیں۔ پس کوشش یہ ہے کہ دہلی کی شستہ و رفتہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جاوے اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جاوے جیسی کی دہلی میں بولی جاتی ہے۔(16)

یہ حقیقت ہے کہ داغ کی قوت تخیل نے روزمرّہ اور محاورے کے ہنرمندانہ استعمال سے مل کر اردو غزل کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا اور اس لحاظ سے وہ اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک نئی روایت کے بانی سمجھے جائیں گے اور ان کے کلام کی قدر و قیمت کبھی کم نہ ہوگی۔

اس نقطۂ نظر سے داغ اردو کی غزلیہ شاعری کی روایت کی ایک کڑی ہیں اور اردو غزل میں ایک منفرد رجحان کے علم بردار، داغ کے کلام کی شوخی اور اس کے طرز و آہنگ کے تیکھے پن نے اردو شعرا کے ایک بڑے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کے شاگردوں میں بے خود، سائل، نوح ناروی وغیرہ نے ان کے رنگ کو اپنا کر اپنی شاعری میں وہی طرح داری، شوخی، چلبلا پن پیدا کرنے کی کوشش کی جو داغ کی شاعری کا خاصہ ہے مگر بہ قول کلیم الدین احمد ان کے متبعین میں کوئی بھی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور کسی کے یہاں داغ جیسی بے ساختگی، برجستگی اور واقعیت پیدا نہ ہوسکی اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے درمیان وہی فرق ہے جو قدرتی پھول اور مصنوعی پھول میں ہوتا ہے۔

داغ، میر، سودا، درد، مومن اور غالب کی طرح عظیم شاعر نہ ہوں مگر ایک منفرد اور بلند پایہ شاعر ضرور ہیں اور اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک مخصوص رجحان کے علم بردار، جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو غزل کا کوئی معتبر جائزہ داغ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

●

حواشی

1۔ بزم داغ۔ص115 مرتبہ سید رفیق مارہروی

2۔ بزم داغ۔ص160

3۔ مراد منی بائی حجاب سے ہے جسے داغ دل دے بیٹھے تھے۔

4۔ زبان داغ۔ص230

5۔ بزم داغ

6۔ بزم داغ

7۔ اردو غزل میر سے اقبال تک

8۔ نگار ــــ داغ نمبر جنوری فروری 1953

9۔ فکروفن: خلیل الرحمن اعظمی، ص13

10۔ غزل اور متغزلین۔ص28

11۔ ذوق وجستجو۔ص36: خواجہ احمد فاروقی

12۔ مقدمات عبدالحق: مرتبہ عبادت بریلوی۔ص244

13۔ اندازے۔ص209

14۔ اندازے۔ص209

15۔ نگار ــــ داغ نمبر لکھنؤ جنوری فروری 1953 ص99

16۔ بحوالہ داغ دہلوی حیات اور کارنامے: مرتبہ کامل قریشی، ص۔82

●●●

Deptt. of Urdu
Banaras Hindu Univeristy
Varanasi 221005 (U.P.)

شمیم طارق

داغ کے خطوط

خط انسان کی شخصیت کا آئینہ ہے اور اگر خط لکھنے والا ادیب ہے تو اس میں اس کی شخصیت ہی کی نہیں، عہد کی جلوہ سامانیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ بقول الطاف حسین حالی:

''خط انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا کہ اس کی بے تکلف خط و کتابت سے ہو سکتا ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا، اسی واسطے مکتوب کو نصف ملاقات قرار دیا گیا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا، اب اس کی ملاقات محض اس کی خط و کتابت پر منحصر ہے اور بس۔ پس کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اس کی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلم بند کر دینا ہے۔'' (1)

حالی، غالب کے طرفدار اور سوانح نگار ہیں اس لیے یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ انھوں نے یہ سطور غالب کے خطوط کو ذہن میں رکھ کر لکھی ہوں گی جو ایک مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن میں غالب کی زندگی اور عہد کی چھوٹی بڑی جھلکیاں موجود ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے تو خطوط کی ہی بنیاد پر غالب کی سوانح حیات ترتیب دے دی ہے۔ لیکن حالی کا یہ قول داغ پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی نے بھی لکھا ہے کہ:

''ان (خطوط) سے داغ کے سوانح پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شاعرانہ شوخی نے جس زلف و رخ سے آب و رنگ حاصل کیا ہے اس کی نشاندہی ہوتی ہے۔'' (2)

امتیاز علی خاں عرشی نے داغ کے خطوط کو اس زلف و رُخ تک رسائی کا ذریعہ قرار دیا ہے جس سے ان کی شاعرانہ شوخی نے آب و رنگ حاصل کیا ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور اس سے داغ کے خطوط کی اہمیت اور ان کی سیرت و سوانح میں خطوط کی حیثیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن اسی مضمون میں مولانا عرشی نے ایک اور بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''داغ کے جو خطوط میرے مطالعے میں آئے ہیں ان کے پیش نظر بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی نقطۂ نظر سے ان تمام خطوط سے گھٹیا ہیں جو اب تک مختلف ادیبوں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں نہ لطفِ بیان ہے، نہ شوخیِ ادا ہے، نہ برجستگیِ محاورہ ہے نہ ظرافت کا نمک ہے، نہ مکالمت کی چاشنی ہے۔ ایک سپاٹ ادائے مطالب ہے اور بس۔ اور اگر احیاناً کہیں شوخی سے کام لیا ہے تو ابتذال پیدا ہو گیا ہے۔''(3)

عرشی صاحب کی نظر سے شاید داغ کے تمام خطوط نہیں گزرے ورنہ وہ یہ یک طرفہ فیصلہ نہ سناتے۔

داغ کے خطوط کا سب سے پہلا مجموعہ جس میں 140 خطوط ہیں، احسن مارہروی نے مرتب کیا تھا جو ان کے انتقال کے بعد 1941 میں ''انشائے داغ'' کے نام سے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔ اس کے بعد رفیق مارہروی نے ''انشائے داغ'' کے 140 خطوط میں 99 غیر مطبوعہ خطوط شامل کر کے ''زبانِ داغ'' کے نام سے داغ کے خطوط کا ایک مجموعہ 1956 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کرایا۔ اس میں داغ کے وہ تمام اردو خطوط بھی شامل ہیں جو ''نگار'' کے داغ نمبر میں غیر مطبوعہ خطوط کے عنوان سے شائع ہو چکے تھے۔ اس طرح داغ کے کل مطبوعہ خطوط کی تعداد 239 ہوتی ہے۔ داغ کی ہندوستان گیر شہرت، شاگردوں کی کثرت اور مسافرت کی طویل مدت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے خطوط کی یہ تعداد بہت کم ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے لفظوں میں اس کی وجہ یہ ہے: (4)

''معلوم ہوتا ہے کہ وہ نثر نویسی کی طرف کم مائل تھے اور نہ بے ضرورت خط لکھتے تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ لکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے خطوط کا سرمایہ بہت کم ہے۔''(5)

مولانا عرشی نے خطوط کی تعداد کم ہونے کی جو وجہ بتائی ہے وہ معقول ہے مگر تنہا یہی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ خطوط داغ کے کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی حیات میں کسی کو ان کے خطوط جمع کرنے کا خیال نہ آیا اور ان کے بہت سے خطوط دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے۔ مولانا احسن مارہروی نے ''انشائے داغ'' کے مقدمے میں اس احتمال کا اظہار کیا ہے:

''حتی الامکان اس وقت بھی بہت کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کے تلامذہ اور احباب سے جس قدر خطوط مل سکیں اس مجموعے میں شامل ہو جائیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ باوجود کافی سعی و کاوش کے اپنے خواجہ تاش بھائیوں سے خاطر خواہ سرمایہ بہم نہیں پہنچ سکا، خود میرے پاس کے چند بہترین خطوط

تفرقۂ اوقات کی وجہ سے ردّیوں میں مل کر نیست و نابود ہو گئے، نیز تلامذۂ قدیم کے نام جو خطوط تھے وہ اکثروں کے انتقال کی وجہ سے اور کمتروں کی نا قدری یا بے پروائی کے سبب تلف ہو گئے۔ بعض مشاہیر سے میرے علم و یقین میں مدتوں تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا لیکن ایسے نمونے بھی بہت کم ہاتھ آئے بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بھی بہت غنیمت ہے۔"(6)

داغ کے مطبوعہ خطوط کا سلسلہ 1860 سے شروع ہو کر 4 جنوری 1905 کے ایک خط پر ختم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کچھ اور خطوط بھی دستیاب ہو جائیں بلکہ چند لوگوں کو اصرار بھی ہے کہ ان کے پاس داغ کے خطوط محفوظ ہیں اس لیے خطوط کی تعداد کے قطع نظر قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان کے جتنے خطوط محفوظ ہیں یا طبع ہو چکے ہیں یا جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ داغ کے ہیں ان میں بیشتر خطوط سادہ نثر میں ہیں۔ البتہ وہ خطوط خوش طبعی اور خوش مذاقی کا نمونہ ہیں جو طوائفوں اور بے تکلف دوستوں کے نام ہیں۔ محاورے کا التزام دونوں صورتوں میں ہے۔

مخاطب یا مکتوب الیہ کی حیثیت و مذاق کا اثر خط لکھنے والے کے طرزِ تحریر پر بھی پڑتا ہے۔ اسی لیے احسن مارہروی نے "انشائے داغ" میں ان کے خطوط کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل ان خطوط کی ہے جو والیانِ ریاست، حکام، عمال اور امرا کے نام ہیں۔ دوسری فصل میں وہ خطوط شامل ہیں جو خاص اعزہ و تلامذہ کے نام ہیں اور تیسری فصل میں وہ خطوط ہیں جو شاگردوں کے نام (بسلسلۂ شاعری) لکھے گئے ہیں۔

"زبانِ داغ" کی اشاعت سے 99 نئے خطوط منظرِ عام پر آئے ان میں وہ خطوط بھی ہیں جو منی بائی حجاب، حمیدن بائی، مسماۃ ملکہ جان، مہاراج یوراج بیر، ٹھاکر ہرکشن بہادر بیدار، سائل دہلوی، لالہ شمبھو ناتھ، قاضی عبدالحمید، مولوی عبدالغفور نساخ، ڈاکٹر عوض خاں، شیخ محمد وزیر وزیر اور منشی امیر احمد امیر مینائی اور داغ کے ہمراز شاگرد سید قطب الدین اشک جلسیری کے نام لکھے گئے تھے۔ یہ خطوط اس لیے اہم ہیں کہ مکتوب الیہم میں سے کچھ بے تکلف اور راز دار دوست ہیں، کچھ ان کی محبوبائیں ہیں، کچھ ان کے کرم فرما ہیں، کچھ وہ حکیم اور ڈاکٹر ہیں جن سے وہ علاج کرواتے تھے اور ان کے ہمعصروں میں ایک صاحب ان کے حریف و مقابل بھی ہیں۔ اس لیے یہ خطوط سادہ نثر میں ہونے کے باوجود یکرنگ نہیں ہیں بلکہ داغ کی مختلف طرزِ نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اربابِ نشاط کو

عاشقانہ خطوط لکھتے وقت ان کا اسلوب تحریر تبدیل ہو گیا ہے اور سادہ نثر کی جگہ مقفیٰ عبارت نے اور سادگی کی جگہ شوخی نے لے لی ہے۔ اسی طرح کچھ بے تکلف اور ہمراز دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں سادگی کی جگہ عبارت آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر نبی جان طوائف کے نام ان کا یہ خط:

"کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں، تم کو کیوں کر دیکھیں، کیوں کر سنیں، اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں۔ جو ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا۔ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی نہ آؤ۔ ہائے مجبوری وائے مجبوری۔"

یہی شوخی و شرارت منی بائی حجاب کے نام ان کے 5 ستمبر 1880 کے خط میں بھی ہے:

غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو پاس ہوتیں تو (طبیعت) سیر ہوتی۔ کبھی تمھارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ کبھی تمہیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا۔ کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا۔"

ملکہ جان کو اپنے خط مورخہ 12 مارچ 1886 میں طعنہ دینے پر آئے ہیں تو حسن کی بے نیازی اور عشق کی نیازمندی کی ساری اداؤں کو لفظوں کا پیکر عطا کر دیا ہے:

"کیوں جی! خدا نے مجھے کیوں عاشق مزاج بنایا، اس بلا میں کیوں پھنسایا۔ پتھر کا دل، لوہے کا کلیجہ کیوں نہ بنایا۔ جس میں کوئی اچھی ادا دیکھی طبیعت لوٹ گئی خصوصاً کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گو بھی ہو، مرزا داغ کی موت ہے۔"

سید بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری ان کے مخصوص احباب میں تھے۔ ان کے نام لکھے گئے 20 اپریل 1881 کے ایک خط میں عبارت آرائی دیکھیے:

"داغ کو جلا کر خاک میں ملا کر آپ لکھنؤ چلے گئے۔ خیر صبر و شکر۔ چوں کہ یہ بے وفائی اور کج ادائی آپ نے اڑائی ہے ہم بھی ستم سمجھے۔ اے شخص اللہ رے تیرا دماغ، چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت اور اس استغنا کے ساتھ، رحم نہ آیا۔ ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ فراق تڑپ رہا ہے اس کی دلجوئی کیجیے یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ لو ہم جاتے ہیں۔ اچھا جاؤ، غارت ہو، دہرا صبر کر لیں گے۔"

القاب و آداب میں انھوں نے مراتب اور تعلق خاطر کا خیال رکھا ہے۔ مثلاً کہیں تو احترام کا یہ عالم ہے کہ مخاطب کے سامنے سر بہ زانو ہو گئے ہیں:

- "جناب خاں صاحب عنایت و کرم فرما، مجمع محاسن فراواں، مصدر منت و احساں، بہادر حسین خاں صاحب۔"
- "حکیم صاحب عنایت فرمائے بے پایاں، مصدر عطوفت فراواں، حکیم داد ار بخش صاحب دام عنایتکم......."
- "عالی جانب معلیٰ الالقاب زید اللہ اقبالہٗ و حشمہٗ، تسلیم قبول ہو۔"

اور کہیں دل لگی اور دل کی لگی کو الفاظ عطا کرنے پر آئے ہیں تو الفاظ بھی عشوہ گری کرنے لگے ہیں:

- "دل دار و دل نواز، بے مہر و بے وفا، منی جان تمھیں اللہ کی امان۔"
- "حور کی صورت، نور کی مورت، خوش رہو اور ہم سے ملو........"
- "ملکۂ اقلیم سخنوری، بنارس کی صنم، کلکتے کی پری دام جمالہا و کمالہا...."
- "دل رُبا، سخن آرا، حور لقا، پری ادا، دام جمالہا و کمالہا...."
- "غریب پرور فیض گستر سلامت"

لیکن اکثر خطوط کی ابتدا انھوں نے بغیر القاب کے یا مختصر القاب مثلاً نواب صاحب، جناب من، جناب مکرم، مکرمی، مہربانِ من، بندہ نواز، میر صاحب، سید صاحب، مہاراجہ صاحب، محب صادق، داغ نواز، جناب والا، بندہ پرور، حضور دام اقبالہٗ وغیرہ سے کی ہے۔ بیخود دہلوی کو مخاطب کرنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے:

"بیخود بہانہ ساز ہو تم جانتے ہیں ہم"

داغ کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن میں ایک ہی مکتوب الیہ کے لیے مختلف قسم کے القاب استعمال کیے گئے ہیں تاکہ خط میں نفسِ مضمون یا کسی خاص امر کی مناسبت باقی رہے۔ یہاں پیش ہیں کچھ مثالیں۔

ایک خط میں بیخود دہلوی کو مضمون کی مناسبت سے اس طرح مخاطب کیا ہے:

"واہ میر صاحب!

کیا خوب غزلیں کہیں ہیں۔ نہایت جی خوش ہوا۔ خود یہاں حاضر ہو کر ہم کو مبارک باد دو۔ دور کے ڈھول ہم نہیں سنتے۔"

سید احسن مارہروی نے "فصیح اللغات" (7) کی تکمیل کے سلسلے میں غالباً رمضان میں حیدر آباد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کئی ماہ گزرنے پر بھی جب وہ نہ آئے تو داغ نے شکایت بھرے الفاظ میں انھیں

یوں مخاطب کیا:

"میر صاحب نامہربان سلمہ اللہ الرحمٰن!

رمضان، شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ سب تمام ہوئے اور وعدۂ تشریف آوری ناتمام۔ اس محبت کو دونوں ہاتھ سے سلام۔ طرفہ تو یہ ہے کہ خطوں کے جواب بھی نہیں بھیجتے۔"

داغ نے القاب لکھنے میں اپنے مراسم کے ساتھ مکتوب الیہ کے سن وسال اور مراتب کا بھی خیال رکھا ہے۔ سائل دہلوی کے نام جو داغ کے قریبی عزیز اور شاگرد تھے، ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

"داغ کے جگر، جگر کے دل مرزا سراج الدین خاں بہادر متخلص بہ سائل سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

مختصر یہ کہ داغ نے عام طور سے ایک ہی مکتوب الیہ کے لیے ایک ہی القاب بہت کم استعمال کیے ہیں۔ صرف نواب کلب علی خاں کے لیے تقریباً تمام خطوط میں "غریب پرور فیض گستر سلامت" لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔

داغ کو عشق و محبت کے تذکرے یا حسن و جمال پر تبصرے کا موقع مل جاتا یا مخاطب ارباب نشاط میں سے یا بے تکلف احباب میں سے ہوتا تو اس میں وہ شوخی سے ضرور کام لیتے تھے۔ لیکن شوخی کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے طوائفوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں شاہد بازانہ اور رندانہ شوخی ہے اور جو خطوط اپنے بے تکلف و ہمراز دوستوں کو لکھے ہیں ان میں لطافت و دلآویزی کے ساتھ ظرافت وخوش طبعی ہے۔ نبی جان کے نام 23 جنوری 1903 کا خط رندانہ شوخی کا نمونہ ہے:

"...کل محمد نوح صاحب تشریف لائے آج بر سبیل تذکرہ تمھاری طرف سے ہمارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمھاری تصویر، تصویر نہیں بلکہ تیر۔ نام پوچھا تو سن کر خواہ مخواہ ایمان لانا پڑا۔ نبی جان بتقدیم نون بارخدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے، سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر، خوش آواز، خوش مزاج، اس پر پڑھی لکھی۔ زمانہ ایسے لوگوں کی جتنی قدر کرے بجا ہے۔

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ
اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں"

9 اگست 1886 کو ملکہ جان کے نام لکھے گئے ایک خط میں بھی یہی کیفیت ہے:

"تمھارا پہلا خط جو ایک دفتر شکوہ و شکایت تھا، مجموعۂ رشتہ درقابت تھا، میرے پاس پہنچا اس کا

جواب مناسب میں نے تمھارے مکان پر بھیجا اور نہ پہنچا بڑے افسوس کی بات ہے۔ نہایت بد انتظامی اور کم تو بھی گوہر جان کی متصور ہے۔ مسودہ کیسا، قلم برداشتہ خط لکھتا ہوں۔ آج تمھارا دوسرا خط آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خط جن اُڑا کر لے گئے۔ پریوں کے پاس جن ہوا کرتے ہیں۔ کیا عجب ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر ایسی جگہ آدمی کی مٹی خراب ہے۔ خصوصاً مجھ سا بھولا بھالا انسان کیا کرے۔ اس خط کے عوض کاش مجھ کو ہی اُڑا کر لے جاتے۔''

منی بائی حجاب جب حیدر آباد آئی تو پردہ کرتی تھی اور شب و روز عبادت میں مصروف رہتی تھی۔ داغ نے جس انداز میں اس کی آمد کی اطلاع قاضی عبدالحمید کو دی ہے اس میں مزاح پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خط 31 جولائی 1902 کا ہے:

''......بی فرشتن معہ بابو خدا بخش کے پہنچیں۔ میرا مکان بھی آسمان ہے، بی فرشتن کا نزول ہے۔ میں رندِ خراباتی اور وہ زاہدِ مناجاتی۔ دیکھیے کیا ہو۔ ابھی مجھے اس پردے میں نہیں معلوم ہوا کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔''

شیخ حمید اللہ عاجز کے نام ان کا پورا خط مزاح اور بے تکلفی سے بھرا ہوا ہے:

''.....اب معلوم ہوا کہ آپ کو راجہ اندر نے مہمان بلایا تھا، کوہ فلک شکوہ پر آپ تھے۔ نوبت معراج کی اگرچہ نہ آئی مگر دماغ تو آسمان پر پہنچا۔ پھر سنا کہ بی لاڈلی کے یہاں لڈو تقسیم کرتے ہیں۔ میں نے کہا جھوٹ۔ گوینده صادق القول تھا۔ عرض کیا جناب عالی بغیر شیخ صاحب کے مراسم ضروری اور مراحب ارضیہ کیوں کر ادا ہو سکتے ہیں۔ میں نے کہا غلط، اس نے کہا صحیح، میں نے کہا دروغ، اس نے کہا درست۔ غرض نوبت بہ ردّ و کد پہنچی۔ میں ہارا وہ کم بخت جیتا۔''

داغ کے خطوط میں حجاب و بے حجابی، تکلف و بے تکلفی، خوش مزاجی و دردمندی دونوں طرح کے جذبات پائے جاتے ہیں اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ عیش کوشی و لذت اندوزی کو زندگی سمجھنے والا دوسروں کے لیے درد اور خلوص رکھتا ہو، مگر داغ کی شخصیت میں یہ دونوں چیزیں جمع تھیں۔ وہ بیک وقت عیش کوش بھی تھے اور دردمند بھی۔ انھوں نے اپنے اعزا اور عام احباب و تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ہمدردی اور دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

عزیز و اقارب کو تسلی دیتے ہوئے انھوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان کے ہر لفظ سے خلوص و محبت

مترشح ہے۔ مثال کے طور پر پیش ہے ان کے رشتے کی ایک بہن اولیا بیگم کے نام 22 نومبر 1903 کا ایک خط:

''تمھارے منہ کی بیماری کا کیا حال ہے؟ تم نے خط میں نہیں لکھا۔ تم اپنی والدہ کی قبر پر بھی جاتی ہو؟ ضرور وہاں جاؤ اور قبروں کا حال مجھے لکھو۔''

اسی خط میں عزیز بیگم کو ان لفظوں میں مخاطب کیا ہے:

''بہن عزیز بیگم کو معلوم ہو۔ اوّل اپنے مزاج کا حال لکھو اور پھر اپنے مقدمے کی کیفیت.... تمھاری بہو کہاں ہے؟ کیا حال ہے؟ بھائی غلام قدوس کیسے ہیں؟ ہم تو ان کی خدمت کیے جاتے ہیں مگر وہ کبھی نہیں پوچھتے۔''

ایک دوسرے خط میں انھی عزیز بیگم کو ان کے مقدمہ ہار جانے پر ان الفاظ میں تسلی دی ہے۔ خط 15 دسمبر 1895 کا ہے:

''......تم کسی طرح نہ گھبرانا، بہت اطمینان رکھو۔ انشا اللہ تعالیٰ لاہور سے اس مقدمے میں ہم فتح پائیں گے۔ فقط وصیت نامے کے خارج ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا تو دعویٰ بہت کچھ ہے....اور یہ مقدمہ گواہوں کے بگڑنے سے خراب ہوا۔ اس قدر جو روپیہ صرف ہوا ہے تو اب کیوں کر چھوڑ دیا جائے اور تمھارا جو روپیہ صرف ہوا ہے اس کا تردّد نہ کرنا۔ اللہ دینے والا ہے۔....''

داغ کے خطوط میں کہیں کہیں مکالے کا انداز بھی نمایاں ہے۔ ظاہر ہے وہ غالب کا رنگ تو نہیں پیدا کر سکے ہیں مگر خطوط کے مکالماتی انداز کو محسوس کیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر پیش ہیں چند خطوط جن میں بے تکلف القاب و آداب یا خط کے دوسرے کسی حصے میں ذاتی لب و لہجہ اور انداز گفتگو کی کارفرمائی ہے:

''نواب صاحب آپ تو بیٹھے بٹھائے کلیجے میں نشتر چبھو دیتے ہیں۔ یہ فقرہ کیوں کر دل دوز اور جگر نگار نہ ہو، کہ اب مجھے روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے۔ مجھ سے جو کچھ ہوا دانستہ نہیں ہوا۔ حجاب جیسی ہزار ہوں تو تمھارے خلوص، تمھاری محبت پر نثار۔ تم سے کیا پردہ ہے اور تم سے کیا چھپا ہے۔''

''منی جان تمھیں اللہ کی امان

اس وقت دن کے گیارہ بجے ہیں کہ منشی عبدالرحیم خاں صاحب میرے پاس اخبار انگریزی

لائے، بہت پریشان آئے۔ میں نے کہا، بخشی خیر تو ہے کیا منی بائی کا کچھ حال ہے۔ یہ سنتے ہی ہوش و حواس جاتے رہے۔ انھوں نے ترجمہ کیا مجھے یقین ہوا کوئی اور منی ہوگی۔ آب و دانہ حرام ہو گیا۔ دل کو سمجھاتا ہوں نہیں مانتا.....''

''آہا یہ تو کہیے میں نے سنا ہے کہ منی بائی سے بڑے ربط وضبط ہیں، خدا خیر کرے۔ بارے میری برائی سننے میں تم شریک نہ ہوتی ہوگی۔ خیر یہ صبر خالی نہ جائے گا۔ ہم بھی سہاگ بھاگ گاتے ہیں۔''

داغ کے جو خطوط والیانِ ریاست رام پور، حیدرآباد یا دوسرے روٴسا کے نام ہیں ان کے اسلوب تحریر میں سادگی کے ساتھ عاجزی ہے۔ زبان بھی محتاط ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی انداز ہے جو ایک نمک خوار کے اپنے آقائے ولی نعمت کے نام لکھے گئے خطوط میں ہوسکتا ہے۔

مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے نواب مشتاق علی خاں والی رام پور کی خدمت میں ان کے خط کا یہ متن:

''غریب پرور فیض گستر سلامت

مراتب تسلیمات و کورنش ادا کر کے عرض رسا ہوں کہ فدوی وارد دہلی ہوا ہے۔ سات ہزار کا نقصان فقط اپنی جائداد کے حصے میں اٹھایا ہے اور ابھی آئندہ دیکھیے تقدیر کیا دکھائے۔ بظاہر تو کوئی دقیقہ تباہی اور بربادی کا باقی نہیں رہا۔ قطعۂ تہنیت جلوس حضور پرنور دام اقبالہم، داغ ہیچ مداں نے بہت روز ہوئے کہ عرض کیا تھا، چنانچہ وہ اخباروں میں چھپ بھی گیا، نوبت حضوری نہ آئی تھی۔ لہٰذا پیشی سے محروم رہا۔ اب ملفوف عریضۂ ہٰذا میں بھیجتا ہوں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

امیدوار ہوں کہ پروانۂ خوشنودی اور مزاج اور مژدۂ صحتِ عنصر شریف سے مفتخر و ممتاز ہوں۔ واجب تھا کہ عرض کیا۔ الٰہی آفتاب دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد

عرض فدوی نواب مرزا خاں داغ۔ معروضہ 21 جولائی 1887 از دہلی محلہ بلی ماران۔''(8)

داغ کے خطوط میں شوخیِ ادا، برجستگی اور محاورے کی چاشنی اور کہیں کہیں مکالمت کی جو جلوہ گری ہے وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ صحت و صفائی کے ساتھ دہلی کی شستہ و رفتہ با محاورہ زبان کا لطف تو ہر خط میں ہے۔ خاص طور سے وہ خطوط شوخی اور برجستگی کا خوبصورت نمونہ ہیں جو حیدن بائی، منی بائی اور ملکہ جان کے نام لکھے گئے ہیں۔ شروع میں یہ خطوط منظر عام پر نہیں آئے تھے اور صرف احسن مارہروی کے

ترتیب دیے ہوئے خطوط کو دیکھ کر مولانا عرشی نے داغ کے خطوط کو گھٹیا کہہ دیا تھا۔ ممکن ہے دوسروں کا بھی یہی خیال رہا ہو لیکن اب جب کہ وہ خطوط منظر عام پر آ چکے ہیں جو پہلے پردۂ اخفا میں تھے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان میں شوخی و ذہانت، جودت و ذکاوت، سنجیدگی و ظرافت اور محاورہ بندی کے جوہر نمایاں ہیں۔ ان میں زبان و املا کی کچھ غلطیاں در آئی ہیں تو اس کی وجہ کاتب کی غفلت اور سہو ساعت ہے۔

داغ کی شخصیت میں دورنگی نہیں تھی۔ یہی خوبی ان کے خطوط میں بھی ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کا انکشاف اپنے خطوط میں کر دیا ہے۔ اپنے بے تکلف دوستوں اور شاگردوں سے اپنے معاشقوں کا حال بھی نہیں چھپایا ہے۔ داغ جس عہد اور جاگیردارانہ سماج کے جس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اس میں گانا سننا اور طوائفوں سے رشتہ رکھنا معمولات میں شامل تھا۔ یہ داغ کی سیرت و کردار کا خصوصی عیب نہیں تھا۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ داغ نے اپنی غزلوں میں جس قسم کے مضامین باندھے ہیں ان سے ان کے کردار کی کمزوری پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے اشعار امیر مینائی کی غزلوں میں بھی ہیں جو صوفی منش اور بے داغ کردار کے مالک تھے۔

داغ گانا سنتے تھے، طوائفوں سے رابطے رکھتے تھے اور خط و کتابت کرتے تھے تو اس میں ان کی طبیعت کی عیاشی سے زیادہ اس جاگیردارانہ تہذیب کا اثر تھا جس میں وہ پلے بڑھے تھے۔ ان کی غزل بھی اس کے لغوی معنی کے علاوہ جاگیردارانہ مزاج کی ترجمان ہے۔ ان کے معمولات کے متعلق جو تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل پارسا نہ سہی، رند و اوباش بھی نہیں تھے۔

سید رفیق مارہروی نے اپنے والد مولانا احسن مارہروی اور افتخار عالم مارہروی کی یادداشتوں کی بنیاد پر ترتیب دی گئی کتاب ''بزمِ داغ'' میں وہ تفصیلات پیش کر دی ہیں جن سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ داغ نے حیدرآباد میں کس طرح زندگی بسر کی اور ان کے مشاغلِ حیات یا روزمرہ کے معمولات کیا تھے۔ یہ دونوں حضرات داغ کی جلوت و خلوت کے راز دار تھے۔ اور ہر وقت نہ صرف ان کے ساتھ رہتے تھے بلکہ تمام واقعات کو قلمبند کر لیتے تھے۔ 20 اگست 1898 کی یادداشت میں لکھتے ہیں:

''رسائی و پذیرائی کے بعد مرزا داغ نے سب سے پہلی خدمت جو مجھے تفویض کی ہے وہ ہر جمعرات کو بزرگانِ دین اور احبابِ متوسلین کا فاتحہ دینا ہے، مرزا صاحب کے معمولات میں ہے کہ وہ

ہر جمعرات کو مذکورہ بالا بزرگوں کو فاتحہ دلوایا کرتے ہیں، پہلی جمعرات کو جب میں تعمیل ارشاد کے لیے اٹھا تو فرمایا کہ وہ فہرست تو لے لیجیے جس میں ان لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں، جن کی فاتحہ دی جائے گی، اپنے قلمدان سے ایک فرد نکلوا کر دی، دیکھا تو بلا شبہ اسماء حسنیٰ سے زیادہ اسم تو یقیناً اس میں کی گئی تھی۔ سلاسل صوفیہ کا کوئی مشہور بزرگ، طبقۂ شعرا کا کوئی نامور سخنور، گروہ اعزا واحبا کا کوئی مخصوص زن و مرد، ایسا نہیں تھا جس کا نام اس فہرست میں نہ ہو، شیرینی طعام کو دیکھا تو وہ بھی 25-20 خوراکوں کے لیے کافی — مرزا صاحب کا یہ معمول ہمیشہ سے چلا آتا ہے، فرماتے ہیں کہ رام پور کے قیام میں بھی یہی عمل درآمد رہا اور اب حیدرآباد آنے کے بعد بھی یہ دستور جاری ہے۔

مرزا صاحب اپنے معمولات کے بہت پابند ہیں، وہ صبح نماز پڑھنے کے بعد آفتاب نکلتے نکلتے مکان کے اوپر کی منزل میں جہاں عام نشست رہتی ہے، تشریف لے آتے ہیں، ایک آرام کرسی پر خود تشریف رکھتے ہیں، آس پاس دوسرے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں پڑی ہوتی ہیں۔ ایک میز پر قلم دوات اور خطوط رکھے ہوتے ہیں، یہ وقت عام طور سے خطوط کے جواب دینے کا ہوتا ہے اور اسی موقعے پر شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی ہوتی ہے۔ 11 بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے، مکان کے نچلے حصے میں دسترخوان بچھتا ہے اور مرزا صاحب کھانا تناول فرماتے ہیں۔ دسترخوان پر عام طور سے دو چار حاضر باش شاگرد ضرور ہوتے ہیں۔ کھانے کے بعد مرزا صاحب پلنگ پر پہنچ جاتے ہیں، پیچوان سامنے لگا دیا جاتا ہے۔ نواب علی حسن خاں اگر ہوتے ہیں تو ان کے لیے گڑگڑی حقہ آتا ہے اور اس طرح دو ڈھائی گھنٹے مرزا صاحب آرام کرتے ہیں۔ ظہر کے وقت اُٹھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور اس کے بعد شطرنج کھیلتے ہیں۔ اسی موقعے پر مقامی شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح ہوتی ہے، شاگرد خود شعر پڑھتا جاتا ہے اور اصلاح لیتا جاتا ہے۔ نمازِ عصر کے بعد یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے اور مرزا صاحب جوڑی پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلتے ہیں، ہوا خوری کے لیے زیادہ تر سکندر آباد، حسین ساگر یا باغ عام کی طرف تشریف لے جاتے ہیں، سواری میں خود ہمیشہ صدر میں دائیں جانب بیٹھتے ہیں، بائیں جانب عام طور سے نواب حسن علی خاں کو ہی جگہ ملتی ہے۔ آگے کی نشستوں پر حاضر باش شاگردوں میں جو موجود ہوتا ہے بیٹھتا ہے۔ الغرض مرزا صاحب کی سواری بڑی شان سے نکلتی ہے، مغرب سے قبل واپسی ہوتی ہے۔ نمازِ مغرب پڑھ کر پھر نشست ہوتی ہے، لیکن ایسے موقعے

پر عام طور سے مرزا صاحب گانا سنتے ہیں، گانا زیادہ تر صاحب جان طوائف کا سنتے ہیں جو آج کل مرزا صاحب کی ملازم ہے، یا رحمت اللہ قوال کا گانا ہوتا ہے۔ عشا کی اذان کے ساتھ یہ محفل ختم ہوتی ہے، بعد نمازِ عشا کھانا تناول فرماتے ہیں اور آرام فرماتے ہیں لیکن سونے سے قبل اگر کوئی غزل کہنا ہوتی ہے تو اس کی فکر کرتے ہیں اور جب تک پوری غزل نہیں کہہ لیتے، سوتے نہیں ہیں۔ رات کو مشکل سے 3-4 گھنٹے آرام کرتے ہیں، جس وقت آنکھ کھلتی ہے اسی وقت ملازم کو آواز دی جاتی ہے، وہ حقہ بھر کر پیش کرتا ہے، حقہ پی کر ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں اور اول وقت نمازِ فجر ادا کرتے ہیں۔" (9)

کیا اس تفصیل کی روشنی میں ابھرنے والی داغ کی شبیہ اس شبیہ سے مختلف نہیں نظر آتی جو شہرت پا گئی ہے۔ طوائفوں یا بے تکلف دوستوں کے نام ان کے خطوط اس لیے زیادہ رنگین اور شوخ نہیں ہیں کہ وہ اوباش تھے بلکہ اس لیے کہ عاشقانہ اور دوستانہ خطوط ایک خاص طرزِ ادا اور زبان کے متقاضی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ رنگین مزاجی ان کی شخصیت کا حصہ تھی مگر ان کی شخصیت میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ شامل تھا جس کا اظہار ان کے خطوط میں ہوا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ داغ کے خطوط ایسا آئینہ ہیں جس آئینے میں ان کی شخصیت کا صاف اور سچا عکس نظر آ جاتا ہے۔ جس میں صرف شوخی و شرارت اور حسن پرستی ہی نہیں دوستی و غمخواری اور محسنوں کے لیے احسان مندی اور شکر گزاری کے جلوے بھی ہیں۔ تنگ دستی کے بعد خوش حالی کے دنوں میں کنور اعتماد علی خاں کو لکھا ہوا یہ خط شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات کا آئینہ ہے:

"میرے دوستوں میں آپ کا خاص مرتبہ ہے۔ آپ نے وقتاً فوقتاً جو میرا خیال رکھا اور مجھے فکروں سے نجات دی اس کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ خدا کسی سے سابقہ نہ ڈالے۔ ضرورت اور مدد کے وقت یگانے بیگانے ہو جاتے ہیں، جانے پہچانے انجان بن جاتے ہیں۔ آپ نے اس وقت میری دست گیری فرمائی جب کہ میرے دن مجھے موافق نہ تھے۔ اب کہ خدا کا شکر ہے میں مطمئن ہوں آپ کو بھول سکتا ہوں؟ آپ کیا فرماتے ہیں کہ زحمت دیتا ہوں۔ یہ زحمت میرے لیے رحمت ہے۔ (10)

لالہ شمبھو ناتھ کے نام ایک خط میں بھی اسی قسم کے احساس کا اظہار ہے:

"میری نگوں بختی کو آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ پریشان رہا پریشان ہوں اور نہ معلوم کب

تنگ اور پریشان رہوں گا۔ کوئی تدبیر پیش وقت نہیں جاتی، ناچار تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ آپ کی دوست نوازی، غمخواری، ہمدردی ولطف وکرم کا دل پر گہرا نقش ہے۔ کیا کیا سختیاں جھیل کر باہر نکلا ہوں۔ آپ کے خط کے چند جملے پڑھ کر جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جی سنسنا گیا۔ عرقِ انفعال میں نہا نہا گیا، ناحق آپ کیوں شرماتے ہیں۔ جہاں اتنے روز صبر کیا ہے چند روز اور رُکیے۔ سب مشکلیں خدا چاہے اب دور ہوا چاہتی ہیں۔ کنارے آلگا ہوں۔ نہ یہ وقت رہے گا اور نہ آپ کا روپیہ دیا ہوا مجھ پر باقی رہے گا۔" (11)

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ کے خطوط کو جن لوگوں نے فضول کہا ہے انھوں نے ان کے تمام خطوط کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ داغ کے خطوط نہ ادبی نقطۂ نگاہ سے غیر اہم ہیں نہ انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان سے داغ کی زندگی کے واقعات اور ان کے طبعی رجحانات ومیلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی سادگی میں بھی دلکشی و پرکاری ہے اس کے علاوہ جابجا عبارت آرائی کے نمونے بھی مل جاتے ہیں یعنی ان میں کم وبیش وتمام عناصر موجود ہیں جو خط نویسی کی لازمی خصوصیت تصور کیے جاتے ہیں۔ ان پر احسن مارہروی کی وہ سطور پورے طور پر صادق آتی ہیں جو انھوں نے عمومی طور پر خطوط نویسی کی اہمیت وحیثیت واضح کرنے کے لیے لکھی تھیں:

"مکتوب الیہم کی شخصیت اور حیثیت اور جواب طلب امور کی نوعیت کے مطابق اسی انداز وطریق سے خطوط لکھے جاتے ہیں جس ترکیب وروش سے باہم بالمشافہ مکالمت ہوا کرتی ہے۔ جن خطوط میں بے ساختگی اور برجستگی نہیں ہوتی وہ یقیناً غور وخوض اور فکر وتامل کی امداد سے لکھے جاتے ہیں، ان میں اگرچہ انشا پردازی کے عناصر ہونے سے ادبی لطافتیں اور فنی خصوصیتیں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں مگر وہ طبعی ذکاوت اور ذہنی جودت مفقود ہو جاتی ہے جو صاحب تحریر کے مزاج میں منجانب قدرت ودیعت ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی نامور کی، ذاتی شوخی، سنجیدگی، متانت، ظرافت، ثقاہت، خوش مزاجی، شگفتہ طبعی، برہمی، عجز وانکسار، غضبناکی، خشونت اور یبوست اور دوسری حسیات کی صحیح جانچ پڑتال کرنی چاہیں اور اس کو دیکھے بغیر اس کی عادتوں اور خصلتوں اور میلان ورجحان کو سمجھنا چاہیں تو اس کے لیے خطوط کے علاوہ دوسری کوئی تصنیف وتالیف کام نہیں آسکتی۔ دوسروں کی لکھی ہوئی لائف سے اس کے نظام الاوقات اور تمام معمولات تو معلوم ہو جائیں گے مگر یہ علم نہ ہو سکے گا کہ ان مواقع پر اس کا صحیح وجدان اور اصلی رجحان کیا ہے۔ یہ باتیں اگر صاف صاف، بے غل وغش آئینے کی طرح نظر آسکتی ہیں، تو ان نجی تحریروں ہی میں نظر آسکتی ہیں جن کو ایک صاحب قلم نے اپنے بے تکلفانہ اندازِ رقم کے ساتھ سینے سے

نکال کر سفینے میں رکھ دیا ہے۔" (12)

داغ کے خطوط ان خصوصیات کا مرقع ہیں جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کی گئیں ہیں۔ ان کے خطوں سے مذہبی معاملات میں ان کی احتیاط پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نوح ناروی کے شعر:

سب خدا جانے کیا سمجھتے ہیں
ہم بتوں کو خدا سمجھتے ہیں

(13)

پر اصلاح دینے کے بجائے حاشیے پر لکھوا دیا تھا کہ "دیکھو تم ایک ہی شعر میں کافر ہو گئے، مرتد ہو گئے اور مشرک ہو گئے۔" بعض دوسرے خطوط بھی ان کی ایمانی غیرت کے گواہ ہیں۔

●

حواشی

-1 مکاتیب امیر مینائی تبصرے، ص315
-2 رسالہ اردو ادب، ماہ ستمبر 1956، ص6
-3 رسالہ اردو ادب، ماہ ستمبر 1956، داغ کے خطوط از امتیاز علی خاں ص،6
-4 اردو نمبر 53 (داغ کے غیر مطبوعہ خطوط از خواجہ احمد فاروقی اور داغ کے دو غیر مطبوعہ خطوط مرسلہ لیٰسین علی خان)
-5 اردو ادب سہ ماہی، ماہ ستمبر 1956، ص5
-6 انشائے داغ ص،6 (مقدمہ)

نوٹ: جن خطوط کے نیچے حواشی نہیں ہیں، وہ "زبان داغ" سے لیے گئے ہیں۔ باقی تمام حوالے درج ہیں۔

-7 یہ ایک رسالہ تھا جو احسن مارہروی نے اپنے استاد کی یادگار کے طور پر نکالا تھا۔ عرصے تک جاری رہنے کے بعد بند ہو گیا۔ داغ کو اس کے بند ہونے کا بہت رنج تھا۔
-8 انشائے داغ، ص34
-9 بزم داغ، ص27-24
-10 زبان داغ، ص180-179
-11 زبان داغ، ص212-211
-12 انشائے داغ، ص3
-13 بزم داغ، ص41

●●●

Flat - 27, 4th Floor,
Marzban Mansion,Byculiah Fruit Market,
Mumbai - 400027(Maharashtra)

شمس بدایونی

داغ کی خطوط نگاری

چند دوسری موضوعاتی تحریروں کی طرح جنھوں نے اتفاقیہ صنفِ ادب کی حیثیت حاصل کر لی ہے اردو میں مکتوباتی ادب کا بھی قابل قدر سرمایہ ہے۔ اور اس ادب کی عمر آج تقریباً دو سو برس سے متجاوز ہو رہی ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق اردو کا پہلا خط 1803 کا مکتوبہ ہے۔ (دیکھیے: واقعات اظفری، نسخہ جامعہ ٹیوبنگن) اور اردو کا پہلا مطبوعہ خط اگست 1865 کا ہے (دیکھیے: نامۂ غالب، مطبع اتو جان، دہلی) 1865 سے مئی 2006 تک صدہا مکتوباتِ اردو کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بعض مکتوب نگار وہ بھی ہیں جن کا شمار اس ''اتفاقیہ صنف ادب'' کے بنیاد گزاروں اور اسے سجانے و سنوارنے والوں میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً: غالب، سرسید، شبلی، اقبال، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ مکتوباتی ادب کے مطالعے کے ضمن میں مذکورہ افراد پر ہی توجہ دی جاتی رہی ہے۔ ان کے خطوط مختلف مجموعوں اور متعدد اشاعتوں کی صورت میں ترتیب و تدوین اور تحقیق و تنقید کے مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ لیکن دوسرے مکتوب نگار ماضی میں بھی نظر انداز ہوتے رہے اور آج بھی منتظر توجہ ہیں۔ اردو کے مکتوباتی ادب کے وافر ذخیرے اور اس سے تصنیفی و تالیفی موضوعات میں بیش از بیش استفادہ کیے جانے کے باوجود اس کے ادبی و تاریخی ارتقا پر چند منتشر مضامین، خطوط کے مجموعوں پر لکھے گئے بعض تعارفی دیباچے یا مقدمات، شمس الرحمٰن بی.اے کی تنقیدی مطالعے پر مبنی مختصر کتاب ''اردو خطوط'' (دہلی۔ 1947) اور خواجہ احمد فاروقی (ف 1995) کے غیر مطبوعہ علمی مقالے مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا (1952) اور رسائل کے چند نمبروں (نقوش لاہور، خطوط نمبر 2 جلد اور مکاتیب نمبر 4 کے علاوہ کوئی تحقیقی و تنقیدی کتاب مرتب و شائع نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مکتوبات اردو کے ادبی و تاریخی ارتقا سے ہماری ناواقفیت دوسرے اہم مکتوب نگاروں کے مطالعے اور جائزے کے لیے ہمیں ابھی تک آمادہ نہیں کر سکی ہے۔

مکتوب نگاری کے تاریخی ارتقا کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کے متعدد ادوار کا تعین ناگزیر ہوگا۔
مکتوب نگاری کا پہلا دور رجب علی بیگ سرور (1787-1869) مرزا غالب (1797-1869)
غلام غوث بے خبر (1825-1904) واجد علی شاہ (1823-1887) سرسید احمد خاں (1817-1898)
امیر مینائی (1829-1900) داغ دہلوی (1831-1905) محسن الملک (1837-1907)
محمد حسین آزاد (1830-1910) نو مکتوب نگاروں کو محیط ہے۔ اس دور میں غالب کی حیثیت نہ صرف ایک عظیم مکتوب نگار بلکہ اس صنف کے بنیاد گزار کی ہے۔ لیکن اس صنف کو رنگینی و شوخی سے آمیز کرنے اور اس کے فطری پن کو زندگی کی حرارت اور جذبات کی تمازت سے مملو کرنے میں داغ کے خطوط کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سطور ذیل میں ''زبان داغ'' (مجموعۂ خطوط داغ) کے حوالے سے داغ کی خطوط نگاری کا مطالعہ مقصود ہے۔

''خطوط داغ کا پہلا مجموعہ باسم تاریخی، ''انشاء داغ''(1) (1358ھ/1939) داغ کے شاگرد سید علی احسن، احسن مارہروی (1876-1940) نے 1939 میں ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ ابھی خطوط کی جمع آوری و ترتیب کا کام تکمیل کی حدود میں داخل نہیں ہوا تھا کہ احسن 30 اگست 1940 کو وفات پا گئے۔ یہ نامکمل مجموعہ، جس پر مقدمہ اور بعض خطوط پر توضیحی نوٹ بھی لکھے جا چکے تھے ان کے بیٹے سید رفیق مارہروی نے تین خطوں کا اضافہ کر کے مولوی عبدالحق کے حوالے کر دیا۔ (1940) جو انجمن ترقی اردو ہند کے سلسلۂ مطبوعات 1513 کے تحت 1941 میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں 128 اردو کے اور فارسی کے 12 خطوط تھے۔ کل تعداد خطوط 140 تھی۔ اس مجموعۂ خطوط کو مقدمے کے علاوہ تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

فصل اول: والیان ریاست، حکام، عمال اور امراء تعداد خطوط اردو 20 فارسی 12 کل 32
فصل دوم: مخصوص اعزہ، خاص احبا اور عام شناسا وغیرہ تعداد خطوط اردو 43
فصل سوم: پندرہ شاگردان داغ تعداد خطوط اردو 65

تعداد خطوط اردو 128 فارسی 12 کل 140

اس طور داغ کے 140 خطوط پہلے پہل منظر عام پر آئے۔ یہ افرادی یعنی مکتوب الیہم کی ترتیب

سے تھے۔لیکن یہ خطوط چونکہ اکثر ایسے اشخاص کے نام تھے جن سے تعلقات میں ایک خاص فاصلہ ملحوظ تھا اور جن کے مراتب و مناصب رہوار قلم کو بیساختہ انداز پر دوڑنے کے مواقع نہیں دیتے تھے لہٰذا ان خطوط کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ان خطوط کو سادہ و خشک جان کر، تکلف و آورد کے زمرے میں رکھتے ہوئے لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

خطوط داغ کا دوسرا مجموعہ احسن مارہروی کے بیٹے سید رفیق مارہروی (1916-1967) نے ''زبان داغ'' کے نام سے ترتیب دیا۔وہ ترتیب خطوط کی جانب اس وقت راغب ہوئے جب انھیں اپنے والد احسن مارہروی کے ذخیرۂ کتب و مکتوبات میں داغ کے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک بنڈل دستیاب ہو گیا۔اس بنڈل کے خطوط زبان و بیان کے لحاظ سے دلچسپ تھے۔یہ خطوط مزاج داغ کی شگفتگی و شوخی اور لطافت و رنگینی سے بھرپور تھے۔اس بنڈل کے پا لینے کے بعد انھوں نے مزید تلاش و سعی سے مختلف مقامات اور متعدد شخصیات سے داغ کے کچھ اور خطوط حاصل کر لیے۔جب ان کے پاس 110 خطوط کا ذخیرہ ہو گیا تب انھوں نے بشمول ''انشائے داغ'' تمام خطوط کو نئے سرے سے ترتیب دینے، مقدمہ و حواشی لکھنے کا عزم کر لیا۔دسمبر 1955 میں (عرضِ مرتب پر مرقوم تاریخ) انھوں نے اسے مکمل کر لیا۔پیش لفظ لکھنے کے لیے تمکین کاظمی (ف 1961) کو زحمت دی۔تمکین کاظمی نے 12 جنوری 1956 کو کتاب پر پیش لفظ لکھ دیا۔(پیش لفظ پر رقوم تاریخ) اس طرح یہ مجموعۂ خطوط، نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے 20x30 کتابی سائز کے 292 صفحات پر شائع ہوا۔

کتاب احسن مارہروی کے نام معنون کی گئی ہے۔(ص:4) پیش لفظ (ص 10-7) میں تمکین کاظمی نے داغ کی وضعداری و خودداری کی داد حیدر آباد میں ان کے قیام کے پس منظر میں دی ہے اور لکھا ہے کہ داغ نے حیدر آباد جیسے مخدوش اور پر آشوب علاقے میں کسی سازش میں شریک ہوئے بغیر اٹھارہ سال سکون کے ساتھ گزار دیے۔ان اٹھارہ سال میں نواب حیدر آباد بھی ان سے راضی رہے اور ان کے حیدر آبادی احباب و تلامذہ بھی ان کے جاں نثار بنے رہے۔یہ ان کے اخلاقی اوصاف ہی کا کمال تھا۔''پیش لفظ'' کے آخر میں لکھا ہے:

''میں داغ کو نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پسند کرتا ہوں بلکہ ایک عملی آدمی، ایک شریف

استاد، ایک نیک بزرگ، ایک مرد کامل کی حیثیت سے بھی ان کا مداح ہوں۔ داغ کے یہ خطوط ان کی قوت عمل، بلندی اخلاق و کردار، اور ان کی وضعداری و خودداری پر پوری پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان کے مواجہہ میں داغ کو صرف ایک شاعر سمجھنے والا بھی ان کی زبان دانی اور انشاء پردازی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (ص 10-9)

عرض مرتب (ص 16-11) میں خطوط کی جمع وترتیب کی روداد پیش کردی گئی ہے۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی دیے ہیں جنھوں نے خطوط کی فراہمی میں مدد کی یا دوسری معلومات فراہم کیں۔ اس سلسلے میں تمکین کاظمی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ترتیب کے طریقۂ کار کی وضاحت کی ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

- وہ تمام چھوٹی بڑی تحریریں بھی (مراد مکتوب) اس مجموعے میں شامل کر لی گئی ہیں جو داغ سے منسوب ہو کر ملک کے بعض رسائل میں شائع و مطبوعہ ہو چکی ہیں۔
- خطوط بحساب حروف تہجی پیش کیے گئے ہیں۔ (بہ حوالۂ مکتوب نگار)
- مکتوب الیہم کے حالات جس قدر معلوم ہو سکے ہیں درج کر دیے گئے ہیں۔ خطوط میں جن افراد اور مقامات وغیرہ کا ذکر ہے ان کی وضاحت بھی حسب ضرورت..... کر دی گئی ہے۔
- بعض خطوط کی مزید وضاحت کے لیے ... متعلقہ تحریریں..... اور مکتوب الیہم کے خطوط بھی دے دیے گئے ہیں۔
- اس مجموعۂ خطوط میں اکثر مقامات ایسے بھی ہیں جہاں سے بحث ومباحثے کی گنجائشیں نکلتی ہیں۔ میں نے اس سے قطع نظر کیا ہے۔ (ص: 14-13)

آخر میں لکھا ہے:

حضرت داغ نے اپنے منظوم کلام کے لیے دعویٰ فرمایا تھا کہ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اس دعوے کی تصدیق یا بطلان کے لیے آج داغ کی نثر آپ کے سامنے ہے۔ غور فرمایئے کہ داغ کے تعلق کا اطلاق ان کی نثر پر بھی ممکن ہے یا نہیں۔ (ص: 15-14)

فہرست (ص:20-17) کے بعد ذکرِ داغ (ص:34-21) کے عنوان سے داغ کی سوانح پر مضمون ہے۔ جس میں حیاتِ داغ کے اہم واقعات کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون میں داغ کی ولدیت اور ان کی والدہ چھوٹی بیگم کی سماجی حیثیت پر مفصل اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ تذکرہ نگاروں نے داغ کے حسب و نسب اور ان کی والدہ کی مختلف افراد سے وابستگی کو یا تو چبا چبا کر بیان کیا ہے یا طنز واستہزا کے طور پر۔ رفیق مارہروی نے اس سلسلے کے جملہ بیانات سے بحث کرتے ہوئے ان سے صحیح نتائج اخذ کیے ہیں۔ اور داغ کے والد نواب شمس الدین خاں والیِ فیروز پور جھرکہ اور ان کی والدہ چھوٹی بیگم کا نام اور ان کے خاندانی و سماجی مرتبے کا تعین کر دیا ہے۔ یہ بحث مدلل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس سلسلے میں رفیق مارہروی نے اسلامی تاریخ کے بعض ایسے نامور افراد کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کو معروف طور پر باپ کا نام نہیں مل سکا لیکن ان کے تاریخی کارناموں نے اس داغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈھانپ لیا۔ اس قسم کے واقعات درج کر کے مرتب نے داغ کے نسب پر لگے داغ کو مٹانے یا اس کے اثرات کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرتب نے ''عرضِ مرتب'' میں لکھا تھا:

خطوط سے پہلے حضرت داغ کی زندگی کے اس ''رخ'' پر اظہارِ خیال کرنے کی جرأت کی ہے۔ جو اس وقت تک غالباً ''شجرِ ممنوعہ'' خیال کر کے واقعہ نگاروں نے بے نقاب نہیں کیا تھا اور اگر اس موضوع پر کہیں کچھ لکھا بھی تھا تو مشکوک اور مبہم انداز میں۔ (ص:14)

''عرضِ مرتب'' اور ''مقدمہ'' کے بعد خطوط کا آغاز ہوتا ہے۔ فہرست کے مطابق ان خطوط کے مکتوب الیہ 65 ہیں۔ ایک خط کسی نامعلوم فرد کے نام ہے لیکن دراصل مکتوب الیہ 63 ہیں۔ داغ کی دو نثری تحریریں خطوط کے طور پر شامل کر لی گئی ہیں۔ جن کی نوعیت یہ ہے:

1- مولانا ظفر علی خاں (ف 1956) کی کتاب خیابانِ فارس (لارڈ کرزن کی کتاب گارڈنس آف پرشیا Gardens of Persia کا ترجمہ) پر داغ کی تقریظ۔ مکتوبہ 3 فروری 1902

2- فردِ قیامِ حیدر آباد۔ اس پر مرتب نے یہ نوٹ دیا ہے:

داغ کی تنخواہ ریاستِ حیدر آباد سے تاریخِ ورود سے مقرر ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں جب مرزا داغ سے قیامِ حیدر آباد کی تفصیل چاہی گئی تو انھوں نے اپنے دست و قلم سے اس طرح لکھ کر دی (ص 236)

یہ نو یا دس سطری تحریر فہرست میں فرد قیام حیدر آباد، سرخی کے تحت درج کی گئی ہے لیکن مجموعے میں یہ محمد الدین فوق کے نام خطوط میں محسوب کی گئی ہے اور اسے نمبر 4 دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ فوق کے کسی استفسار کے جواب ہی میں ہو اور مرتب کو فوق ہی سے حاصل ہوئی ہو۔ لیکن اس کو خط کی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

فہرست کے مطابق خطوط کی کل تعداد 239 ہے۔ مجموعے میں خطوط پر دیے گئے سلسلہ وار نمبر شمار کے مطابق 238۔ لیکن دراصل یہ 63 مکتوب الیہ کے نام 236 خط ہیں۔ ایک خط کا مکتوب الیہ نامعلوم ہے جو نواب حیدر علی خاں برادر نواب کلب علی خاں کے نام خطوط میں محسوب کر لیا گیا ہے (ص 168) اس طور کل تعداد خطوط 237 ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ فرد قیام حیدر آباد کو بھی نمبر دیا گیا ہے اس لیے مجموعے میں نمبروں کی سیریز میں ایک نمبر زائد ہے۔ سطور ذیل کی مثالوں میں خطوط نمبروں ہی سے حوالے دیے گئے ہیں۔ جو مجموعے میں درج نمبروں ہی کے مطابق ہیں۔ ان کو درست نہیں کیا گیا ہے۔

مجموعے میں جملہ خطوط مکتوب الیہ کے ناموں کی حروف تہجی کی ترتیب سے شامل کیے گئے ہیں۔ ہر مکتوب الیہ کے خطوط کو تاریخی ترتیب میں رکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن ان کی تاریخیں بے ترتیب اور غیر مسلسل ہو گئی ہیں۔ یعنی یہ Chronological Order میں نہیں ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

خطوط صفحہ 35 سے صفحہ 291 کو محیط ہیں۔ ان خطوط کے مکتوب الیہ کی چھ حیثیتیں اور مدارج ہیں۔ جو یہ ہیں:

نمبر شمار		تعداد خطوط	تعداد مکتوب الیہ
-1	اعزہ	04	02
-2	احباب	19	05
-3	ارباب نشاط	17	04
-4	تلامذہ	149	28
-5	والیان ریاست و امرا (+ نامعلوم)	27	08

6-	متعلقین، عام قدر دان	21	16
	کل تعداد خطوط و مکتوب الیہ	**237**	**63**

سطور ذیل میں مذکورہ مدارج کی بنیاد پر خطوط داغ کی تقسیم کرتے ہوئے ان کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

1۔اعزہ: داغ کے اعزہ میں ان کی اہلیہ فاطمہ بیگم (ف 1897) کی دونوں چھوٹی بہنوں اولیاء بیگم اور عزیز بیگم کے نام دو دو خط ہیں۔ یہ تینوں رشتے میں داغ کی خالہ زاد بہنیں بھی تھیں۔ داغ کی بڑی خالہ راحت النسا بیگم ان کی والدہ تھیں۔ یہ خطوط روایتی انداز پر ہیں۔ان میں خیر و عافیت طلبی اور بعض خانگی باتیں ہیں۔ ان سے دو امور پر روشنی پڑتی ہے۔ اول یہ کہ داغ اپنے ننھیالی اعزہ سے مستقل ربط و تعلق رکھتے تھے۔ خط و کتابت کے ساتھ ساتھ روپیوں کے لین دین کا سلسلہ بھی تھا۔ داغ ان کی ہر طرح کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ان میں سے بعض کو انھوں نے ریاست رامپور و حیدر آباد سے ماہانہ وظائف بھی جاری کرا دیے تھے۔ اپنی چھوٹی سالی عزیز بیگم کو لکھتے ہیں:

روپے کی طرف سے نہ گھبرانا۔ جو کچھ میرے پاس ہے سب تمھارا ہے۔.... یہ دعا کرو کہ ہماری تمھاری تندرستی اور زندگی رہے۔تم کو ہماری جان کی قسم، جو تم ذرا بھی فکر کرو۔

(خط نمبر 168: مکتوبہ 15 دسمبر 1895)

دوم یہ کہ ان چار خطوط میں داغ کے خاندان کے تقریباً 20 افراد کے نام آگئے ہیں۔ جو ان کی عائلی زندگی کا حصہ تھے۔ان افراد کے رشتوں اور کوائف کا جاننا آج بہت دشوار ہے۔ مرتب" زبان داغ" بھی ان سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے داغ کی دونوں مکتوب الیہ پر جو نوٹ دیے ہیں وہ یہ ہیں:

اولیاء بیگم: داغ کی رشتہ دار تھیں مفصل حال نہ مل سکا۔ (ص:80)

عزیز بیگم: داغ صاحب نے جس لفافے میں یہ خط بھیجا تھا اس کے پتے میں عزیز بیگم کو چھوٹی ہمشیرہ لکھا ہے (ص 218)

ان خطوط میں داغ کے انھی بہن بھائیوں (اور ان کی اولادوں) کا ذکر آیا ہے جو داغ کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ اور جو داغ کے علاتی بھائی بہن تھے۔ مثلاً:

ضمیمے

امیر مرزا: جن کے والد مارسٹن بلاک نامی ایک انگریز تھے۔ یہ 1836 سے 1839 کے درمیان پیدا ہوئے۔

محمد شاہ عرف آغا مرزا متخلص بہ شاغل: ان کے والد آغا تراب علی تھے۔ یہ 1841 میں پیدا ہوئے۔ ان کا ذکر بعض دوسرے خطوط میں بھی آیا ہے۔ یہ رامپور میں ملازم تھے۔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ 4 جنوری 1898 کو وفات پائی اور رامپور میں مدفون ہوئے۔

مسیح جان عرف پادشاہ بیگم متخلص بہ مخفی: والد مارسٹن بلاک۔ ان کا ذکر بحیثیت شاعرہ کے ''تذکرہ ماہ درخشاں'' (از ابوالقاسم محتشم) میں موجود ہے۔

داغ کے ایک اور بھائی صاحب عالم عرف مرزا خورشید عالم (ف 1914) تھے۔ جو مرزا فخرو ولی عہد شاہ دہلی سے تھے۔ ان کا ذکر بعض دوسرے خطوط میں آیا ہے۔

داغ کی اپنی کوئی صلبی اولاد نہیں تھی۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بیگم نے اپنی ہمشیرہ اور داغ کی چھوٹی سالی اولیا بیگم کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا۔ ان کا ذکر بعض دوسرے خطوط میں بھی آیا ہے۔ داغ ان سے مثل اولاد کے محبت کرتے تھے۔ لاڈلی بیگم کا عقد سائل دہلوی (ف 1945) کے بڑے بھائی مرزا امتیاز الدین احمد خاں مائل دہلوی سے ہوا تھا۔ بیوہ ہونے کے ڈیڑھ سال کے بعد عقد ثانی داغ کی منشا سے سائل دہلوی سے ہوا اور وہ مستقل دہلی میں رہنے لگیں۔ بعد میں داغ نے اپنے علاتی بھائی امیر مرزا کے بیٹے احمد مرزا کو گود لے لیا۔ لیکن یہ بچہ کمسنی ہی میں فوت ہو گیا۔ داغ کو بہت صدمہ پہنچا۔ ''گلزار داغ'' کی ایک غزل میں احمد کا ذکر آگیا ہے:

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہو تباہ
دل کا سرور تھا مری آنکھوں کا نور تھا

اے داغ صدمۂ غمِ ہجراں، بجا، درست
یہ سب سہی مگر تجھے جینا ضرور تھا

مالک رام نے مذکورہ شعر کی بنیاد پر احمد کا ذکر داغ کی صلبی اولاد میں کیا ہے جو غلط ہے۔

(نقوش شخصیات نمبر 2 ص:851)

داغ کے دوسرے سوتیلے بھائی آغا مرزا شاغل کے بیٹے امراؤ مرزا ناداں بھی داغ کے ہمراہ حیدر آباد میں رہے۔ ان خطوط میں ناصر الدین احمد کو دعائیں لکھی گئیں ہیں۔ یہ لاڈلی بیگم کے پہلے شوہر مائل دہلوی کے فرزند تھے۔ داغ کو ان سے بھی بہت انس تھا۔ لاڈلی بیگم کو -/300 روپے اور ناصر الدین احمد کو ریاست سے ماہانہ منصب ملتا تھا۔ داغ کے ان چار خطوط میں ابھی متعدد نام ہیں جو اپنی شناخت چاہتے ہیں۔

2۔ احباب: احباب میں صرف 5 مکتوب الیہم میں نے انتخاب کیے ہیں۔ جو ان کے نجی معاملات کے رازدار و معاون تھے۔ ویسے بعض حیدر آبادی تلامذہ سے بھی ان کا دوستانہ تعلق تھا۔ ان پر تلامذہ کے ذیل میں گفتگو کی جائے گی۔ احباب مکتوب الیہم کے اسماء یہ ہیں۔

نمبر شمار	مکتوب الیہ	سال وفات	زمانہ مراسلت	تعداد خطوط
01	سید بہادر حسین انجم نیشا پوری	(ف 1911)	اپریل 1881 تا جولائی 1904	07
02	امیر احمد، امیر مینائی	(ف 1900)	دسمبر 1898 تا مارچ 1900	05
03	لالہ شمبھو ناتھ دہلوی		جنوری 1889	01
04	قاضی عبد الحمید کلکتوی		مئی 1885 تا جولائی 1902	04
05	عبد الغفور نساخ	(ف 1889)	جنوری، فروری 1886	02
	کل تعداد خطوط			19

ان احباب کے نام داغ کے یہ کل انیس خطوط ہیں۔ تین مکتوب الیہم انجم، قاضی عبد الحمید اور نساخ، منی بائی حجاب سے داغ کے معاشقے کے رازدار تھے اور اس سلسلے میں داغ کے اضطراب محبت کو حجاب تک پہنچانے میں معاون بھی۔ ان تینوں کے نام خطوط بڑے شوق و جذبے سے لکھے گئے ہیں اور بعض پیراگراف دلچسپ ہیں۔ لالہ شمبھو ناتھ دہلی چاندنی چوک میں ساہوکاری کرتے تھے۔ داغ سے دوستی تھی۔ وقتاً فوقتاً داغ ان سے قرض لے لیا کرتے تھے۔ ان کے نام خط اسی سلسلے کا ہے۔ البتہ امیر مینائی کے نام خطوط بڑے معرکے کے ہیں اور کسی قدر طویل بھی۔ یہ 1950 کے درمیان دریافت ہوئے۔ 1950 اور 1951 کے درمیان ان خطوط پر گرما گرم بحثیں بھی رسائل میں ہوئیں۔ بعض تلامذۂ داغ نے ان کو جعلی اور داغ کو امیر کے مقابل کم تر ثابت کرنے کی سازش بھی قرار دیا۔ تفصیل کے لیے

دیکھیے مرتب کا توضیحی نوٹ (ص:146-127) ان خطوط میں دو معاصر استادوں کے درمیان پر خلوص باہمی مشورت ہے۔ ایک دوسرے کے کمالات علمی کے اعتراف و اظہار کے باوصف کلام کے جھول یا تسامحات کی نشاندہی ہے۔ چٹکیاں بھی لی گئی ہیں اور شوخیاں بھی کی گئی ہیں۔ ایک دوسرے کی عظمت کے سامنے انکسار کا اظہار بھی ہے اور اپنے منصب جلیلہ اور اعزاز خاص کا اعلان واشتہار بھی۔ داغ کی نجی زندگی کی بابت بھی بعض کارآمد باتیں آ گئی ہیں۔ چند اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ ان سے داغ کے مزاج علمی اور آداب دوستی پر روشنی پڑتی ہے:

تمام عمر کا رفیق اور عاشق زار مجھ سے چھٹ گیا۔ کس سے کہوں، کیا کروں؟ سخت صدمہ ہے۔...
مرحومہ زبان اردو پر بہت قابض تھیں۔ اکثر محاوروں میں مجھ کو مدد ملتی تھی۔...کہیے منشی صاحب میری حیات کے جو نفس باقی ہیں کیوں کر گزر سکتے ہیں۔؟ کوئی تدبیر تو بتائیے:

مل جائے کوئی عاشق دیرینہ تو پوچھوں
کس طرح بسر کرتے ہیں ایام جدائی

(اہلیۂ داغ کی وفات پر خط نمبر 90 مکتوبہ 29 دسمبر 1898)

امیر اللغات [2] کے عیب و صواب کا دیکھنا میرا فرض منصبی ہے۔ شاگردوں کو بھی اس کی خریداری کے واسطے لکھوں گا... میرے پاس روپیہ نہ تھا، آپ کو خدا نے توفیق نہ دی، برابر ہوئے۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی نسخہ دیکھنے کو آ ہی جائے گا۔ مگر اب میرے پاس نہ بھیجنا۔ ورنہ میں واپس کر دوں گا۔

.....لفظ چتی بمعنی ڈنڈ یا دستک عین دلّی کی زبان ہے آپ کو اس کی سند کہیں ملی یا نہیں۔ لفظ لیلوٹ، جو لے کر نہ دے اس معنی میں آپ کو کہیں ملا۔

(خط نمبر 91 مکتوبہ 14 جون [3] 1891)

جناب منشی صاحب ارسطو تدبیر، شاعری کی لکیر پر فقیر منشی امیر احمد صاحب امیر، دام عنایتکم، اس اوچھے کا لمبا چوڑا اسلام قبول ہو.... میں تحریر سخت کا جواب بہ نرمی لکھتا ہوں مگر الٹی شکایت سنتا ہوں۔ یہ میرا مقدر... مقدم الف میں اگر کوئی زمین نئی خیال میں آئے تو مصرعے بھجوا دو۔ بلکہ پانچ سات۔

(خط نمبر 92 مکتوبہ 3 جولائی 1892)

(اس خط میں جناب کے ساتھ صاحب اور پان سات کی جگہ پانچ سات کھٹکتا ہے۔)

جو قصائد استاد (مراد ذوق) کے نئے دیوان میں چھپے ہیں، وہ ایک شخص کے پاس یہاں بھی ہیں۔ آزاد (محمد حسین آزاد) نے بطور خود بعض جگہ بڑا تصرف کیا ہے۔ میری کیا مجال کہ دخل دوں اور اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔

.... یار ہم نوکر تو ہو گئے مگر دعا کرو کہ اجرا بھی جلد ہو۔ سخت پریشان ہوں.... میری پیدائش 1346ھ 14 ذی الحجہ مطابق 1831 ہے[4]۔ آپ اپنی ولادت کی تاریخ لکھ بھیجیے کہ دیکھوں کس قدر تفاوت ہے۔ سنتا ہوں کہ نیا دیوان آپ کا چھپا ہے۔ وہ کہاں ہے؟ کیا قیمت ہے؟ ہماری تاریخ سے داغ لگتا۔ اس واسطے اطلاع نہ کی۔ یہ باتیں دل پر نقش ہوتی جاتی ہیں۔

(خط نمبر 93، مکتوبہ 1891)

آپ کے انتخاب سے میں خوش نہ ہوا، اور بہ سبب مہاجرت کے مذاق میں مغائرت ہوگئی۔ آپ کے شبہات پر میں نے غور کر کے بجا اور بے جا کا لحاظ رکھ کر ملفوف رقیمۂ نیاز کیا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مکرر ملاحظہ فرما کر جواب جلد لکھیے۔.... داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا۔ آپ یہ جانتے ہوں گے کہ داغ کی مشق بڑھی ہوئی ہے۔ مہتاب (مراد مہتاب داغ) کو چھپے دو برس کا زمانہ گزرا۔ اس دو برس میں بیس غزلیں کہی ہیں۔ کیا اسی کا نام مشق ہے؟.... چھ مہینے کے سفر میں تین سو غزلیں میں نے بنا کر بھیجی ہیں۔ ہزار آٹھ سو اس وقت باقی ہیں۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو بھیج دوں، مگر آپ کے پاس کیا اس سے کم ہوں گی؟ آپ کی نازک مزاجی کب متحمل ہو سکتی ہے؟

....علاوہ منصب جلیلۂ استادی کے، اب میں اسٹاف خاص میں بھی داخل ہوا ہوں۔ اس کی تنخواہ[5] دو ہزار روپے سے کم نہیں ہوتی۔ لوگ مبارکباد دے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ملا ہے یہی میری لیاقت سے زیادہ ہے مجھ میں تو دس روپے ماہوار کی بھی لیاقت نہیں۔..... مجھ کو یہ فکر ہے کہ آپ کو میرے بخشوانے کا اتنا خیال کیوں ہے؟

(خط نمبر 94۔ مکتوبہ 16 جولائی 1894)

3۔ ارباب نشاط: داغ کی مکتوب الیہم چند ارباب نشاط بھی ہیں۔ داغ کی شہرت و مقبولیت

میں طوائفوں سے ان کے رسم و تعلق کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ تمکین کاظمی نے اپنے طویل مضمون ''حیدرآباد کی چند شخصیتیں'' میں سید جلال الدین توفیق حیدرآبادی کے تذکرے میں لکھا ہے:

رنڈیوں سے پبلسٹی کا کام حیدرآباد میں سب سے پہلے داغ نے لیا۔ پہلے غزل کی پبلسٹی کے دو ہی طریقے تھے۔ مشاعرے یا رنڈیاں۔ لوگ مشاعرے میں غزل سن کر اکثر شعر یاد کر لیتے جو مشہور ہو جاتے۔ یا پھر رنڈیاں غزلیں گاتیں تو ان سے سن کر عوام بھی گانے لگتے۔ داغ نے تو ایک دو رنڈیاں ہمیشہ نوکر رکھیں اور ایک قوال بھی ہمیشہ نوکر رہا۔ شام میں رنڈیاں آتیں داغ اپنی تازہ غزل دے دیتے۔ وہ یاد کر لیتیں۔ دھن یا تو خود بتاتے یا وہ خود دھن نکال کر سناتیں تو مشورہ دیتے۔ اس طرح غزلیں گوا کر سنتے۔ یہ غزلیں داغ کے پاس سے واپس جاتے ہی رنڈیاں اپنی سہیلیوں کو سناتیں اور دوسرے روز وہ گاتیں۔ ان کے چاہنے والے اور سننے والے ان غزلوں کو گلی گلی پہنچا دیتے۔ اور غزل جس دن کہی جاتی اس کے دوسرے روز شہر بھر میں مشہور ہو جاتی۔ اسی طرح داغ کا قوال رحمت اللہ بھی ان کی غزلوں کی پبلسٹی کرتا۔ (نقوش شخصیات نمبر ص: 1286)

ماضی میں لفظ طوائف کا ایک خاص معاشرتی مفہوم تھا لیکن آج اس لفظ کو رنڈی یا کسبی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں طوائف کے مختلف سماجی درجے تھے۔ زنانِ خانگی (یعنی کسبیاں) زنانِ بازاری (یعنی رنڈیاں) طوائف یا ڈیرے دار طوائف کی حیثیت ایک فن کار یا آرٹسٹ کی سی تھی۔ یہ امیروں اور رئیسوں کی زندگی میں سامانِ امارت اور اسبابِ راحت کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہ کسب نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کا مشغلہ رقص و موسیقی، امرا کی ذہنی تفریح یا ان سے یاری دوستی تک محدود تھا۔ مختلف میلوں اور تفریح گاہوں میں ڈیرے لگا کر رقص و سرود کی محفلوں سے میلوں کی رنگینیوں میں اضافہ کرتیں، اور مال و متاع حاصل کرتی تھیں۔ طوائف کے لیے محض حسین و جمیل ہونا ہی کافی نہیں تھا بلکہ اطوار و آداب، شائستگی و تہذیب سے آراستہ ہونا بھی ضروری تھا۔ ان میں بعض رقص و موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں۔ بعض فی البدیہہ شعر گڑھنے اور حاضر جوابی میں طاق ہوتی تھیں۔ بعض شعرائے فارسی و اردو کے معیاری کلام کی حافظ اور اس کو صحیح تلفظ اور ترنم کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہوتی تھیں۔ یہ جنسی تعلقات میں بہت محتاط ہوتی تھیں۔ یہ کسی ایک رئیس سے یا زیادہ سے زیادہ دو تین

رئیسوں کے یہاں ملازمت کر کے یا ان سے وابستہ ہو کر عمریں گزار دیتی تھیں۔لیکن دوسرے رئیسوں سے دوستانہ مراسم قائم رکھتی تھیں یہ ان کے آذوقۂ حیات کے لیے ضروری تھا۔

داغ کی زندگی میں طوائف کا عمل دخل ریاست رامپور میں قیام و ملازمت کے دوران (1857 تا اپریل 1866۔ بطور مہمان۔ اپریل 1866 تا دسمبر 1887 بطور ملازم) ہوا۔ اس سلسلے میں سید رفیق مار ہروری لکھتے ہیں:

''نواب کلب علی خاں نے رامپور میں سال 1865 میں'' میلہ بے نظیر'' لگوایا تو یہ (منی بائی حجاب) کلکتے سے رامپور تشریف لائیں اور جناب داغ سے ملاقات ہوئی۔(6) نہ معلوم کیا ادا بھائی کہ داغ صاحب دل دے بیٹھے۔.... 1881 میں دوبارہ '' میلہ بے نظیر'' میں شرکت کی۔(7) داغ صاحب سے محبت کے اور پینگ بڑھے لیکن اس دفعہ حجاب کے کچھ اور ایسے قدر دان پیدا ہو گئے کہ حضرت داغ کو رقیب کی رقابت سے بھی واسطہ پڑا.... حجاب کچھ عرصے رامپور رہ کر کلکتے واپس گئیں لیکن اس دفعہ وہ داغ کے دل و دماغ کو کچھ اتنا متاثر کر گئیں کہ ان کی زندگی بدمزہ گزرنے لگی۔ مثنوی '' فریاد داغ'' اسی عشق و محبت کا نتیجہ ہے۔ حالات جب ناقابلِ برداشت ہو گئے تو 1882 میں حجاب سے ملاقات کرنے کلکتے گئے اور کچھ روز وہاں رہ کر دادِ عیش دے کر واپس ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے یہ محبت سرد پڑ گئی اور گاہے گاہے خط و کتابت پر محدود ہو گئی۔ 1901 میں حجاب کی محبت نے پھر جوش کھایا اور بڑی کوششوں کے بعد 1902 میں منی بائی حجاب حیدرآباد تشریف لائیں اور دو تین سال رہیں۔ داغ کا یہ آخری زمانہ تھا۔ عمر کے ساتھ جذبات بھی سرد پڑ چکے تھے۔ حسن پرستی فطرتِ ثانیہ تھی لہٰذا اس آخر زمانے میں ارباب نشاط کی وابستگی بجز وضعداری کے اور کچھ نہ تھی۔ بعض حالات کی بنا پر.. حجاب کے تعلق خراب ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ 1904 میں بی حجاب کلکتے واپس چلی گئیں۔

(زبان داغ ص: 181)

مذکورہ طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاری اس پس منظر سے واقف ہو جائے جس کے تحت حجاب کو خطوط لکھے گئے۔ اس اقتباس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منی بائی حجاب داغ کے دل و دماغ پر 1879 سے تا وفات 1905 چھائی رہیں۔

منی بائی حجاب، ان کی بہن حمیدن بائی نقاب، کلکتے ہی کی مشہور طوائف گوہر جان کی ماں ملکہ جان ملکہ سے رامپور میں قیام کے دوران ہی مراسلت کا آغاز ہوگیا تھا۔ حیدر آباد میں مالی اعتبار سے جب داغ بہت خوش حال ہو گئے تو انھوں نے رئیسانہ وضع اختیار کرتے ہوئے بعض طوائفوں کو ملازم بھی رکھا۔ آگرے کی صاحب جان میرٹھ کی عمدہ جان اور سورت کی اختر جان اور ایک قوال رحمت اللہ کا نام داغ کے سوانح نویسوں نے لکھا ہے یہ سب تنخواہ دار ملازم تھے۔

داغ طوائفوں کی صحبتوں اور محفلوں کے اس درجہ حریص تھے کہ اپنے اکثر دوستوں اور بعض تلامذہ سے بھی اس سلسلے میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ ان کے شاگرد قطب الدین اشک جلیسری نے جلیسر کے قرب وجوار کی کسی طوائف کا خط میں ذکر کر دیا۔ داغ کا اشتیاق بھرا خط انھیں موصول ہوا۔ خط کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

جس کافر ادا کا تم نے ذکر کیا ہے اس سے ملاقات کیسے ہو۔ سعد آباد سے جلیسر قریب ہے لیکن سعد آباد تک کیونکر پہنچا جائے۔ مجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں"......اگر آپ سے ہو سکے تو اس فسوں گر کا فوٹو اتروایئے اور مجھے بھیجیے۔ وہ کس رئیس سے متعلق ہے یہ آپ نے نہ لکھا۔ میں اس کافر ادا کے تفصیلی حالات کا جویا ہوں۔.....آپ نے جو سراپا کھینچا ہے دل میں اس نے عجب شوق پیدا کر دیا ہے۔

(خط نمبر 84، مکتوبہ 12 ستمبر 1899)

جنوری 1902 میں نوح ناروی (ف 1962) استاد کی قدم بوسی کے لیے حیدر آباد گئے تو تحفے میں استاد کے لیے ایک طوائف کی تصویر لے گئے۔ جو استاد کو بہت پسند آئی۔ منی جان نامی طوائف کے نام خط اسی تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔

طوائفوں سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی کے کئی اسباب تھے۔ مثلاً طوائفوں کا سخنور ہونا۔ اور ان کا مغنی ہونا۔ داغ معمولاً غزل گوا کر سنتے تھے۔ نواب حسن علی خاں امیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

بی حجاب کو اصرار ہے کہ اختر جان کو علیحدہ کر دوں اور اگر گانا سنوں تو کبھی کبھی کسی کو طلب کر کے دل بہلا لیا کروں.... جس روز سے یہ جھگڑا کھڑا کیا ہے مجھے گانا سننے کو نہیں ملا ہے۔ دل کی عجیب حالت ہے۔ کوئی عذر کر کے آپ کے یہاں آتا ہوں۔ اختر جان کو بلایا ہے وہ عجب کیا کہ مجھ سے پہلے پہنچیں۔

گانے کا بندوبست آپ کے یہاں ہوگا۔

(خط نمبر 72 سنہ ندارد)

تمکین کاظمی نے طوائفوں سے پبلسٹی کا کام لینے کا جو سہرا داغ کے سر باندھا ہے، داغ کے خطوط سے اس کا کوئی بھی اشارہ نہیں ملتا۔ بہر کیف ''زبان داغ'' میں جن طوائفوں کے نام داغ کے خطوط ملتے ہیں۔ان کے نام یہ ہیں:

نمبر شمار	نام طوائف	تعداد	سنہ مکتوبہ
01	بنی جان	01	23 جنوری 1902
02	منی بائی حجاب	11	30 ستمبر 1879 تا 20 مارچ 1902
03	حمیدن بائی نقاب	03	5 ستمبر 1885
04	ملکہ جان ملکہ	02	13 مارچ 1886

حمیدن بائی اور ملکہ جان کے نام جو پانچ خط ہیں، وہ بھی دراصل منی بائی حجاب سے محبت ہی کی کڑیاں ہیں۔ان تمام خطوط میں داغ کی حسن پرستی، وارفتگی و شیفتگی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی رنگینی و شوخی بھی ہے۔ ان میں معشوق کو راضی و ہموار کرنے کے حیلے ہیں۔ اپنی آن کو برقرار رکھنے کی بھی امکان بھر کوشش ہے۔ یہ خطوط دلچسپ بھی ہیں اور داغ کی طبیعت کو سمجھنے کے لیے معنی خیز بھی۔ان میں داغ کے دل میں لگی آگ کی آنچ محسوس کی جا سکتی ہے۔چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

دل دار و دل نواز! کیا غضب ہے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی تمھاری نگاہیں پھر گئیں۔ وہ سب قول و قرار یک لخت فراموش کر دیے۔خط روانہ کیا تھا وہاں کی دلچسپیوں میں اتنی محو کہ جواب دینا محال۔ کیا میرے سینے میں دل نہیں یا دل میں تڑپ نہیں۔کیا بے قرار ہونا مجھے نہیں آتا، کیا تلملانا میں نہیں جانتا اس خط کا جواب جلد سے جلد نہ آیا تو خود بازار جا کر زہر لاؤں گا اور بے موت مر کر دکھا دوں گا۔

(خط نمبر 135 بنام منی بائی حجاب مکتوبہ 30 ستمبر 1879)

غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو۔پاس ہوتیں تو سیر ہوتی۔کبھی تمھارے گرد گھومتا اور شعلۂ جوالہ بن جاتا۔کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو جاتا۔کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو

جاتا۔ ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی ہے کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا۔ خدا کے واسطے جلد آؤ۔

(خط نمبر 133 بنام منی بائی حجاب مکتوبہ 5 ستمبر 1880)

بے شک تم نے حرملہ اور ابن سعد کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ تم بے شک خولی اور ابن نمیر کی گود میں بیٹھیں اور تم یقیناً یزید کی معشوق بنیں۔ میرے جسم میں خون ہانڈی کی طرح پک رہا ہے۔ تمھیں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شکرے مل کر نوچا کھسوٹا کریں۔ آخر یہ کیا سر میں سمائی ہے کون جانے اس کا کیا انجام ہو۔ یہی لیل ونہار ہیں تو داغؔ کا سلام قبول ہو۔ دل پر جبر کی سل رکھوں گا مگر تمھارا نام نہ لوں گا۔ آخر بے حیائی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

(خط نمبر 134 سنہ ندارد بنام منی بائی)

نیک بخت پاک دامن بے لوث منی بائی صاحبہ حجاب سلامت رہیے۔

گستاخی معاف گزارش واقعی ہے، نہ شکایت بیجا۔ کیا خوب مجھ پر آسمانِ حوادث ٹوٹ پڑے۔ میرے دانت نکل جائیں (دانتوں کے ٹوٹ جانے کا ذکر ہے) آپ دانت نکال کر ہنسیں۔ سلامتی سے پورا خط دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر دیکھا تو سمجھے کون غرض، کس کو توجہ، کیسی (؟) کوئی کل کا مرتا آج مر جائے تو گھی کے چراغ جلیں..... مثنوی تمھاری تھی۔ تمھارے حال کی تھی، تمھارے صفات کی تھی (مراد فریادِ داغ) میں نے تو وہ حال واقعی موزوں کردیا ہے۔ کیا خبر تھی کہ بی حمیدن نالائق ٹھہرائیں گی .....صاحب مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں، مہینہ بھر ہی میں فروخت ہوگئیں۔ مکرر چھپیں گی۔ (9) خدا جانے اس مثنوی کا اثر تم نے کیا دیکھا۔ مجھ پر تو چار طرف بوچھار ہے اور اشتیاق ہے جو اس کلام کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں کہ مرزا داغ سلامتی سے سولہ برس کے ہوں گے۔

(خط نمبر 138 بنام منی بائی حجاب سنہ ندارد)

بہت دل شکستہ اور ارمان بھرا بے سرو پا آتا ہوں۔ (10) میری لاج تمھارے ہاتھ ہے یا خدا کے ہاتھ..... میں نہیں چاہتا کہ میرا ابھی سے جانا وہاں ظاہر ہو اس خط کو پڑھ کر چاک کر ڈالنا۔ تمھاری وجہ سے وہاں میرے دشمن بہت ہیں اخدا سے تائید اور تمھارا التفات چاہتا ہوں۔ بہتر تو یہی تھا کہ میں

مصارف زادِراہ بھجوا دیتا اور تم قدم رنجہ فرماتیں۔ مگر کلکتے کی قطب بن کر بیٹھ گئی ہو۔ میں کیا کروں۔

(خط نمبر 141 بنام منی بائی مکتوبہ 30 جولائی 1887)

جنابِ من:

جو منشا ہے وہ نواب صاحب کی زبانی کہلوا چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھ سے امید نہ رکھو۔ مکان کا کرایہ میرے ذمے۔ تمھارے ملبوس اور دوسرے متعلقات میرے ذمے۔ تو پھر سو روپیہ تمھارے لیے کیوں کافی نہیں ہیں۔ ادھر ادھر سے قرض لینا اچھا نہیں۔ خود ذلیل اور میں مطعون ہوتا ہوں ان لوگوں سے جو تمھارے سر ہیں۔ کہو! کہ وہ خود اپنے کفیل ہوں۔ دوسروں پر بار بننا کسی طرح مناسب نہیں۔

(خط نمبر 137 بنام منی بائی سنہ ندارد)

کاش اس قدر میں دیدار حق کا مشتاق ہوتا۔ میں نے پہلے سنا تھا کہ قرآن اٹھ گئے ہیں۔ عہد و پیماں ہو گئے ہیں مجھ سے نہ ملنے کے، اب یقین ہوا کہ بائی جی کو جی لگا لینا آتا ہے لگا رکھنا نہیں آیا۔

(خط نمبر 142 بنام حیدن بائی سنہ ندارد)

بائی جی (مراد منی بائی حجاب) نے میرا کلام منگایا تھا جو میرے پاس ہے حاضر ہوگا۔ میں کتب فروش نہیں۔ یہ آپ کو خوب معلوم ہے۔ مثنوی نایاب ہو گئی۔ گلزار داغ (11) نہیں ملتا۔ آفتاب داغ (12) کا ایک نسخہ سرکار میں آیا مجھے ابھی تک نصیب نہیں ہوا۔ وہ دن گئے کہ کلام تعویذ کر کے رکھا جاتا تھا۔ یہ شعر اپنا اپنی زبان پہ ہے:

گیا ہے عرش معلٰی پہ شور نالوں کا
خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا

یہ بھی خیال رہے کہ آج تک خلاف منشا وارشاد کسی سے رسم نہیں رکھے گئے۔ مجھے کیا غرض کہ دشمنوں سے خط کتابت رکھوں۔ زندگی کا اعتبار نہیں۔ بڑی دوستی یہی ہے کہ میرے حق میں دعائے خیر کرو اور میرا کہا سنا معاف کرو۔

(خط نمبر 144 حیدن بائی مکتوبہ 5 ستمبر 1885)

ملکۂ اقلیم سخنوری، بنارس کی صنم کلکتے کی پری! دام جمالہا و کمالہا۔

کیوں جی! خدا نے مجھے کیوں عاشق مزاج بنایا ہے۔ اس بلا میں کیوں پھنسایا، پتھر کا دل، لوہے کا کلیجہ کیوں نہ بنایا جس میں کوئی اچھی ادا دیکھی طبیعت لوٹ گئی۔ خصوصا کوئی معشوق خواندہ ہو اور شعر گوبھی ہو مرزا داغ کی موت ہے۔ فریادِ داغ کے مطالعے سے کیفیت معلوم ہوئی ہوگی۔

رحم آتا ہے اپنی حالت پر
پڑیں پتھر بتوں کی چاہت پر

....آہا! یہ تو کہیے میں نے سنا ہے کہ منی بائی سے بڑے ربط وضبط ہیں۔ خدا خیر کرے۔ بارے میری برائی سننے میں تم شریک نہ ہوتی ہوگی۔ خیر یہ صبر خالی نہ جائے گا۔ ہم بھی سہاگ بھاگ گاتے ہیں۔ گوہر جان(13) کو ہمارا سلام کہہ دینا۔ یقین ہے کہ یہ بھی پڑھی ہوں گی۔

ایں خانہ تمام آفتاب است۔

(خط نمبر 219 بنام ملکہ جان مکتوبہ 13 مارچ 1886)

دل ربا، سخن آرا، حور لقا، پری ادا، دام جمالہا و کمالہا۔

تمھارا پہلا خط جو ایک دفتر شکوہ وشکایت تھا مجموعۂ رشک ورقابت تھا، میرے پاس پہنچا۔ اس کا جواب مناسب میں نے تمھارے مکان پر بھیجا اور نہ پہنچا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ نہایت بد انتظامی اور ذکر تو بھی گوہر جان کی متصور ہے۔ مسودہ کیسا۔ قلم برداشتہ خط لکھتا ہوں....

ملکہ جان تھوڑا سا اپنا حال لکھ کر تم کو اطلاع دینی ضروری جانتا ہوں۔ کان رکھ کر سنو(14)۔ الحمد للہ کہ مجھ کو خدا نے عالی خاندان کیا۔ دلی میرا وطن ہے۔ جب وہ برباد ہوئی تو احتیاج روزگار ہوئی۔ رام پور میں نوکر ہوں۔ رطب ویابس اللہ تعالیٰ گزارتا ہے۔ چالیس پچاس آدمی کا رزق خداوند کریم دیتا ہے۔ رئیس میرا قدر دان ہے اور ہم عمر وہم وطن(15) منفعت دنیا پر اگر نظر کرتا تو بہت کچھ پیدا کر لیتا۔ ہندوستان میں کون سی جگہ ہے جہاں سے اس عاجز کی طلب نہ ہوئی۔ مگر اپنا حال یہ ہے:

کرا دماغ کہ از کوئے یار بر خیزد
نشستہ ایم کہ از تا غبار بر خیزد

....میرے خمیر میں عشق ہے۔ میں وفا کا پتلا ہوں۔ جو مجھ سے ملا اور دل کر چھوٹا یاد کرتا رہا۔ اس

صورت میں بھی ملاقات کا لطف ہے۔اب تک کوئی آدمی مجھ کو مہربان مزاج داں نہ ملا کہ حجاب کا داغ، داغ کے دل سے مٹا دیتا۔ بہت تلاش کی اور بے اور رہے گی تم کو ایک وضعدار سنا تھا کہ اس کا ثبوت نامہ ہائے دلنواز سے پایا گیا۔ دنیا میں ایک سے ایک اچھا ہے نہ مرزا داغ پر موقوف ہے نہ حجاب پر منحصر۔

داغ اک آدمی ہے گرما گرم
خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ

(خط نمبر 220 بنام ملکہ جان مکتوبہ 9 اگست 1886)

حور کی صورت نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو.... کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں، تم کو کیوں کر دیکھیں، کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جئیں۔ جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا۔ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ۔ ہائے مجبوری، وائے مجبوری......

سوئے ادب کے خیال سے تمھارے نام میں ایک نقطے کا تغیر و تبدل کر دیا ہے (نون) کا نقطہ (ب) کی جگہ اور (ب) کا نقطہ (نون) کی جگہ۔ یعنی بجائے بنی جان (ب ن ی) کے نبی (ن ب ی) جان۔ تمھاری تصویر کی شان میں ایک رباعی کہی ہے:

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر
سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا حال
کھنچوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

(خط نمبر 96 بنام ملکہ جان، مکتوبہ 23 جنوری 1902)

4۔ تلامذہ: داغ کے خطوط کا بڑا حصہ ان کے تلامذہ کے نام ہے۔ ان میں نامی گرامی شاگردوں کے علاوہ بعض غیر معروف تلامذہ بھی ہیں۔ جوش ملسیانی (ف 1976) کے بیان کے مطابق داغ کے تلامذہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار تھی۔ (نقوش شخصیات نمبر ص: 711) لیکن داغ سے متعلق کتاب صرف 212 تلامذہ ہی کی نشاندہی کر سکی ہیں۔(16) خطوط داغ میں بعض ان تلامذہ کے نام آ گئے ہیں جن کو دستیاب فہرست تلامذہ میں شامل نہیں کیا جا سکا۔(17) جس کثرت سے داغ کے شاگرد تھے خطوط

کی تعداد اس لحاظ سے بہت کم ہے۔ 28 تلامذہ کے نام کل 149 خطوط ہیں۔ راقم الحروف کی نظر میں خطوط داغ کی اہمیت کو محسوس کرنے اور ان کی جمع و ترتیب سے عدم توجہی کی حسب ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:

اول یہ کہ داغ کو ہر روز پندرہ بیس خطوط موصول ہوتے تھے جن میں برائے اصلاح غزلیات کی تعداد زیادہ تھی۔ داغ غزل کی اصلاح کے ساتھ ہی اسی کاغذ کے حاشیے یا پشت پر جواب لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ خطوط جن میں کوئی استفسار کیا گیا ہو، سننے کے بعد سطر دو سطر میں اس کا بھی جواب لکھوا دیا جاتا تھا۔ یہ جواب کبھی کبھی ایک فقرے پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔ احسن مارہروی کے نام اس طرح کی عبارتیں جمع کر کے خطوط کے طور پر ''زبان داغ'' میں شامل کر لی گئی ہیں۔ القاب و آداب، خاتمہ، تاریخ و دستخط سے عاری ان عبارتوں کو خطوط کی صورت میں قبول کرنا کہاں تک درست ہے؟

دوم یہ کہ داغ بقلم خود بہت کم خطوط کے جواب دیتے تھے۔ اکثر املا کراتے تھے۔ دو آدمی اس کام کے لیے متعین تھے۔ (18)

سوم یہ کہ خطوط کے جوابات اور غزلوں کی اصلاحیں دفتری کام کی طرح ان کے معمول کا حصہ تھا۔

چہارم یہ کہ خطوط کی جمع و ترتیب کا کام بہت تاخیر سے شروع ہوا۔ غالب اور شبلی کے خطوط کی جمع آوری کا کام ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن داغ کے خطوط کی جمع آوری ان کی وفات کے 34 سال بعد شروع ہوئی۔ یہی وجوہات رہی ہوں گی جو داغ کے خطوط کا قابل ذکر سرمایہ فراہم نہیں ہو سکا۔ داغ کے وہ مکتوب الیہ جو شاعری میں ان کے شاگرد تھے۔ حسب ذیل ہیں۔ ''زبان داغ'' میں ان میں سے بعض کے تخلص، بعض کے وطن بعض کے نسبت تلمذ کی نشاندہی نہیں کی جا سکی ہے۔ میں نے ان کو الف بائی ترتیب میں کر کے متعلقہ معلومات اور دستیاب سال وفات کا اضافہ کر دیا ہے۔

نمبر شمار	تلامذہ	سال وفات	تعداد خطوط
01	آزاد مارہروی، سید افتخار عالم	(ف 1924)	05
02	آصف، میر محبوب علی خاں، آصف جاہ نظام دکن	(ف 1911)	01
03	احسن مارہروی، سید علی احسن	(ف 1940)	47
04	اشک جلیسری/ دہلوی سید قطب الدین		02

05	افسوں شاہجہانپوری، اکبر علی خاں		01
06	امیر حیدرآبادی، نواب سید حسن علی خاں	(ف 1935)	15
07	بیخود دہلوی، سید وحید الدین احمد	(ف 1955)	14
08	بیدار، مہاراج یوراج بیر برٹھاکر ہرکشن بہادر، (پنجاب کے رئیس)	......	05
09	تسنیم، محی الدین حسین خاں (مدراسی)	......	01
10	حسرت سعد آبادی، کنور اعتماد علی خاں	(ف 1937)	11
11	حیرت بدایونی، سید عنایت احمد نقوی	(ف 1939)	01
12	دل، نواب محمد حیدر خاں (طبیب نظام دکن)	...	03
13	دلیر مارہروی، سید امیر حسن	(ف 1958)	01
14	سائل دہلوی، سراج الدین احمد خاں	(ف 1945)	01
15	سجادہ، سید زین الدین (بیدر کے رہنے والے)		05
16	شاد دہلوی، شیخ عبدالرزاق	(ف 1906)	01
17	شرف، صاحبزادہ مشرف یار خاں (ریاست جاورہ کے منصب دار)		02
18	طپش مارہروی، محمد یوسف حسن		03
19	عزیز حیدرآبادی، عزیز یار جنگ، محمد عزیز الدین خاں	(ف 1949)	04
20	فوق لاہوری، محمد الدین (صحافی)	(ف 1945)	03
21	گوہر رامپوری، ذوالفقار علی خاں علی برادران کے بڑے بھائی۔	(ف 1954)	03
22	مائل مین پوری، دیبی پرشاد	(ف 1940 سے پیشتر)	04
23	محمود رامپوری، محمود علی خاں	(ف 1934)	09
24	مطلب اجمیری، حبیب اللہ خاں		01
25	نادر، نادر حسین (ساکن سنبھل)		01

26	ناطق گلاؤٹھی، سید ابوالحسن	(ف 1969)	01
27	نسیم بلسوی، سید نذیر احسن (ساکن پٹنہ)	......	01
28	واقف فرخ آبادی، سید محمد اصغر حسین عرف لاڈلے صاحب	.. ..	03
	کل تعداد خطوط		149

مذکورہ تلامذہ کے نام خطوط میں داغ کی سوانح، شخصیت اور فکر وفن سے متعلق جو پہلو ابھر کر آئے ہیں، ان کی نوعیت یہ ہے:

الف: داغ اپنے تلامذہ کے ساتھ غیر رسمی تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق میں اخلاص ومحبت بھی ہے، شفقت و ہمدردی بھی۔ رواداری بھی ہے اور وضعداری بھی۔ دوستانہ بے تکلفی بھی ہے اور راز درون پردہ میں ان کی شرکت بھی۔ داغ ہر نئے اور پرانے اہم وغیر اہم جملہ شاگردوں کے ساتھ خلوص کو قدر مشترک کے طور پر روا رکھتے ہیں اور ان کے معاملات زندگی میں ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ خواہ وہ ملازمت سے متعلق سفارشات ہوں یا ان کی مطبوعہ کتب کو نظام دکن یا دوسرے امرا تک پہنچانے کا کام ہو یا ان کتب کی فروخت کے سلسلے میں اپنے دوسرے تلامذہ کو ہدایت دینے اور ان کو متوجہ کرنے کا عمل ہو۔ چند اقتباسات مثال میں پیش کیے جاتے ہیں:

آمدنی کی کیا شکل ہے۔ بسر اوقات کیوں کر ہوتی ہوگی۔ پریشانی تو ظاہر ہے۔ یقین ہے کہ تم عیال دار تو ہو گئے ہو گے۔ دونوں غزلیں کیا خوب ہیں۔ خصوصاً پہلی غزل پر تو مجھ کو بھی رشک آیا تھا۔

(خط نمبر 207 بنام محمود رامپوری)

دوسرے خط میں آپ نے اپنا اشتیاق لکھا ہے۔ میں بھی مشتاق ہوں۔ ضرور تشریف لائیے۔ جس وقت آپ یہاں پہنچیں گے جو مصارف آپ کے ریل کے ہوں گے وہ دیے جائیں گے۔ مگر دو شرط ہیں اول تو یہ کہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر کام (قیام) کرنا ہوگا۔ دوسرے جلد واپس جانا نہ ہوگا۔

(خط نمبر 213 بنام محمود رامپوری)

سید صاحب۔ میں اکثر لکھ چکا ہوں کہ قسمت یاور ہو تو اس سرکار عالی سے عطا ہو۔ قصیدہ، قطعہ سب لکھ چکے۔ گویا وہ عرضیاں تھیں..... یہاں صاف سعی کرنے سے تو بنی بات بگڑ جاتی ہے۔ مجھ کو تمھارا اور احسان (مراد احسان شاہجہانپوری) کا ہر وقت خیال ہے۔ وہ بھی سب کچھ لکھ چکے اگر مناسب جانو تو اپنا

نقصان گوارا نہ کرو۔

(خط نمبر 16 بنام احسن مارہروی)

تمھارا استاد بوڑھا ہے مگر ہزار جوانوں سے بہتر۔ کبھی دل میں آتا ہے اپنا عاشق آپ ہو جاؤں۔
راجہ صاحب۔ ہمارے عاشق تم ہو جاؤ۔ خدا کے لیے ہو جاؤ۔ بھگوان کے لیے ہو جاؤ۔

(خط نمبر 97 بنام بیدار)

مہینوں بعد یاد کیا اور پھر الٹا اشتیاق جھوٹا جتلایا۔ میں چاوڑی کا رہنے والا نہیں۔

(خط نمبر 105 بنام بیخود دہلوی)

اس وقت جھاڑی میں نظام کا کیمپ ہے۔ یہاں کبھی کوئی بادشاہ تو کیا فقیر بھی نہیں آیا۔ موسم گرم ہے۔ ویرانہ محض ہے۔ مگر:

ہر جا کہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

......جن کے واسطے دیوان مانگتے ہو ان کو میں نہیں جانتا۔ واضح طور پر لکھو۔ دیوان کیا، اس جنگل سے تھوڑی وحشت کہو تو بھیج دوں۔

(خط نمبر 103۔ بنام بیخود دہلوی)

اے راجہ بہادر۔ مجھ کو کیا معلوم کہ کان پنجاب، جان پنجاب کون ہے؟ میری عاشق مزاجی کا شاہد واقعی میرا کلام ہے۔ جب سامنے معشوق ہوتا ہے تو سو سرور حاصل ہوتے ہیں۔ مجھ کو شراب پینے کی ضرورت نہیں۔

(خط نمبر 101 بنام بیدار)

نواب صاحب! آپ تو بیٹھے بٹھائے کلیجے میں نشتر چبھو دیتے ہیں۔ یہ فقرہ کیوں کر دل دوز اور جگر فگار نہ ہو کہ اب مجھے روز کی حاضری سے معاف فرمایا جائے۔ مجھ سے جو کچھ ہوا دانستہ نہیں ہوا۔ حجاب جیسی ہزار ہوں تو تمھارے خلوص تمھاری محبت پر نثار۔ تم سے کیا پردہ ہے۔ تم اس پرچے کے جواب میں فوراً آؤ اور مجھ سے کچھ سنو۔

(خط نمبر 64 بنام امیر حیدر آبادی)

یہ رقعہ ایک خاص معاملے میں آپ کو لکھا جاتا ہے جس کی طرف آپ کو توجہ بھی خاص طور پر کرنی چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب (آزاد) میرے دلی اور مخلص دوست جو ایک نہایت لائق وشریف اور ہر طرح قابلِ اعتماد شخص ہیں ان کی ملازمت کا کوئی انتظام میں چاہتا ہوں کہ ہو جائے......ایسے لوگوں کا سلسلۂ ملازمت میں داخل ہونا خود سرکاری مقاصد کے لیے نہایت مفید ہے۔

(خط نمبر 76 بنام امیر حیدرآبادی)

آپ کی بھیجی ہوئی تاریخ حضور پرنور کی خدمت میں گزار چکا ہوں۔ ممدوح نے اسے ملاحظہ فرما کر آپ کے ذہنِ رسا کی بہت تعریف کی۔ آپ کا یہاں ہونا کچھ کام بنا تا دیکھیے کیا ظہور میں آتا ہے۔

(خط نمبر 79 بنام آزاد)

(ب) :ان خطوط سے شعری اصلاح وتربیت کے سلسلے میں داغ کے طریقۂ کار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ داغ اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ بڑے بڑے سخنوروں نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ان کی شاگردی اختیار کرنا اس دور کے شعرا کے لیے وجہ افتخار تھا۔ بایں صورت ان خطوط میں ان کے دفترِ اصلاح، صورتِ اصلاح اور دستورِ اصلاح پر بھی اشارے ملتے ہیں۔ چند اقتباسات:

شاگردوں کا رجسٹر جو آپ نے طلب کیا ہے، ایک کتاب ہے۔ کوئی لکھنے والا مل جائے تو لکھوا کر بھیج دیا جائے گا۔ (خط نمبر 112 بنام بیخود بدایونی)

آپ کا نام شاگردوں میں لکھا گیا۔ اطمینان رکھیے۔

(خط نمبر 1 بنام احسن مارہروی)

ایک غزل نمونے کے لیے بھیج دو تا کہ تمھاری طبیعت کا اندازہ لگایا جائے۔

(خط نمبر 184 بنام فوق لاہوری)

فوق صاحب! میں تمھاری طبیعت سے بہت خوش ہوا۔ اصلاح کو تم ایک غزل بھیجا کرو۔ تمھارا نام شاگردوں میں درج کرلیا گیا ہے۔ نیاز دلا دینا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ شیرازی، حضرت امیر خسرو، خواجہ میر درد، شاہ نصیر، استاد ذوق کے نام کی۔

(خط نمبر 185 بنام فوق لاہوری)

غزل صاف خط میں لکھا کیجیے اور بین السطور ہوں۔ اصلاح کے لیے جگہ چھوڑیے۔

(خط نمبر 114 بنام بیخود دہلوی)

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ، مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آ جائے محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہٖ بحر میں آ جائے تو نظم کر دیجیے ورنہ نہیں۔ اور اس کے لیے حضرت استاد مرحوم (مراد ذوق) کے کلام پر غور کیجیے۔

(خط نمبر 228 بنام ناطق گلاؤٹھی)

لفظ جوبن کے متعلق میں پھر یہی کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بہ معنی پستان اہلِ لکھنؤ کی اختراع ہے۔ دہلی والے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کر دیا ہے اسے میں تسلیم نہیں کرتا...... دہلی کے استعمال کا بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح:

عجب جوبن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں، جس دم بگڑتے ہیں

(خط نمبر 228 بنام ناطق گلاؤٹھی)

لفظ پھنسنا بغیر نون کے صحیح ہے۔ چنانچہ میں نے بھی یہی کیا (کہا) ہے۔ رند کے شعر سند میں پیش کرتا ہوں۔

(خط نمبر 77 بنام آزاد)

مجھے غزل پسند نہیں آئی۔ اور شعر کہہ کر بھیجو۔ نہ پہلو دیکھتے ہو نہ سمجھتے ہو۔ مصرعہ طرح کرنا تم کو نہیں آتا۔ مزاج میں جلدی بہت ہے۔

(خط نمبر 10 بنام احسن مارہروی)

میری غزل کی دھجیاں اڑا دیں اور ابھی حسرت باقی ہے۔ کیا کیا نئے مضمون نکالے ہیں۔ اشک آتا ہے۔

(خط نمبر 114 بنام بیخود دہلوی)

برخوردار! تمھاری طبیعت زبردست مضمون آور ہے۔ مگر کھلے ملے "شعر پر اثر" کم کہتے ہو۔ اس کا

خیال رہے۔

(خط نمبر 235 بنام واقف فرخ آبادی)

آپ کی طبیعت بہت اچھی بات پیدا کرتی ہے مگر اغلاق سے۔ کبھی کبھی بہ سبب نازک خیالی کے اغلاق پایا جاتا ہے۔

(خط نمبر 146 بنام حسرت بدایونی)

غزل کو دیکھ کر جی پھڑک گیا۔ آفریں ہے۔ کیا خوب غزل کہی ہے۔ ایسی غزل کوئی اور کہے تو جانوں۔

(خط نمبر 206 محمود رامپوری)

اب تو ہر شخص بجائے خود استاد ہے.... ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجیے۔ ''اکثر استاد کے شاگرد بجائے خود استاد بن کر اپنی غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مؤنث باندھا، حالانکہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ کسی صاحب نے لفظ میّت جو بکسر یائے تحتانی ہے اس کو بہ فتح باندھا۔ بو کے قافیے میں ابرو کو مؤنث باندھا ہے وہ بھی مذکر ہے۔'' اسی مضمون کی نقل گلدستہ ''ارمغان'' میں بھی بھیج دینا کہ وہاں بھی چھاپ دیں۔ اہلِ انتخاب کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ غلط کلام کو نہ چھاپیں مگر یہ معلوم نہیں کہ معلوم صاحبانِ انتخاب کس کھیت کے ہیں۔ (19)

لوگ پوچھتے ہیں ''فیض داغ'' کیا چیز ہے۔ کیا کتاب ہے۔

(خط نمبر 14 بنام احسن مارہروی)

(ج): ان خطوط میں شاگردوں سے کسی قسم کی مالی امداد، فرمائش اشیاء، غیر ضروری خوشامد و خدمت، اعتراف استادی کی خواہش وغیرہ کا اظہار نہیں ملتا۔ جب کہ داغ کے بعض تلامذہ بڑے منصب والے اور دولت والے تھے۔ داغ نے اپنے بعض تلامذہ سے دوستانہ تعلق ضرور بنالیا تھا اسی دوستانہ تعلق کی بنا پر ان تلامذہ سے اگر کوئی تعاون لیا تو منی بائی حجاب سے معاشقے میں راہ ہموار کرنے کا یا پھر تنگی کے زمانے میں بطور قرض کچھ روپیہ لینے کا۔ یوں انھوں نے خدمتِ زبان وادب کے جذبے سے سرشار رہ کر ان

تلامذہ کی اصلاح وتربیت کی۔ اس اصلاح وتربیت کے ذریعے ''زبانِ دہلی'' کو ہندوستان بھر میں عام کرنا داغ کی زندگی کا ایک اہم منصوبہ تھا۔ اور یہ منصوبہ بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ یہ خطوط بھی جو اگرچہ شعر فی البدیہہ کی طرح بیساختہ اور قلم برداشتہ ہیں، اس منصوبے ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔[20] ان میں دہلی کی ٹکسالی زبان، زبان دہلی کے محاورے، اسنادز یرتحریر آئی ہیں۔ چند مثالیں:

حجاب کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں حالانکہ ان کی یہی ضروریات جب اعزہ ان کے یہاں نہیں تھے تو اچھی طرح پوری ہو جاتی تھیں۔ آئے دن سرگراں رہتی ہیں۔ وہ ہنسی دل لگی وہ ٹھول سب غائب۔ اکثر معمولی باتوں پر اختلاف اور جھگڑا کر بیٹھتی ہیں۔ آپ سے بارہا گزارش کر چکا ہوں کہ آپ ہی انھیں سمجھائیں۔ میری عمر کا تقاضا نہیں کہ ان کی اس تلون مزاجی کا متحمل ہوسکوں۔

(خط نمبر 70 بنام امیر حیدر آبادی)

آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ ہاں خبر ہو تو کیوں کر۔ آپ تو معشوق کی طرح تغافل کی گود میں کھیل رہے ہیں۔ لیجیے میں بتائے دیتا ہوں کہ حجاب آج دو روز سے روٹھی بیٹھی ہیں.... آپ ہی انھیں سمجھائیں۔

(خط نمبر 73 بنام امیر حیدر آبادی)

ماہ مئی تک سو روپیہ ماہورا میرے پاس، پچاس روپیہ ماہوار اپنی استانی کے پاس قرض اگر آپ عنایت کیے جائیں تو عین نوازش ہے۔ یہاں میری کامیابی حضور پرنور کی ذات سے متعلق ہے اور یہ ممانعت ہے اور کسی کے ممنون نہ ہونا۔ میں یہاں ایک اعلیٰ شخص گنا جاتا ہوں۔ بندگان عالی کے دل میں بہت گنجائش ہے.... پہلی فروری کو میرے پاس روپیہ پہنچنا چاہیے۔ اور اسی تاریخ تک دلی میں میرے مکان کو۔ مکان کا پتا یہ ہے: دلی، چاندنی چوک، کوچہ نیچہ بنداں میں خلیفہ عبدالعزیز مہرکن کے پاس پہنچ کر میرے گھر پہنچے۔

یہاں جو کچھ میں بکتا ہوں وہ فی البدیہہ ہوتا ہے۔ یہ دو گھنٹے کی فکر ہے۔ جو ملفوف بھیجتا ہوں۔ حضوری فرمائشات ایسی ہی ہوتی ہیں۔ زبان کا لطف ہے اور فی الفور اس کی تعمیل کی جاتی ہے۔ حضور پر نور کا راضی کرنا بہت مشکل ہے۔

(خط نمبر 126 حسرت سعد آبادی)

تسلیم ہماری قبول ہو۔ گرامی نامہ آیا، آنکھوں سے لگایا۔ خط جو کھول کر دیکھا تو نوٹ پایا نہ ہنڈی۔ کلدار علیہ اسلام عجیب چیز ہیں۔ بالفعل داغ کلکتے جانے والا ہے۔ ایک ہزار تو ادھر کو سرکایئے۔ دنیا میں جو کوئی رئیس ہوتا ہے بے اختیاری میں یہی لوازمات ریاست اور مستحقاق کا خیال رکھتا ہے یہ ریاست ہی نئی دیکھی، میرا باپ بھی رئیس تھا اور بھی ریاستیں دیکھیں، بادشاہت بھی دیکھی۔ تعلق داروں کو بھی دیکھا یہ بات کہیں نہیں دیکھی اور نہ یہ استادی شاگردی دیکھی۔

(خط نمبر 101 بنام بیدار)

شہد خالص ایک روپیہ کا بھیج دیجیے۔ مگر اس کے ہاتھ جو مجھ تک پہنچا کر قیمت لے جائے۔

(خط نمبر 158 بنام سجادہ)

احسن ابھی اس لائق نہیں کہ وہ اصلاح دیں۔ نہ استعداد کامل، نہ مشق، نہ اہل زبان...... احسن سے فائق تر بہت شاگرد ہیں کیا وہ اس بات کو قبول کریں گے؟ توبہ توبہ! ہرگز خیال نہ کرنا...... پیری کے معنی اہل زبانِ دہلی میں شیخی و تعلّی کے ہیں۔

(خط نمبر 156 بنام طپش مارہروی)

مجھ کو دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں۔ جو میرے مسلک کے خلاف ہو اس کو خود نکال ڈالو۔ البتہ ایک کھٹکا ہے کہ کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو۔ سب کچھ خدا نے دیا ہے۔ کسی پردیسی کی ایسی عزت اس دربار میں نہیں۔ روٹی بھی پچاس کو کھلا کر کھالیتا ہوں، مگر ہائے ہندوستان تیرا ارمان! چھ مہینے سے سفر میں ہوں یہاں بھی خدمت احباب سے حتی الوسع دریغ نہیں کرتا۔

(خط نمبر 161 بنام شرف)

گلدستہ ''زبان اردو'' جو راسخ نے نکالا ہے اس کو رونق کلام سے دو۔ کہ زبان دہلی ختم ہوتی جاتی ہے۔

(خط نمبر 105 بنام بیخود دہلوی)

(د): داغ کی زندگی میں ان کی شہرت اور منصب و اعزاز سے جلنے والوں اور ان کی شاعری اور شخصیت پر اعتراضات کی بوچھار کرنے والوں کی بھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ اہل لکھنؤ نے تو انھیں خاص ہدف بنایا تھا۔ امیر مینائی کے نام خط نمبر 94 میں لکھتے ہیں:

یہ بھی خیال رہے کہ جو ذریات لکھنؤ کی یہاں جمع ہیں مجھ پر چھری تیز کیے ہوئے ہیں۔ یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے۔ سنتا ہوں کہ آزاد لکھنوی اور شحنۂ ہند (21) میرٹھ یا مالک مجھ پر یا میرے شاگردوں پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ لوگ بغیر اطلاع جواب بھی دے رہے ہیں۔ اعتراض بھی لغو اور جواب بھی پوچ۔ یہ امور خلل انداز روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہو سکتے۔ نہ ایسے حاسد فروغ پا سکتے ہیں۔ داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا۔

لکھنؤ کے ہفتہ وار اودھ پنچ (اجرا 16 جنوری 1877) نے تو داغ کی تضحیک و تنقیص میں مستقل مورچہ کھول رکھا تھا۔ احسن مارہروی شاگرد داغ کی کتاب جلوۂ داغ (حیدر آباد۔ 1902) پر تبصرے سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور داغ کی وفات کے بعد تک نظموں، تاریخی قطعات اور نثری مراسلوں میں داغ کی شاعری کے علاوہ ان کے حسب نسب، ان کی صورت و سیرت پر بھی حملے ہوتے رہتے۔ لیکن داغ نے کبھی ان اعتراضات کا جواب نہیں دیا اور نہ ہی اپنے تلامذہ کو اس طرف راغب کیا۔ البتہ جب تلامذہ ان تضحیک آمیز تحریروں کی طرف داغ کو متوجہ کرتے تھے تب داغ اس کا جواب ایسے خوبصورت پیرائے میں دیتے تھے جس سے ان کی اخلاقی شان اور بلند ہو جاتی تھی۔ ان خطوط میں ایسے متعدد مقامات ہیں جہاں داغ کے صبر کا پیمانہ چھلکا ہے لیکن بڑے دلنشیں اور مہذب انداز میں:

شیر بیشۂ سخنوری محی الدین خاں تسنیم کو تسلیم۔ میں نے آپ کو ایک شیر سمجھ کر مدراس کی لومڑیوں پر چھوڑ دیا ہے۔ کلام داغ سے لکھنوی اور مدراسی جلتے ہیں، جلا کریں۔ واللہ باللہ نہ میں کسی کے اعتراض کو دیکھوں اور نہ اس کے جواب کی طرف مخاطب۔ اہل زبان ہونا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ داغ اہل مذاق کا دل نشیں ہے۔ مٹائے سے نہیں مٹتا۔ اس کو فقیر کی دعا ہے۔ ذوق مٹے تو داغ مٹے۔

قبول خاطر و لطف سخن خداداد ست

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ کلام داغ پر اعتراض کر کے اپنا فروغ چاہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے کہ بغیر کہے سنے صاحب اعتراض کو کوئی نہ کوئی جواب دندان شکن دے ہی دیتا ہے۔

(خط نمبر 222 بنام تسنیم)

داغ نے پرانا ہو کر جلنا چھوڑ دیا، البتہ جلاتا ہے۔ اس کا کہیں خیال نہ کرنا کوئی کچھ کہا کرے......

جلنے والوں خوش ہونے والوں کا حال بھی ضرور لکھنا۔

(خط نمبر 206 محمود رامپوری)

مجھ پر زمانہ چھری تیز کیے ہوئے ہے۔ خدا دارم چہ غم دارم:

عشق میں گم نام کیا، بدنام ہوا
میری شہرت نے مجھے رسوا کیا

خدا محسود رکھے۔ آمین۔

(خط نمبر 303 محمود رامپوری)

دشمن داغ کا دل جلانا چاہتے ہیں ان کو داغ دل نصیب ہو۔

(خط نمبر 184 بنام فوق لاہوری)

امیر کو تو یہ مجال نہیں جلیل کیا داغ کو مٹا سکتے ہیں

(خط نمبر 173 بنام عزیز یار جنگ)

وہ لڑکا (مراد مضطر خیر آبادی) رئیس کا استاد بن کر میرے اشعار پر اعتراض کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے بھائی (مراد سید محمد حسین بسمل خیر آبادی) نے رامپور میں مجھ سے اصلاح لی تھی۔ آپ اپنے گلدستے کی رونق اس کے کلام سے بڑھائیے۔ یہاں کسی کو غرض نہیں۔

(خط نمبر 4 بنام احسن مارہروی)

مضطر صاحب ٹونک کے ملک الشعرا ہوئے مگر ملک بھی مان لے، یہ شرط بڑی ہے۔ وہ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں اور آپ ان کی طرح میں مجھ سے غزل کہلواتے ہیں۔ یہ تو لڑکا ہے اس کا بڑا بھائی (مراد بسمل خیر آبادی) بھی لڑکا تھا۔ رامپور میں، میں نے اس کی شادی میں سعی کی تھی، اور اس نے اپنے کلام کی اصلاح بھی لی تھی۔ اس کو تو میں جانتا ہی نہیں۔ بچوں کی بات کا کیا جواب دوں۔ مدّتے باید کہ یار بکنار آید۔

(خط نمبر 5 بنام احسن مارہروی)

تلامذۂ داغ میں احسن مارہروی کے نام سب سے زیادہ خط (47) ہیں۔ خط نمبر 17 مکتوبہ 22 جولائی 1902 تا خط نمبر 44 مکتوبہ 8 دسمبر 1904 ''فصیح اللغات''[22] کے قضیے سے متعلق

ہیں۔باقی 19 خطوط ادبی معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ان میں بعض خط ایک ایک فقرے یا متفرق عبارتوں کے جوڑ پر مشتمل ہیں۔احسن نے ''فصیح اللغات'' کی ترتیب کا کام قیام حیدرآباد جون 1898 سے جون 1902 کے دوران شروع کیا تھا۔اسی دوران جلوۂ داغ (حیدرآباد 1902) کی تصنیف کی بساط رکھی گئی تھی۔روزنامچۂ داغ جو بعد میں ''بزم داغ'' کے نام سے رفیق مارہروی نے غالباً 1956 میں لکھنؤ سے شائع کیا۔یہ بھی احسن اور آزاد مارہروی کا ترتیب دیا ہوا تھا اور جون 1898 سے جون 1902 تک داغ کے ادبی ملفوظات پر مشتمل تھا۔

فصیح اللغات کی کچھ قسطیں رسالہ فصیح الملک (مارہرہ) میں شائع بھی ہوئی تھیں۔داغ اس کی تکمیل واشاعت کے لیے فکرمند تھے۔انھوں نے اپنے اثرات استعمال کر کے حیدرآباد کے مطبع شمسی سے اس کی اشاعت کے معاملات طے کرا دیے تھے۔فصیح اللغات کے لیے -/1000 روپے داغ نے -/300 روپے راجہ کشن پرشاد شاد نے اور کچھ روپیہ عزیز یار جنگ ولا نے احسن کی نذر کر دیا تھا کہ وہ اس کی تصنیف واشاعت کا بار اٹھائیں۔[23] یہ روپیہ احسن صاحب اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کر بیٹھے۔ ادھر صاحب مطبع ابراہیم علی خاں نے داغ سے لگاتار تقاضے کر کے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا۔اس پر مستزاد احسن نے اپنی مطبوعہ کتاب ''جلوۂ داغ'' (1902) کے مصارف اشاعت کی ادائیگی بھی صاحب مطبع کو نہیں کی تھی۔داغ نے لگاتار احسن کو توجہ دلائی کہ وہ واپس حیدرآباد آئیں اور معاملات کا نبٹارہ کریں،مگر احسن کی طرف سے بوجوہ تاخیر ہوئی۔ان خطوط میں داغ کا لہجہ کہیں کہیں سخت اور تلخ ہو گیا ہے۔بالآخر 1904 میں احسن نے اپنی جائیداد فروخت کر کے مطبع کے بقایاجات کی ادائیگی کی اور معاملہ صاف ہوا۔لیکن فصیح اللغات کی اشاعت رک گئی۔ان کی وفات کے بعد بھی اس کی اشاعت عمل میں نہیں آئی۔خدا جانے اس کا مسودہ کہاں گیا۔

فصیح اللغات سے متعلق خطوط اہم ہیں اور داغ کے ضبط وتحمل پر روشنی ڈالتے ہیں۔لیکن یہ طویل ہیں۔ان کے مختصر اقتباسات صورت حال کو واضح نہیں کر سکیں گے۔لہٰذا ان کے اقتباسات درج کرنے سے احتراز کیا جا رہا ہے۔

(5)۔ والیان ریاست و امرا و عمال: والیان ریاست و امرا کے نام جو خطوط ہیں ان میں سے چند کا ذکر تلامذہ سرخی کے تحت آ چکا ہے۔مثلاً نظام دکن میر محبوب علی خاں آصف،نواب حسن علی

خاں امیر، کنور اعتماد علی خاں حسرت، کشن بہادر، بیدار وغیرہ اس شق کے تحت بعض دوسرے مکتوب الیہم کے اسماء پیش کیے جارہے ہیں:

نمبر شمار	مکتوب الیہم		تعداد خطوط
01	سید جعفر علی فرخ آبادی	(رئیس فتح گڑھی)	02
02	حامد الدولہ بہادر	(مصاحب واجد علی شاہ)	03
03	نواب حیدر علی خاں (24)	(برادر نواب کلب علی خاں)	01
04	نامعلوم	(محسوب نواب حیدر علی خاں)	01
05	نواب عماد جنگ بہادر	(حیدر آباد)	04
06	نواب کلب علی خاں والیِ رامپور	(ف 1887)	13
07	نواب مشتاق علی خاں والیِ رامپور	(ف 1889)	01
08	نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور	(ف 1865)	01
09	وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں	(ف 1917)	01
	کل خطوط		37

نوابین رامپور کے نام خطوط ملتجیانہ اور فدویانہ انداز میں تکلف و احتیاط سے لکھے گئے ہیں۔ یہ ایک طرح کی عرضیاں ہیں۔ البتہ سید جعفر علی اور حامد الدولہ کے نام خطوط دوستانہ ہیں۔ ان میں داغ کا شوخ اور شگفتہ انداز تحریر برقرار ہے۔ نوابین رامپور کے نام خطوط سے بعض اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً خط نمبر 198 میں داغ اپنے اخیاتی بھائی مرزا خورشید عالم کے لیے یوں ملتجی ہوئے ہیں:

جناب عالی! مرزا خورشید عالم بھی مستحق پرورش ہیں۔ اگر صیغۂ زکوٰۃ ہی میں سے پندرہ بیس روپیہ ماہوار مقرر ہو جائے تو عین نوازش و مرحمتِ خسروانی ہے:

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

(خط نمبر 198 بنام نواب کلب علی خاں)

یہ انداز داغ کے دوسرے خطوط میں نہیں ملتا۔ ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ آزادی کی پہلی جدوجہد

1857 کی ناکامی کے بعد دہلی کی تاریخی عمارتوں، مسجدوں، درگاہوں، قبروں کی نئی مرمت وتعمیر اور دہلی کے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی درستگی اور سد عارمیں نواب کلب علی خاں نے بھی دام و درم سے حصہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کام کی نگرانی داغ کے سپرد تھی۔ اور وہی اس قسم کے منصوبے اور تخمینے سرکار رامپور میں پیش کرتے تھے۔ 15 نومبر 1881 کے مکتوبہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

درگاہ قدم رسول کی مرمت ہنوز اختتام کو نہیں پہنچی۔ سقف قدم شریف از سرنو مسجد، مجلس خانہ، دروازۂ درگاہ، تمام درگاہ میں سفیدی ہوئی ہے۔ (کذئ) اس قدر کام ہوا ہے۔ ہزار ہا مسلمان وگدا و حاکم، حضور کی خیر مناتے ہیں۔ نواب ضیاء الدین خاں ملتجی ہیں کہ جو ڈنڈا او دیوار فصیل کی گری ہے اور اس کے باعث سے مسجد درگاہ بھی گر جائے تو کچھ بعید نہیں۔ اس میں فدوی کی رائے میں ہزار آٹھ سو روپے کی لاگت ہوگی اور مرمت و تیاری حال میں بھی تخمینے سے زیادہ صرف ہوا۔ لہٰذا در بابِ مرمتِ ثانی کے تاحکمِ ثانی التوا کیا گیا اس کی کیفیت زبانی عرض نی جائے گی۔

(خط نمبر 196)

خط نمبر 199 مکتوبہ یکم جولائی 1885 میں مرقوم ہے:

اہل دہلی اس زمانے میں ذات والا صفات کو اپنا بادشاہ جانتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ہر شخص پر احسان ہے۔

خط نمبر 192، 193، 194 سے پتا چلتا ہے کہ ان دنوں غیر مقلدین اور اہل تقلید کے درمیان سخت رسہ کشی تھی مسجد، مزارات اور خانقاہوں سے متعلق عدالتوں میں مقدمات زیر سماعت تھے۔ اہل تقلید نواب رامپور کو اپنا معاون تصور کرتے تھے اور ان سے امداد کے خواہاں تھے اور غیر مقلدین کو بھوپال سے مدد مل رہی تھی۔ داغ اہل تقلید کے ہم نوا تھے اور ان کی سفارشات نواب رامپور کے حضور پیش کرتے تھے۔

حامد الدولہ کے نام خط نمبر 149، مکتوبہ 29 اگست 1885 میں مرزا غالب اور ان کے پسندیدہ شہر کلکتے کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے:

یہ چلن تیرے نئے اے گردشِ دوراں ہوئے
حامد الدولہ بہادر داغ کے پرساں ہوئے

عنایت نامہ ساڑھے تین برس بعد آیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ چونکہ عذر نہایت معقول تھا دل مشتاق نے بہت لطف اٹھایا۔ میرے جواب کا سوم، چہلم برسی ہو چکی تھی۔ ساڑھے تین برس کا حساب روز حساب تک سمجھ میں نہ آئے گا۔ حامد الدولہ جس وقت تمھارا خط آیا:

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کلکتے کی لہر آئی۔دل پر سانپ لوٹ گیا.....آپ صاحبوں نے یہ نہ جانا کہ داغ بھی کام کا آدمی ہے فقط نام کا آدمی نہیں:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

پھپا مرزا نوشہ صاحب کا یہ شعر میرے بھی حسب حال ہے..... جو آسائش مجھے کلکتے میں ملی وہ شاید جنت میں ملے۔وہ یہ کہ آب وہوا نہایت موافق مزاج تھی۔

یہ خط داغ کے دلچسپ اسلوب کا بھی ترجمان ہے۔داغ نے غالب کو پھپا لکھا ہے۔اس رشتے کی صورت یہ ہے کہ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم (بنت نواب الٰہی بخش خاں معروف) اور داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں (فرزند نواب احمد بخش خاں برادر نواب الٰہی بخش خاں) آپس میں عمزاد تھے۔یعنی امراؤ بیگم بہ سبب داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں کی بہن ہونے کے پھوپھی ہوئیں اور غالب ان کے پھوپھا۔

اس فہرست میں ایک خط مہاراجہ کشن پرشاد شاد (ف 1940) کے نام شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔مرتب ''زبان داغ'' نے خط پر مکتوب الیہ کا نام نہ پائے جانے کے سبب اسے عزیز یار جنگ کے نام سے شامل کرلیا ہے۔(دیکھیے خط نمبر 173) جب کہ ''انشائے داغ'' میں احسن مارہروی نے اسے شاد کے نام ہی سے شامل کیا ہے۔خط کے مضمون سے مکتوب الیہ کی بابت کوئی داخلی شہادت بھی نہیں ملتی۔البتہ اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ خط کسی ایسے بااختیار شخص کے نام ہے جو سرزنش کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔دراصل اس خط میں ریاست حیدرآباد سے وابستہ ایک شاعر غلام احمد ترکی نور محلی کرپانی پتی کی شکایت کی گئی ہے، کہ انھوں نے ایک مشاعرے میں داغ کے استاد بھائی ظہیر دہلوی (ف 1911) کو جلیل مانک پوری (ف 1946) کے مقابلے میں خفیف کرنے کی کوشش کی اور جب داغ کی غزل بہ زبان غیر پیش کی گئی تو اس پر بھی برسر مشاعرہ تنقید کی، اس خط کے شاد کے نام ہونے کی خارجی شہادت تمکین کاظمی کے ایک مضمون میں ملتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

داغ کے حیدرآباد آنے کے بعد ظہیر دہلوی بھی آگئے اور انھیں داغ نے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے پاس رکھوادیا تو اختر مینائی (خلف امیر مینائی) اور جلیل (فصاحت جنگ) جو پہلے سے مہاراجہ کے پاس تھے، ظہیر کی مخالفت کرنے لگے۔اور ان دونوں نے ترکی کو ہموار کرکے آگے کردیا۔چنانچہ برسر مشاعرہ ترکی نے ظہیر پر فقرے کسے اور داغ پر پھبتیاں اڑائیں۔داغ چونکہ اس مشاعرے میں شریک نہ تھے اور

ظہیر نے غزل پھاڑ کر مشاعرے سے نکل کر داغ کو سارا قصہ سنا دیا تھا اس لیے داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا اور مہاراجہ نے ترکی کی خوب خبر لی۔ اس طرح ترکی کی ترکی تمام ہوگئی۔

(حیدرآباد کی چند شخصیتیں، مشمولہ نقوش شخصیات نمبر ص، 1246)

مذکورہ خط میں ایک جملہ داغ سے شاد کے تلمذ کی بھی شہادت دیتا ہے:

ضروری گذارش یہ ہے کہ ان کو اصلاحی غزل نہ دکھلایا کیجیے۔ (زبان داغ ص: 226)

تمکین کاظمی نے انھیں صراحتاً داغ کا شاگرد لکھا ہے۔ (نقوش شخصیات نمبر ص 1273)

(6)۔ متعلقین، عام قدر دان و شناسا: یہ کل 16 مکتوب الیہ ہیں جن کے نام 21 خطوط ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

شیخ نعیم الحق آزاد (خط: 4) ابوالحسن پسر نوح ناروی (خط: 1) سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی (خط 2) مرزا امام علی افسوس (خط 1) انور علی (خط 1) محمد تحسین بیدل (خط 1) حکیم دادار بخش (خط 1) شیخ حمید اللہ عاجز (خط 1) عبدالحمید (خط 1) حکیم قمر الدین تاجپوری (خط 1) محمد رضا خاں (خط 1) محمد عوض خاں (خط 1) شیخ محمد وزیر (خط 2) سید شفیع احمد نیر (خط 1) مقبول حسین وصل بلگرامی (خط 1) میر ابراہیم علی خاں وفا تلمیذ غالب (خط 1)

یہ تمام خطوط رسمی انداز کے ہیں جن میں مزاج پرسی، استفسار کا جواب، اشعار کے مطالب علالت کا تذکرہ وغیرہ ہے۔ چند خطوط میں بعض کارآمد باتیں بھی آگئی ہیں مثلاً: 4 اپریل 1866 کو 70 روپے ماہوار تنخواہ پر جب داغ رامپور میں ملازم ہوگئے تو دوسرے دن ایک شعر رامپور کے بچہ بچہ کی زبان پر تھا:

شہر دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا (25)

ایک شاعر کا داروغۂ اصطبل ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ داغ نے ایک خط میں اس کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

یہ خیال رہے کہ میں داروغۂ اصطبل نہیں ہوں۔ بہت سے کارخانوں کے داروغہ میرے ماتحت ہیں۔ اہل کار معتمد ریاست و مصاحب سرکار لکھا جاتا ہوں۔ آئندہ خط پر یہی پتا لکھیے گا۔ مجھ کو پتا لکھنے کی ضرورت کیا ہے فقط میرا اور شہر کا نام کفایت کرتا ہے۔

(خط نمبر 224 بنام محمد وزیر لکھنوی مکتوبہ 6 جولائی 1886)

پتے کے تعلق سے اسی طرح کا جواب غالب نے نواب علاؤ الدین احمد خاں کو دیا تھا کہ خط پر میرا نام اور دہلی للہ دیا کرو۔

داغ کی خطوط نگاری کا سطور بالا میں جو تعارف و جائزہ پیش کیا گیا وہ اجمالی ہے۔ ابھی اور بھی کئی پہلو ہیں۔ جن پر گفتگو کی گنجائش ہے۔ خصوصاً ان خطوط کی ادبی حیثیت اور آئین مکتوب نگاری کے حوالے سے ان کے مطالعے کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جارہا ہے۔

خط کو ''نصف ملاقات'' کہا گیا ہے۔ اچھے خطوط کی پہچان اور پرکھ کا معیار بھی یہی ہے کہ وہ کسی حد تک ملاقات کا بدل ثابت ہوں اور ہجر میں وصال کا مزہ دینے والے ہوں۔ خطوط غالب کی طرح داغ کے خطوط بھی دل کی زبان اور فطری انداز بیان کے سبب اس مقولے کی صداقت پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں گفتنی ناگفتنی سبھی کچھ ہے۔ اسی لیے ان کا لفظ لفظ احساس زندگی سے معمور ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں غالب واقبال کے مکاتیب کی طرح ادق علمی وادبی مسائل، فلسفیانہ نکات اور صوفیانہ خیالات پر گفتگو نہیں ملتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ داغ کی زندگی کا یہ ایک ایسا شخصی روزنامچہ ہے جس میں ان کا طرز زندگی، ان کی نفسیات، جنسی محرکات، جسمانی عوارض، اخلاقی رویے، ذہنی ساخت، دربارداری، ادب پروری، شوخ طبعی فکر، احساس وعمل اور شخصیت کے پیچ وخم محفوظ ہوگئے ہیں۔ ان خطوط میں دہلی کی ٹکسالی زبان اور قلعۂ معلیٰ کی تہذیب کا عکس بھی جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آخری بڑی نشانی داغ تھے۔ (26)

''زبان داغ'' میں داغ کا پہلا خط مکتوبہ 17 مارچ 1860 بنام نواب یوسف علی خاں ملتا ہے (ص 291) اور آخری خط بنام احسن مارہروی مکتوبہ 22 دسمبر 1904 کا ہے (ص: 79) اس طور 1860 سے 1904 تک تقریباً 45 سال داغ نے علم وادب کی دوسر پرست ریاستوں رامپور اور حیدر آباد میں عیش وعشرت، غیرت ووقار سے بھرپور زندگی کا جو لطف کشید کیا ان کی شاعری کی طرح ان کے خطوط بھی اس کے ترجمان بن گئے ہیں۔

اس مضمون میں داغ کے خطوط سے زیادہ سے زیادہ اقتباسات محض اس لیے دیے گئے ہیں کہ ان کی نجی زندگی، ہم عصر حالات اور شخصیت کے نکھار کا رنگ ونور جو نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری کی طرح اس کا بھی احیا ہو۔ اور انھیں پڑھنے کے بعد بیساختہ آپ کہہ اٹھیں:

داغ اک آدمی ہے گرما گرم
خوش بہت ہوں گے جب ملیں گے آپ

ضرورت ہے کہ ان خطوط کو تاریخی ترتیب اور کارآمد حواشی کے ساتھ از سر نو مرتب کیا جائے۔ خطوط

کی تاریخوں اور واقعات سے متعلق سنین کو درست کیا جائے۔ مکتوب الیہم پر تعارفی نوٹ لکھے جائیں۔ یہ کام اشد ضروری ہے کاش کوئی اس طرف توجہ دے۔

●

حواشی

1۔ "انشاء داغ" میری نظر سے نہیں گزری اس کا تعارف بعض دوسرے ثانوی ماخذات سے کرایا گیا ہے۔

2۔ امیر اللغات کا پہلا حصہ 1891 میں شائع ہوا تھا جس میں الف ممدودہ کے الفاظ تھے۔ دوسرا حصہ مطبع مفید عام آگرہ سے 1892 میں طبع ہوا یہ حصہ الف مقصورہ کے الفاظ پر مشتمل تھا۔

3۔ خط پر ہجری تاریخ 6 ذی قعدہ 1318ھ/ 26 فروری 1901 مرقوم ہے۔ جب کہ امیر مینائی کا وصال 18 جماد الآخر 1318ھ 14 اکتوبر 1900 کو حیدر آباد میں ہو چکا تھا خط میں جنرل اعظم الدین خاں کے واقعۂ قتل کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ 2 رمضان 1308ھ/ 12 اپریل 1891 کو واقع ہوا تھا۔ لہٰذا اس خط کی صحیح تاریخ 6 ذی قعدہ 1308ھ/ 14 جون 1891 ہے۔ راقم نے اسی تاریخ کو اختیار کیا ہے۔

4۔ 14 ذی الحجہ 1246ھ مطابق 27 مئی 1831 کے جب کہ داغ کی پیدائش کی معروف اور مستند اول تاریخ، 12 ذی الحجہ مطابق 25 مئی ہے۔ (تذکرہ ماہ و سال ص: 150، توقیت داغ مرتبہ کالیداس گپتا رضا مشمولہ اسباق پونہ اپریل تا جون 1997 ص: 165) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابت کی غلطی سے 12 کا ہندسہ 14 تحریر ہو گیا ہوگا۔ لیکن مرتب زبان داغ نے اپنے مضمون ذکر داغ میں بھی 14 ذی الحجہ ہی رقم کی ہے (ص: 21) جب کہ عیسوی تاریخ 25 مئی ہی درج کی ہے۔ فی الوقت اس تاریخ کے صحیح یا غلط ہونے کی بابت کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔

امیر مینائی 16 شعبان 1244ھ/ 21 فروری 1829 کو پیدا ہوئے۔ اور 18 جماد الآخر 1318 / 14 اکتوبر 1900 کو انھوں نے وفات پائی۔ وہ داغ سے تقریباً 2 سال 3 ماہ عمر میں بڑے تھے۔

5۔ یہ اطلاع تنخواہ کے اجرا سے پیشتر کی ہے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ 1700 سو روپیہ تھی۔ جو اردو شاعری کی تاریخ میں کسی اردو شاعر کی پہلی اور آخری بڑی تنخواہ شمار ہوتی ہے۔

6۔ یہاں "میلہ بے نظیر" کے اجرا اور منی بائی حجاب کی آمد کے سنہ کو ایک ہی مان لیا گیا ہے۔ حجاب پہلی بار 1879 میں رامپور آئی تھیں۔ داغ کے سوانح نویسوں نے اسی سنہ پر اتفاق کیا ہے۔ داغ کا خط نمبر 135 بھی اس کی توثیق کرتا ہے۔

7۔ یہ سنہ بھی دراصل 1882 ہے۔

8۔ جولائی 1902 تا اگست 1904 قاضی عبدالحمید کے نام خط نمبر 178 مکتوبہ 31 جولائی 1902 میں حجاب کی آمد کی اطلاع دی گئی ہے۔

9۔ "فریاد داغ" کا پہلا ایڈیشن 1882 میں مطبع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد سے پندرہ سو کی تعداد میں شائع ہوا تھا اس کے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جانے کے سبب اسی سال دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔ بعد میں اس مطبع نے تین ایڈیشن اور شائع کیے۔

10۔ عبدالرزاق ساکن کلکتہ کے نام خط نمبر 183 مکتوبہ 10 اکتوبر 1885 میں بھی کلکتہ جانے کا ذکر ہے، ان سے کلکتے میں

کرایے پر ایک مکان تلاش کرنے کی گذارش کی گئی ہے۔

11۔ "گلزارِ داغ" دیوان اول مطبوعہ 1878ء۔

12۔ "آفتابِ داغ" دیوان دوم مطبوعہ 1885ء۔

13۔ گوہر جان ملکہ جان کی بیٹی تھی۔ اس نے بھی شمالی ہند میں بڑی دھوم مچا رکھی تھی۔ اکبر الہ آبادی کا اس کی بابت ایک شعر بہت مشہور ہے:

کون آرام سے دنیا میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

14۔

رقیب بھی تو اسے کان رکھ کے سنتے ہیں
عجب طرح کا مزہ ہے مرے فسانے میں (داغ)

15۔ یہ خط 9 اگست 1886ء کا ہے۔ یہ دور ہے نواب کلب علی خاں کا (1865-1887) داغ کی پیدائش 1831ء میں ہوئی اور نواب کی 1835ء میں۔ جائے پیدائش دونوں کی دہلی ہے۔ اسی لیے ہم وطن و ہم عمر لکھا۔ اگرچہ عمر میں تقریباً 4 سال کا تفاوت ہے۔

16۔ مطالعۂ داغ از ڈاکٹر سید محمد علی زیدی (مطبوعہ لکھنؤ 1974ء) میں داغ کے 140 تلامذہ کی فہرست دی گئی ہے۔ اسی طرح "داغ کے اہم تلامذہ" از اسعد بدایونی (علی گڑھ 1986ء) میں اس فہرست پر اضافہ کر کے 72 تلامذہ کے ناموں کا اندراج کیا گیا۔ اس طور معلوم اسماء کی تعداد 212 ہو گئی۔

17۔ مثلاً:

آزاد مارہروی، سید افتخار عالم	خط نمبر 80 بنام افتخار عالم
واقف، سید محمد اصغر حسین	خط نمبر 236 بنام واقف
بسمل خیر آبادی، سید محمد حسین	خط نمبر 4،5 بنام احسن مارہروی
فیض (اسم نامعلوم)	خط نمبر 151 بنام محمد حیدر خاں دل
شاد، مہاراجہ کشن پرشاد	خط نمبر 173 بنام عزیز یار جنگ
ظفر علی خاں	تقریظ خیابان فارس (ص:217)

18۔ احسن مارہروی نے "انشائے داغ" کے مقدمے میں لکھا ہے:

مرحوم کی یہ عادت تھی کہ اپنے دستِ قلم سے بہت کم خط لکھتے تھے.... عام شاگردوں اور دوستوں کو زیادہ تر کسی حاضر باش شاگرد سے خط لکھوائے جاتے تھے۔ تلامذہ کے کلام پہ جو اصلاحی لفظ لکھے جاتے، اگرچہ وہ انھی کے بتائے ہوئے ہوتے، عموماً وہ بھی دوسروں کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر خط پر خواہ دوسرے سے لکھوایا گیا ہو، خواہ خود لکھا ہو، اپنے ہاتھ سے دستخط ضرور کیا کرتے تھے۔ کبھی دستخط کی جگہ خالی مہر بھی لگا دی جاتی۔ کبھی مہر اور دستخط دونوں ہوتے تھے۔ (ص:8)

خطوط کو محفوظ نہ رکھ پانے کا ان کا " بخط غیر" ہونا بھی ایک بڑا سبب ہو سکتا ہے۔

19۔ احسن مارہروی نے فصیح اللغات کا ابتدائی نام "فیض داغ" تجویز کیا تھا۔ داغ اس سے ناواقف تھے۔

20۔ جوش ملسیانی نے لکھا ہے:

مرزا غالب نے آموں پر ایک نظم کہی ہے۔ انھوں نے بھی کہی ہے (مراد داغ) اس میں بھی زبان کی حلاوت اور حسن بیان ان کی قوت بیانیہ کا شاہکار ہے۔ ان کے دوست میر نثار علی شہرت جب ایک مدت کے بعد ان سے ملے تو انھوں نے کہا کہ "میں اگر آپ کے پائے کا شاعر ہوتا تو غزل کو چھوڑ کر اردو شاعری کا رخ نظم ہی کی طرف پھیر دیتا۔ اس کے جواب میں حضرت داغ نے جو کچھ فرمایا وہ سننے کے قابل ہے:

کہنے لگے! تم سچ کہتے ہو، لیکن کیا کروں۔ جو کام اپنے ذمے لے رکھا ہے وہی پورا نہیں ہوتا۔ انھوں نے پوچھا وہ کام کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ جس طرح کان سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعۂ معلیٰ اور دہلی میں سے اردو زبان نکلی ہے۔ جس کے محاورے لعل و یاقوت کو پرے بٹھاتے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ دلّی کی شستہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جائے۔ اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جائے، جیسی دہلی میں بولی جاتی ہے۔ گو مجھے اس کوشش میں بہت کامیابی ہوئی ہے مگر ابھی اس امر کی تکمیل نہیں ہوئی۔ دو آدمی خاص اس امر کے لیے متعین کر رکھے ہیں کہ ہر روز کی ڈاک میں ہندوستان کے شہروں سے جو غزلیں اصلاح کے لیے آئیں وہ بعد اصلاح روانہ کر دی جائیں یا کریں۔ اگر تمام ہندوستان کی زبان دہلی کے مطابق ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑا کام ہے۔"

کیا داغ اور تلامذۂ داغ کے اس فیض سے انکار ممکن ہے؟

21۔ محشرِ ہند (اجرا 20 جنوری 1883) کے مدیر شوکت میرٹھی (ف 1922) تھے۔ شبلی نے ایک خط میں لکھا ہے: "آج کل داغ اور حالی کی دلی میں خوب معرکہ آرائیاں ہیں۔ دو تین غزلیں اخباروں میں چھپی بھی ہیں۔ داغ کا دوسرا دیوان بھی چھپ گیا اور تیسرا چھپ رہا ہے۔ مثنوی نہایت خراب لکھی ہے۔ (خط بنام محمد سمیع مکتوبہ 6 مارچ 1896 مشمولہ مکاتیب شبلی جلد اوّل اعظم گڑھ 1966 ص، 96) حالی سے معرکہ کی یہ واحد شہادت ہے۔

22۔ یہ ایک عجیب طرز کا لغت تھا۔ احسن مارہروی اسناد کے الفاظ منتخب کر کے داغ کو بھیجتے تھے اور داغ ان پر شعر کہہ کر احسن کو ارسال کر دیا کرتے تھے۔ اس کی کچھ قسطیں فصیح الملک (مارہرہ) میں شائع ہوئیں۔ اس کو کتابی صورت میں مدوّن کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بن گیا تھا لیکن یہ منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

23۔ دیکھیے خط نمبر 170 بنام عزیز یار جنگ۔

24۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجاب سے معاشقے کے سلسلے میں یہ حضرت ہی داغ کے رقیب بن گئے تھے۔ داغ نے جس خط میں حجاب کو یزید کی معشوقہ لکھا ہے اس سے مراد غالباً یہی ہیں۔

25۔ مشکی۔ گھوڑے کی ایک قسم ہے۔ مراد ہے کالا گھوڑا۔ اور کالا رنگ۔ اصطبل کی رعایت سے لفظ مشکی استعمال کیا گیا لیکن طنز کا نشانہ داغ کی سیاہ فامی ہے۔

26۔ خط نمبر 176 بنام قاضی عبدالحمید لکھتے ہیں:

ہزاروں برس سے دہلی کو پایۂ تخت اور دارالخلافہ شاہانِ ہنود اہلِ اسلام کا سنتے آئے ہیں۔ اس سرزمین کے آدمی کا وقار اور اعزاز ہزاروں برس تک رہا۔ کل شئی ہالک۔ آخرفنا، آخرفنا۔ بالفعل وہاں کی نشانی ایک داغ رہ گیا تھا اس کو تم صاحبوں نے مٹایا۔ وہ بھی کم بخت مٹ ہی گیا..... ایک شعر میں کہتے ہیں:

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمان دہلی
تھا مرا نام و نشاں، نام و نشانِ دہلی

●

مآخذ

انشائے داغ	احسن مارہروی	دہلی	1941
تذکرہ ماہ وسال	مالک رام	دہلی	1991
جہاں استاد داغ دہلوی	کالیداس گپتا رضا	پونہ	1997
سہ ماہی اسباق پونہ کا خاص شمارہ اپریل تا جون پونہ			
داغ کے اہم تلامذہ	اسعد بدایونی	علی گڑھ	1986
زبان داغ	رفیق مارہروی	لکھنؤ	1956
مطالعہ داغ	ڈاکٹر سید محمد علی زیدی	لکھنؤ	1974
مکاتیب احسن جلد اوّل	عنوان چشتی وصفیر احسن	دہلی	1977
مکاتیب امیر مینائی	احسن اللہ ثاقب	لکھنؤ	1924
نقوش لاہور، شخصیات نمبر 2	شخصیات نمبر 2	اکتوبر	1956

● ● ●

58,New Azad Puram Colony,
Chawni Ashraf Khan,
P.O. Izzat Nagar, Bareilly -243122

علی عمران عثمانی

داغ کا ایک قصیدہ

نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی شہرت زیادہ تر ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہوئی۔ وہ شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق ایک بڑے غزل گو ہیں اور ایک کامیاب قصیدہ نگار بھی۔ لیکن اہل ادب ذوق کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعین عموماً ان کی قصیدہ گوئی ہی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ان کے شاگرد داغ دہلوی کو ایک غزل گو کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ حالانکہ داغ کے مجموعوں میں قصیدے بھی موجود ہیں۔ زیر نظر مضمون میں راقم الحروف نے داغ کے ایک قصیدے کو مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔

بے شک داغ کی قصیدہ گوئی کا مقابلہ سودا اور ذوق کی قصیدہ گوئی سے نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ داغ کے قصیدے توجہ کے مستحق نہ ہوں۔ اگر داغ کی قصیدہ گوئی اور شہر آشوب (1) پر بھی توجہ کی جاتی تو شاید داغ کی شاعری کے کچھ اور اوصاف سامنے آ سکتے تھے۔

داغ نے کل دس قصیدے لکھے، جو ان کے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہیں" گلزار داغ" میں دو قصیدے،" مہتاب داغ" میں چھ قصیدے اور" یادگار داغ" میں دو قصیدے موجود ہیں۔(2)

داغ کے قصائد میں قصیدہ نگاری کے جملہ اوصاف پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ داغ نے اپنے بعض قصیدوں میں جدت پیدا کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔ زور بیان میں بھی جو قصیدے کا وصف خاص ہے، داغ نے اپنی قادر الکلامی کا وافر ثبوت پیش کیا ہے۔ گو کہ ان کے قصائد کی تشبیب میں تنوع نہیں، صرف بہاریہ مضامین نظم کیے گئے ہیں، لیکن ان میں اثر آفرینی کی کمی نہیں چنانچہ پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں:

" داغ کے قصیدوں میں علمیت و بلاغت کا وہ مظاہرہ نہیں جو ان کے استاد ذوق کا طرۂ امتیاز ہے، مگر زور بیان میں کبھی کبھی ذوق سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داغ ہوائی قلعے تعمیر نہیں کرتے۔ یہ حقیقت سے بہت قریب ہو کر قصیدے لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں ان کے ذاتی مشاہدے

کا بھی عمل دخل رہتا ہے۔ یہ مبالغے سے گریز نہیں کرتے، مگر حقیقت پر پردہ ڈالنے کی بھی کوشش نہیں کرتے...... ان کی تشبیب میں جو رس اور گھلاوٹ ہے اور طرز میں جو سپردگی ہے، اس کی مثال ہمارے قصیدوں میں زیادہ نہیں ملتی۔ ان کے ہاں تصنع اور حشو و زوائد نہیں۔"(3)

اس ضمن میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی رائے ذرا مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:

"داغ نے بعض قصائد میں تشبیب نہیں لکھی، جن قصیدوں میں تشبیب لکھی ہے، ان میں بہاریہ، رندانہ اور نشاطیہ مضامین نظم کیے ہیں۔ سوائے ایک قصیدے کے جو نظام کے دربار میں پہلی بار باریاب ہونے کے موقع پر لکھا گیا ہے، داغ کے قصیدوں کی تشبیب میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔"(4)

حالی نے اپنے مقدمے میں اردو قصائد پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ قصیدے میں بے جا مبالغے اور جھوٹی تعریف کی بہتات ہوتی ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے اگر ہم داغ کے قصیدوں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قصیدوں میں حقیقت نگاری کو موضوع و بیان دونوں ہی سطحوں پر خوبصورتی سے برتا گیا ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی کی مذکورہ بالا رائے اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ خود ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی ایک جگہ اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

"مبالغے اور تخیل سے کام لینے کے علاوہ انھوں نے (داغ نے) امیر مینائی کی طرح گھوڑے کے حقیقی اوصاف بھی لکھے ہیں۔"(5)

داغ کے قصیدوں میں جا بجا واقعہ نگاری سے بھی کام لیا گیا ہے اور ان کے بیان کردہ واقعات فقط تخیل کے زائیدہ نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے عموماً وہی واقعے پیش کیے ہیں، جن کا انھوں نے بہ چشمِ خود مشاہدہ کیا تھا۔ قصیدے میں سفرِ حج کے بیان کی روایت قدیم دور سے ہی رائج رہی ہے۔ خاقانی کو اس موضوع سے بہت لگاؤ تھا اور اسے اس موضوع کی پیش کش میں پورا کمال بھی حاصل تھا۔ داغ نے بھی اپنے سفرِ حج کے واقعے کو بڑی فن کاری کے ساتھ ایک قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔ یہ قصیدہ داغ کی واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی کی عمدہ مثال ہے، جس میں داغ نے ارکانِ حج کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

چل کے کعبے سے ٹھہرتے ہیں منیٰ میں شب کو — اور سوئے عرفات ہیں پھر وقتِ پگاہ

ظہر کے بعد سے ہوتا ہے وہاں خطبہ شروع — عصر کے بعد سے لد جاتے ہیں خیمے خرگاہ

مسجدِ مزدلفہ بین منیٰ و عرفات — بہرِ حجاج ہے اک رات کی وہ طاعت گاہ
پڑھتے ہیں ساتھ وہاں آ کے عشا و مغرب — اہلِ حج کرتے ہیں تحمید و مناجاتِ الٰہ
جب چلے مزدلفہ سے تو منیٰ پھر آئے — تین دن کے لیے ہوتی ہے وہی منزل گاہ
شتر و دنبہ و بُز ذبح ہوئے ہیں اتنے — آسمانِ شفقیں رنگ بنی قرباں گاہ

ذوق نے اپنے قصیدے "ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی" کی تشبیب میں برسات کے مختلف مناظر کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ داغ نے بھی اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں برسات کے موسم کی منظرکشی کی ہے۔ داغ کے ان اشعار سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مناظر اپنے تخیل کی مدد سے پیش نہیں کیے ہیں، بلکہ برسات سے خود داغ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی چمک — کہیں بوندوں کی پھواریں کہیں برسے جھم جھم
نعرۂ مست کا بادل کی گرج میں انداز — نگہِ شوخ کا بجلی کی تڑپ میں عالم
کہیں طاؤسِ چمن کی ہے نوائے دلکش — کہیں آتی ہے پپیہوں کی صدائے پیہم
نکہتِ گل کا اثر ہو نفسِ مطرب میں — گائیں اس فصل میں گر رام کلی اہلِ نغم
بھینی بھینی ہے وہ خوشبو کہ معطر ہے دماغ — ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں ہیں کہ دل ہو خرم

غالباً داغ کی ایسی ہی حقیقت نگاری سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے "مرثیۂ داغ" میں یہ خیال ظاہر کیا تھا:

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں — آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

داغ کے قصائد کے گریز روایتی انداز کے ہیں۔ لیکن وہ قصیدہ جس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا اور جو والیِ دکن کی مدح میں لکھا گیا ہے اس کی گریز میں داغ نے جدت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جس کی تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔

مدح میں بھی داغ عموماً روایتی قصیدہ گو ہی نظر آتے ہیں، لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا داغ نے مدح میں مبالغے سے کام لیتے ہوئے بھی حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ یہ داغ کا کمال ہے کہ ان کے یہاں مدح میں بھی ویسا ہی جوش و خروش قائم ہے، جیسا تشبیب میں پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

"مدح میں انھوں نے ممدوح کے اوصاف کے علاوہ اس کے ساز و سامان کی تعریف میں بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ ان کے قصیدوں میں ممدوح کی فوج، تلوار، گھوڑے اور ہاتھی کی توصیف سے لے کر فرش،

قالین اور گل تکیوں تک کی تعریف ملتی ہے۔ مدحیہ اشعار میں وہ الفاظ و تراکیب کا ایک ذخیرہ اکٹھا کر دیتے ہیں، لیکن اس سے جوش و خروش میں کمی نہیں آنے پاتی۔''(6)

پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ داغ مدح میں ایسی باتیں کہتے ہیں، جو اخلاقیات کو سنوارنے میں معاون ثابت ہو سکیں۔(7) داغ کے اکثر قصیدوں میں محاورات اور رعنائیِ لفظی کا حسنِ استعمال دکھائی دیتا ہے، کہیں کہیں علمِ نجوم کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

روز و شب ایوانِ شاہی پر سعادت بار ہیں　　　سعدِ اصغر سعدِ اکبر آفتاب و ماہتاب

سمندر کے ایک تو معروف معنی ہیں لیکن سمندر ایک کیڑے کا نام بھی ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے۔ ممدوح کے غضب اور غصّے کے اثر کو بیان کرتے ہوئے ان دونوں لفظوں کو کس خوبی سے یکجا کر دیا ہے:

سمندر میں سمندر ہوں، صدف میں ہوں شرر پیدا　　　جو چمکے آتشِ قہر و غضب کی تیرے چنگاری

مدح کے کچھ اور اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن میں داغ نے ممدوح کے قصرِ شاہی اور دیگر ساز و سامان کی تعریف کی ہے:

قصرِ شاہی ہے وہ روشن تر کہ جس کے فرش پر　　　تختہ ہائے سنگِ مرمر آفتاب و ماہتاب
شمسۂ مہتابیِ ایوانِ شہ کے رشک سے　　　روز و شب کھاتے ہیں چکر آفتاب و ماہتاب
فرشِ قالیں دیکھ کر ایوانِ آصف جاہ میں　　　منفعل ہیں چرخِ اخضر آفتاب و ماہتاب
خواب گاہِ شہ میں گل تکیے ہیں یوں زربفت کے　　　دو ہیں گویا زیبِ بستر آفتاب و ماہتاب

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ داغ نے کل دس قصیدے لکھے ہیں، لیکن ان کا سب سے مشہور قصیدہ وہ ہے، جو انھوں نے میر محبوب علی خاں کی شان میں لکھا تھا۔ نظام الملک آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں، 1869 سے 1911 تک دکن کے نظام تھے۔ ریاست رامپور کی محفلیں برہم ہونے کے بعد داغ نے حیدر آباد کا رخ کیا، وہاں کا ماحول بھی انھیں راس آیا۔ انھوں نے اپنی عمر کے تقریباً سترہ برس حیدر آباد میں گزارے اور بالآخر وہ اسی دیار میں پیوندِ زمیں بھی ہو گئے۔ داغ نے حیدر آباد کا سفر دو مرتبہ کیا۔ پہلے سفر میں وہ صرف سوا سال وہاں مقیم رہے، پھر تقریباً نو ماہ کا وقفہ دہلی میں گزارا، اس کے بعد دکن کے دوسرے سفر میں انھوں نے حیدر آباد میں مکمل طور پر سکونت اختیار کر لی۔(8) جب داغ نے حیدر آباد

جانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے یہ زیرِ بحث قصیدہ والیِ دکن کے دربار میں باریابی کی غرض سے لکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پہلے سفر میں ہی حاضرِ دربار ہو کر اسے نظام کی خدمت میں پیش کیا تھا۔(9)

یہ قصیدہ نہ صرف داغ کے اہم قصیدوں میں سے ایک ہے، بلکہ اگر اردو کے اہم قصائد کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں بھی اس قصیدے کو ضرور شامل کرنا ہوگا۔ اس میں کل سو 100 اشعار ہیں اور تین مطلعے۔ قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی بھی اس میں موجود ہیں۔

قصیدے کی زبان بھاری بھرکم اور مشکل ہوتی ہے۔ اسی زبان کے استعمال سے قصیدے کے مخصوص اسلوب، مزاج اور آہنگ کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ یہ اسلوب عموماً غزل کے اسلوب سے مختلف اور متضاد ہوتا ہے۔ ایک عرصے تک اس اسلوب کی سختی سے پابندی ہوتی رہی، لیکن بعد کے قصیدہ گویوں نے اس سلسلے میں قدرے آزادی سے کام لیا۔ یعنی قصیدے میں غزل کے اسلوب کی بھی آمیزش ہونے لگی۔ اس رویے کو ابتدا میں معیارِ قصیدہ کے منافی سمجھا گیا، لیکن چونکہ ہر صنفِ شاعری میں تبدیلی ہو رہی تھی اسی لیے بعد کے قصیدہ گویوں نے اسے جدّتِ اسلوب کے طور پر قبول کیا اور برتا۔ داغ کے اکثر قصائد میں بھی اسلوب دکھائی دیتا ہے، لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ۔ داغ کے یہاں یہ اسلوب اور طرز اس خوبی کے ساتھ استعمال ہوا ہے کہ اس سے قصیدے کا بنیادی اسلوب مجروح نہیں ہوتا بلکہ اس کی شمولیت سے ان کے قصیدوں میں جوش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قصیدے میں بھی یہی خوبی پائی جاتی ہے۔

علمائے فن کا خیال ہے کہ قصیدے کا مطلع ایسا ہونا چاہیے جو قاری یا سامع کو چونکا دے اور اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اس لحاظ سے بھی یہ مطلع مناسب حال معلوم ہوتا ہے چونکہ داغ نے یہ قصیدہ والیِ دکن سے پہلی ملاقات کے موقعے پر پیش کرنے کے لیے لکھا تھا اور وہ شمالی ہند سے دکن کی جانب رخ کر رہے تھے، اسی وجہ سے مطلع اور تشبیب میں دکن کے سفر پر روانگی کا ذکر ہے، ساتھ ہی ملکِ دکن اور حیدر آباد شہر کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ شاعر مطلع میں کہتا ہے کہ جب میں ملکِ دکن کی جانب روانہ ہوا تو اس سفر میں ایسی برکت شامل ہوئی کہ ہرن کی آنکھ کا سرمہ بھی میرا ساتھی بن گیا، یعنی یہ سفر بہت مبارک اور خوش آئند ہو گیا، مطلع یہ ہے۔

میں ہوا باد یہ پیما طرفِ ملکِ دکن　　　سرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن

اس قصیدے کی تشبیب اصلاً تو بہاریہ ہے، لیکن داغ نے اس میں ایسی جدتیں پیدا کی ہیں کہ کئی دیگر

مضامین بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً ملکِ دکن کے جنگلوں اور پہاڑوں کے حسین مناظر پیش کیے گئے ہیں، اوردکن کے باغات کی بہاروں کی منظرکشی کی گئی ہے، ساتھ ہی شہر حیدرآباد کی تعریف بھی بہت جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مطلع کے بعد تشبیب کے اشعار شروع ہوتے ہیں دشت کے ہر ذرّے سے ستاروں جیسی روشنی پھوٹ رہی ہے اور ہر راستے پر کاہکشاں جیسی رونق ہے۔ پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر ماحول کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہاڑی ندّیوں کو جنت کی دودھ کی نہروں سے بہتر قرار دیا گیا ہے، اور وہاں کی نازنینوں کو حوروں سے زیادہ خوبصورت دکھایا گیا ہے:

نازنینوں کی کمر، بید کی شاخِ لرزاں	موجۂ ریگِ رواں، زلفِ پریشاں کی شکن
بسترِ قاقم و سنجاب بنا سبزۂ دشت	تکیۂ مخمل و کمخواب ہر اک خشتِ کہن
قطرۂ شبنمِ ہر خار سے گوہر بے آب	رزدرو، لالۂ کہسار سے ہر لعلِ یمن
شاخِ آہو پہ گماں پیچ و خم کاکل کا	سبزۂ دشت میں ہے سبزۂ نو خط کی پھبن
ذرّے ذرّے سے نمودار فروغِ انجم	جادے جادے سے عیاں کاہکشاں کا جوبن
خاک اس دشت میں اڑتی ہے کہ اڑتا ہے عبیر	آگے اس خاک کے مٹی اثرِ مشکِ ختن
قوتِ نامیہ اس جوش پہ اللہ اللہ	دانہ موتی کا جو بوئیں تو ہو خرمن خرمن
چوکڑی بھولے جو اس دشت کی سونگھے خوشبو	تو یہاں آہوئے تاتار کا ہو نشہ ہرن
ندّیاں کوہ کی ہیں رشک دہِ جوئے شیر	جن سے پھیکی پڑی فردوس کی بھی نہرِ لبن

تشبیب کے بیشتر اشعار میں داغ نے زبردست فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ محاوروں کا حسن استعمال اور تشبیہات اور تلمیحات کی رنگارنگی ان اشعار میں دیدنی ہے قصیدے کے تیرھویں شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اس جنگل کا پرانا درخت جب خشک ہو جاتا ہے تو وہ بالکل مردہ نہیں ہو جاتا بلکہ ریاضت کرنے والے عابد کے جسم کے مانند ہو جاتا ہے، جو بظاہر تو کمزور اور لاغر معلوم ہوتا ہے لیکن اصلاً وہ بہت توانا اور قوی ہوتا ہے۔ چودھویں شعر میں حضرت موسیٰ، طور اور وادیٔ ایمن کی تلمیح پیش کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح وادیٔ ایمن میں خدا کے نور سے ہر چیز منور ہو گئی تھی، اسی طرح اس جنگل کا بھی ہر درخت تجلّی سے منور دکھائی دیتا ہے، اسی وجہ سے شاعر یہ شبہ ظاہر کرتا ہے کہ اس دشت سے دشتِ ایمن تو متصل نہیں ہو گیا ہے۔ پندرھویں شعر میں شاعر ایک شعری روایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسی روایت کو غلط

قرار دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ حالانکہ آسمان کو سبز قدم اور منحوس تصور کیا جاتا ہے، لیکن جب اس دشت کے سبزہ و کہسار کا عکس آسمان پر پڑا تو ان کی برکت سے آسمان کی نحوست ختم ہوگئی اور اب وہ سبز اختر یعنی خوش قسمتی کی علامت بن گیا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں شعروں میں وہاں کی نازنینوں کے حسن کو پیش کرنے میں داغ نے بڑی خوبصورت لفظیات استعمال کی ہے۔۔ شاعر کہتا ہے کہ جب حوریں یہاں کی نازنینوں کو پنگھٹ پر دیکھتی ہیں تو شرما جاتی ہیں، یا ان کی غلامی پر آمادہ ہو جاتی ہیں، اور جب ثریا کی مانند یہ ایک ساتھ ہوتی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید پروین و پرن زمین پر اتر آئے ہیں۔ شعر کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ثریا کے جھرمٹ کے ساتوں ستارے یکجا ہو کر بہت حیرت سے ان نازنینوں کو دیکھتے ہیں کہ اب زمین پر بھی ہم جیسا کوئی رہنے لگا ہے۔ پروین و پرن، سات ستاروں کے نام ہیں، انھیں ثریا یا جھکا بھی کہتے ہیں۔ اب یہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

زندہ رہتا ہے تنِ عابد مرتاض کی شکل — خشک ہو کر بھی بیاباں میں یہاں نخلِ کہن

شجرِ طور کے مانند منور ہر نخل — مل گیا کیا کہیں اس دشت سے وشتِ ایمن

آسماں سبز قدم ہو کے بنا سبز اختر — عکس افگن جو ہوا سبزۂ کہسار و دمن

حوریں پانی بھریں پنگھٹ کا جو دیکھیں جمگھٹ — ہے اس انداز کا ہر ایک بتِ سیمیں تن

ایسے جھرمٹ کیے باہم ہیں ثریا تمثال — کہ زمیں پر نظر آنے لگے پروین و پرن

ملکِ دکن کے دشت و جبل کی تعریف کے بعد شاعر بڑی فن کاری سے وہاں کے باغات کی تعریف اور منظر کشی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ قصیدے کے 22ویں شعر میں مطلع ثانی کے طور پر کہا گیا ہے، اس مطلع سے باغ کی تعریف کی ابتدا ہوتی ہے اور 34ویں شعر سے شہر حیدر آباد کی تعریف ہے۔ دشت و جبل کی تعریف میں بھی موسمِ بہار کی منظر کشی کی گئی تھی، اب دکن کے باغات کی مدح میں بھی بہار کے مناظر کی مزید تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ کچھ شعروں میں داغ سودا سے بھی استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سودا اپنے لامیہ قصیدے میں لکھتے ہیں:

واسطے خلعتِ نو روز کے ہر باغ کے بیچ — آبجو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل

جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں — شاخ میں گاو زمیں کی بھی جو پھوٹے کونپل

داغ کے اس سلسلے کے اشعار یہ ہیں:

لالہ و گل نے جو پہنی ہے قبائے رنگیں — دیتی ہے خلعتِ نوروز بہار گلشن
قوتِ نامیہ اس جوش پہ اللہ اللہ — دانہ موتی کا جو بوئیں تو ہو خرمن خرمن
کیا عجب پہنچے وہاں تک اثرِ فیضِ بہار — فلسِ ماہی بھی کھلیں صورتِ گلہائے چمن

دکن کے باغات کی مدح میں کچھ اشعار اور ملاحظہ ہوں، جن میں داغ نے زبردست فن کاری کا ثبوت دیا ہے، کہیں بہاریہ آہنگ ہے تو کہیں رندانہ موضوع، اور کہیں عاشقانہ انداز، 20ویں شعر میں تشبیب کا لہجہ بدلتا ہے اور شاعر اپنے اشہب قلم کی لگام کو دشت و جبل کی مدح کے بعد دکن کے باغات اور شہر حیدرآباد کی جانب موڑ دیتا ہے:

اشہب خامۂ چالاک کی پھرتی ہے عناں — صفتِ دشت و جبل سے طرفِ شہر و چمن
وہ تراوٹ کا اثر ہے کہ دمِ سیرِ چمن — پانی دینے لگے یوسف کا یہاں چاہِ ذقن
قلقلِ شیشہ کی آواز ہے بُستاں بُستاں — توبۂ مئے پہ تقاضا ہے کہ بشکن بشکن
نو عروسانِ چمن مست ہوئے ہیں کیا کیا — کھینچتی ہے کمر سرد کو بھی شاخِ سمن
بوئیے تخم محبت کو تو پید ہو وفا — ڈالیے پرتوِ رخ کو تو اُگے سیبِ ذقن
لائے گر فصلِ خزاں کو فلکِ نیلی رنگ — نیلی پیلی ہو غضب دیکھ کے اس کو سوسن
گر یونہی فصلِ بہاری کو رہا جوشِ عروج — شاخِ طوبیٰ میں عجب کیا ہے کھلے نسترون
کس طرح دستِ حنائی نہ کرے نخلِ چنار — مینج اردی سے بہا پھرتا ہے خونِ بہمن

اس قصیدے میں داغ نے صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے کئی طرح کی جدتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ قصیدے کی تشبیب کے متعلق ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

"اس قصیدے کی تشبیب فی نفسہٖ بہاریہ ہے، لیکن اس میں داغ نے بعض جدتیں کی ہیں۔ مطلع میں انھوں نے ملکِ دکن کی طرف روانہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس تقریب سے پہلے سرزمینِ دکن کے دشت و جبل کی تعریف کی ہے۔ پھر باغ کی مدح کی ہے اور آخر میں ممدوح کے شہر یعنی حیدرآباد کی تعریف کرکے گریز کی ہے۔"(10)

داغ نے قصیدے کی تشبیب میں ایک جدت یہ بھی کی ہے کہ ممدوح کے شہر کی تعریف میں حیدرآباد کی

علمی وادبی سرگرمیوں کو بھی پیش کردیا ہے۔ داغ کی طرح ہی جلال نے بھی ایک قصیدے میں اپنے ممدوح کے شہر یعنی رامپور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، لیکن جلال کے مقابلے میں داغ کے یہاں زیادہ تفصیلات نظر آتی ہیں اس ضمن میں انھوں نے اچھی جزئیات نگاری کا مظاہرہ کیا ہے، ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

" جلال لکھنوی نے ایک قصیدے میں دربار ممدوح کی طرف روانہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور ممدوح کے شہر کی بھی تعریف کی ہے۔ لیکن داغ نے اس طرز میں زیادہ صناعی اور متانت سے کام لیا ہے...... جلال نے رامپور کی تعریف میں صرف عیش ونشاط اور رقص وسرود کی محفلوں اور حسینوں کے مجمع کا ذکر کیا ہے، جب کہ داغ نے شہر کی خوبصورتی اور لہر نہر کے ساتھ ساتھ علمی وادبی سرگرمیوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے۔" (11)

جلال لکھنوی کے کچھ اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں، جن میں انھوں نے رامپور شہر کی جانب رختِ سفر باندھنے کا ذکر کیا ہے اور پھر اس شہر کی توصیف اس پیرائے میں کی ہے کہ کوئی ناز نیں انھیں یہ خوش خبری دیتی ہے کہ والیِ رامپور نے جلال کو طلب فرمایا ہے اور وہ سر کے بل ممدوح کے شہر کی جانب چل پڑے ہیں۔

غرض میں سر کو بنا کر قدم روانہ ہوا ۔۔۔ بہ سوئے تختِ گہِ شہرِ یارِ عرش نشیں
سوادِ شہر وہ مینو سواد کہیے جسے ۔۔۔ وہ شہر جس کا ہر اک کوچہ ہے بہشت بریں
تمام شہر ہے مشغولِ بزمِ آرائی ۔۔۔ ہر اک بشر ہے خوش و خرم انبساط آگہیں
جدھر نگاہ گئی مجمع بتاں دیکھا ۔۔۔ جدھر کو آنکھ اٹھی پائے شاہدانِ حسیں
کہیں ہیں تھاپ سے طبلوں کی سامعیں مبہوت ۔۔۔ کہیں صدا سے مجیروں کی دنگ بزم نشیں
کسی کی بزم میں مجرے کو کچھ طوائف جمع ۔۔۔ نکھار جن کے ہیں آفت کے، قہر کی تزئیں

جلال کے یہ بیانات اجمالی نوعیت کے ہیں، لیکن داغ کے یہاں کیفیت مختلف ہے۔ قصیدے کے 34 ویں شعر سے داغ نے شہر حیدرآباد کی تعریف شروع کردی ہے اور اس سلسلے کے اشعار میں اجمال کے بجائے تفصیلات اور جزئیات نگاری کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ داغ کے یہ اشعار اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ انھیں علوم وفنون سے غیر معمولی دلچسپی تھی:

شہر اس شہر کا ہے نام یہی بلدہ ہے ۔۔۔ فخرِ کلکتہ و مدراس، نظیرِ لندن
ثانیِ خلد و ارم بانیِ تزئین و حشم ۔۔۔ روکشِ چین و ختن، غیرتِ بغداد و عدن
چھپ گئے سقفِ فلک یوں تہِ ایوانِ بلند ۔۔۔ تشتری ڈھانک دے جس طرح کوئی زیرِ لگن

ایسے عشرت کدے میں کیوں نہ ہو خلقت دلشاد | ایسے مامن میں نہ کیونکر ہو زمانہ ایمن
شحنۂ عدل کا وہ خوف ہے بازاروں میں | نہیں ممکن کہ جو برتن سے بھی کھڑکے برتن
ہاتھ باندھے ہوئے پھرتے ہیں یہاں دست دراز | لب سے رہتے ہیں بیہودہ سرا وقت سخن
ذی خرد اتنے ہیں، ذی فہم ہیں اتنے کہ یہاں | کیا قباحت ہے اگر ''ما'' کی جگہ بولے ''مَن''
ناظم و ناشر و فرزانہ و دانا و ادیب | عالم و عاقل و علامہ ہر اک ماہرِ فن
حیدرآباد کا بجتا ہے جہاں میں ڈنکا | نوبتیں کیوں نہ بجیں دھوم سے باون باون

گوناگوں موضوعات کی رعایت سے داغ نے اس قصیدے کی تشبیب کا الگ سے نام بھی رکھا ہے، اور کہا ہے کہ ایسی رنگارنگ تشبیب کو ''' چارچمن'' کہنا انسب ہے:

دشت و کوہ و چمن و شہر کی مداحی میں | ایسی تشبیب کو زیبا ہے کہیں ''چارچمن''

گریز کا انداز کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ روایتی ہے، لیکن اس گریز کی کچھ خوبیاں ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ گریز کی خاص خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ گریز مختصر، برجستہ اور فطری ہو، قاری کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ شاعر گریز کی طرف آرہا ہے، بلکہ بات میں سے بات پیدا ہو جائے اور گویا باتوں باتوں ہی میں گریز ہو جائے، اور جب قاری یا سامع مدح کے اشعار پر پہنچے تب اسے احساس ہو کہ شاعر تو گریز کر چکا۔ داغ کے اس قصیدے کی گریز کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ مندرجۂ بالا تمام خوبیاں اس گریز میں موجود ہیں۔ داغ نے بڑی فن کاری سے ملکِ دکن اور حیدرآباد شہر کے اوصاف گنوائے ہیں، اور ان تمام اوصاف کو بڑی خوبی اور چابکدستی سے ممدوح کی سخاوت اور اس کی حکومت کے حسنِ انتظام کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ملکِ دکن ہرگز اس قدر خوش حال نہ ہوتا اگر میرے ممدوح کے جود و سخا کی بارش یہاں نہ ہوتی:

چمن آرائے دکن خسروِ فیّاض و جواد | جس نے شاداب کیا آبِ کرم سے یہ چمن
مدح میں اس کی پڑھوں مطلعِ رنگیں ایسا | جس سے اے داغ ہو شرمندہ بہارِ گلشن

مطلعِ ثالث سے باضابطہ طور پر ممدوح کی مدح شروع ہو جاتی ہے۔ مدح میں پہلے ممدوح کی شجاعت، سخاوت، بزرگی، پرہیزگاری، تقویٰ، اصالت، شرافت، حلم و حیا، حسنِ اخلاق، عدل و انصاف، دانشمندی و مدبری کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ممدوح کی تلوار، اس کے گھوڑے اور ہاتھی کی، ساتھ

ہی فوج کثیر کی بھی تعریفیں کی گئی ہیں۔ بعض قصیدہ گویوں کے قصائد میں یہ کمی دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ اپنا تمام زور تشبیب اور گریز تک ختم کر دیتے ہیں اور اس وجہ سے مدحیہ اشعار میں یہ خوبی قائم نہیں رہ پاتی۔ داغ کے قصائد کے مدحیہ حصوں میں یہ کمزوری نہیں ہے۔ ان کے یہاں مدحیہ اشعار میں بھی وہی زور، شعریت اور اثر موجود ہے جو تشبیب میں۔ ممدوح کی جود وسخا کے متعلق قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں انھوں نے ہندوستانی اور ایرانی دونوں ملکوں کی شعری روایت سے استفادہ کیا ہے۔

وہ گہر بار ترا دستِ کرم ہے شاہا ۔۔۔ آگے اس فیض کے پانی بھرے بھادوں کی بھرن
ہُن برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور ۔۔۔ تو نے برسائے گہر فیض سے معدن معدن
جودِ سلطاں سے وہ ممنوع ہوئے طرزِ سوال ۔۔۔ زخم پھیلائے جو دامن تو بنے تردامن

ممدوح کی بزرگی، تقویٰ، پرہیزگاری اور اس کے عادل حکمراں ہونے کی صفات کو داغ نے بہ طور خاص بیان کیا ہے۔ اس سلسلے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دادگر، داد دہ و دادرس و دادرساں ۔۔۔ فخرِ دیں، فخرِ نگیں، فخرِ زماں، فخرِ زمن
پاک دل، پاک نفس، پاک نظر، پاک نہاد ۔۔۔ نیک خو، نیک سیر، نیک روش، نیک چلن
قدر داں، قدر کن و قدر فزا، قدر شناس ۔۔۔ حاکمِ علم و عمل بادشہِ فہم و فطن
آفتابِ شرف و اوجِ مہِ عز و عُلا ۔۔۔ شمع کا شانۂ دیں، اخترِ بختِ روشن
قاطعِ بغض و حسد، قامعِ بیداد و ستم ۔۔۔ بانیِ عیش و طرب، ماحیِ آلام و حزن
مجمعِ جود و سخا، مصدرِ الطاف و عطا ۔۔۔ معدنِ حلم و حیا، مخزنِ اوصافِ حسن

قصیدے کے 58ویں شعر میں داغ کہتے ہیں کہ اے ممدوح تیری عطا کا ہاتھ محالات و ناممکنات تک بھی پہنچ گیا ہے، لہٰذا کوئی بھی تیری بخشش کو مہما امکن یعنی محدود، قرار نہیں دے سکتا۔ تیری بخششیں لامحدود ہیں اور ان کے فائدے ممکنہ حدود سے باہر تک کی اشیا کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ 62ویں شعر میں شاعر ممدوح کے عدل و انصاف کے حوالے سے چیزوں پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کو دکھا رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دور میں ہر طرح کی سختی بہت کم ہو گئی ہے، یہاں تک کہ سخت چیزوں کی خاصیت بھی تبدیل ہو گئی ہے، اور وہ نرم بن گئی ہیں، مثلاً ممدوح کے عہدِ حکومت میں لوہا موم سے زیادہ نرم ہو گیا ہے۔ اگلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے ممدوح تیرے عہدِ حکومت میں دشمنی، حسد، بغض، کینہ، تکلیف، غم اور رنج

ومحن سبھی معدوم ہو گئے ہیں۔ 66ویں شعر میں شاعر ممدوح کی عقلِ سلیم کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو ایسا حکیم ہے کہ افلاطون بھی اگر اس دور میں موجود ہوتا تو وہ ضرور تجھ سے دانشوری کی باتیں سیکھتا۔ 68ویں شعر میں شاعر ممدوح کے قہر وغضب کا بیان کرتا ہے کہ تیرے غضب و غصّے کی آگ کو دیکھ کر رستم بھی گھبرا جائے اور روئیں تن اسفندیار جیسے پہلوان کا جسم بھی خوف کے مارے شمع کی مانند پگھل جائے۔ روئیں تن کے معنی ہیں پیتل یا کانسے کا جسم رکھنے والا، چونکہ اسفندیار کے جسم پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا تھا، اسی لیے اسفندیار کو روئیں تن کہا جاتا تھا۔ اگلے شعر میں شاعر ممدوح سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تیرے تمام مداح اہلِ کمال اور دانشور ہیں، وہ تجھ سے ایسی عقیدت رکھتے ہیں کہ ہمہ وقت تجھے دل اور آنکھوں میں بسائے رہتے ہیں۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ اے ممدوح اگر بلبل تیری تعریف کرنا چاہے تو اسے گلِ صد برگ یعنی گیندے کے پھول سے کم از کم سو زبانیں قرض لینی پڑیں گی، تبھی تیری اور تیری شاعری کی تعریف کا حق ادا ہو سکے گا۔ پھر کہتے ہیں کہ اے ممدوح تیرے دورِ حکومت میں مذہب واخلاقیات کی پابندی کا اس طرح رواج قائم ہو گیا ہے کہ یہاں جتنے بھی دل توڑنے والے، وعدہ توڑنے والے یا بے وفا، توبہ توڑنے والے یا گنہگار، صوم وصلوٰۃ کی پابندی نہ کرنے والے اور خدا کے نافرمان لوگ ہیں، سبھی شکستہ احوال ہو گئے ہیں:

ہاتھ ڈالا ہے محالات میں بخشش نے تری	کہہ سکے کون عطا کو تری مہما امکن
کوئی سختی کرے اس عہد میں کیا ممکن ہے	موم سے بڑھ کے ہوا نرم مزاجِ آہن
عہد میں تیرے جو معدوم ہے کیا ہے، یہ ہے	کاوش و کینہ و آزار و غم و رنج و محن
حکمت آموزِ فلاطوں ہے تری عقلِ سلیم	بات پختہ ہے تری، رائے تری مستحسن
آتشِ قہر سے رستم کا بھی ہو زہرہ آب	شمع کی طرح سے گل جائے تنِ روئیں تن
تیرے مداح ہیں سب اہل نظر، اہلِ کمال	آنکھ میں گھر ہے ترا تو ہے زباں پر مسکن
سو زبانیں گلِ صد برگ سے لے قرض ہزار	تو کرے لاکھ طرح سے وہ تری مدح سخن
ہیں ترے عہدِ عدالت میں شکستہ احوال	دل شکن، عہد شکن، توبہ شکن، روزہ شکن

قصائد کے مدحیہ حصے میں تقریباً ہر شاعر روایتی طور پر ممدوح کی تلوار، اس کے ہاتھی، گھوڑے اور فوجِ کثیر کی بھی تعریف کرتا تھا۔ داغ نے بھی اس روایت کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن دیگر متاخرین قصیدہ گویوں

سے داغ اس لیے ممتاز نظر آتے ہیں کہ انھوں نے روایت کی پیروی کرتے ہوئے بھی اکثر جگہ جدت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

74 ویں شعر سے ممدوح کی تلوار کی تعریف شروع ہوئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے ممدوح تیری تلوار کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہے، کیوں کہ یہ پہاڑوں کو بھی کاٹ دیتی ہے، یہ فوج کی صفوں کو منتشر کرنے، سروں کو تنوں سے جدا کرنے، لوہے کو کاٹنے اور البرز جیسے پہاڑ کو توڑ دینے والی ہے۔ البرز ایران کا ایک مشہور پہاڑ ہے۔

75 ویں شعر میں شاعر تلوار کی تیزی اور کاری ضرب کا بیان کرتا ہے جو ایسے دشمن کے بھی ایک ہی وار میں دو ٹکڑے کر دیتی ہے، جو مغفر، بکتر، چار آئینہ، خفتاں اور جوشن پہنے ہو۔ یہ جنگی لباس کی مختلف قسمیں ہیں۔ میدان جنگ میں فوجیں اسی لباس میں ملبوس ہوا کرتی تھیں۔ شاعری میں ان ملبوسات کا سب سے زیادہ ذکر مرثیے میں ہوا ہے۔ یہاں میر انیس کے مرثیے کا ایک بند نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میر انیس حضرت امام حسینؓ کی تلوار کی کاٹ کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آیا خدا کا قہر جدھر سَن سے آ گئی — کانوں میں الاماں کی صدا رن سے آ گئی
دو کر کے خود، زین پہ جوشن سے آ گئی — کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آ گئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی
آئی صدا زمین سے، یا بو تراب کی

76 ویں شعر میں شاعر نے ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے اور ممدوح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے تیرے ہوتے ہوئے یہاں کسی بھی انسان پر کوئی غیر ضروری بوجھ نہیں رہتا یہاں تک کہ تیری تلوار، تیرے دشمنوں کے جسم پر، سر کی شکل میں موجود بوجھ کو بھی ختم کر دیتی ہے، جو اس کے حق میں بھلائی سے کم نہیں۔ اس شعر میں شاعر نے لفظ "سبک دوشی" کے مفہوم سے فائدہ اٹھا کر خیال میں نزاکت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

منھ چڑھے کون تری تیغ کے یہ کوہ شگاف — سر شکن، صف شکن، آہن شکن، البرز شکن
ایک ہی وار میں تلوار کرے دو ٹکڑے — مغفر و بکتر و چار آئینہ، خفتاں، جوشن
اتنی حاصل ترے اعدا کو سبک دوشی ہے — تیری تلوار اڑا دیتی ہے تن سے گردن

داغ نے ممدوح کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف میں حقیقت پسندی سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور کافی توجہ سے ہاتھی اور گھوڑے کے فطری اور قدرتی اوصاف بھی پیش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی یہ رائے ہے:

''گھوڑے اور ہاتھی کی تعریف میں داغ نے کافی انہماک دکھایا ہے۔ مبالغے اور تخیل سے کام لینے کے علاوہ انھوں نے امیر مینائی کی طرح گھوڑے کے حقیقی اوصاف بھی لکھے ہیں۔''(12)

شاعر ممدوح کے گھوڑے کے متعلق کہتا ہے کہ میں تیرے پری پیکر گھوڑے کی تعریف کس زبان سے کروں کیونکہ وہ عجیب و غریب خوبیوں سے متصف ہے۔ ایک اچھے گھوڑے کے قدرتی اوصاف یہ ہیں کہ اس کا سینہ اور سم چوڑے ہوں، کمر چھوٹی ہو اور گردن لمبی ہو۔ داغ نے قصیدے کے 78 ویں شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اس کے گردن کے بال، دُم، کان، کنوتی، پٹھے سبھی بے حد خوبصورت ہیں۔ گھوڑے کی برق رفتاری کا مبالغہ آمیز بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ اگر کوئی ہکلا شخص اس گھوڑے کا نام لے لے تو اس کی زبان کی لکنت دور ہو جائے، تار برقی یعنی ٹیلی گرام کے ذریعے اس قدر تیز رفتاری سے خبریں نہیں پہنچ سکتی تھیں، اگر تار برقی میں ممدوح کے گھوڑے کے نعل کی آمیزش نہ ہوتی۔ چونکہ اسی دور میں ٹیلی گرام کی ایجاد ہوئی تھی داغ نے دوسری تیز رفتار چیزوں میں اسے بھی شامل کر لیا ہے۔ یہاں گھوڑے کی تیز رفتاری کا بیان کیا گیا ہے، سودا نے قصیدہ ''تضحیکِ روزگار'' میں گھوڑے کی سست رفتاری کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

کم رَو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا — لوہا گلا کے تیغ بناوے کوئی لہار
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ — رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کار زار

گھوڑے کی تعریف میں داغ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا ترے اسپ پری وش کی کروں میں تعریف — خوب سے خوب، خوش اسلوب سراسر ہمہ تن
سینہ چوڑا ہے، نلی چوڑی ہے، سُم چوڑے ہیں — جتنی چھوٹی ہے کمر اتنی بڑی ہے گردن
یال، دُم، پاؤں، شکم، کان، کنوتی، پٹھے — ڈھل گئے حسن کے سانچے میں سب اعضائے بدن
اللہ اللہ رے اس تیز روی کی تاثیر — نام لے اس کا تو ہو صاف زبانِ الکن
اتنی سرعت سے نہ ہرگز خبر آتی جاتی — تار برقی میں ہے آمیزشِ نعلِ توسن

گھوڑے کی تعریف میں قصیدے کے دواور مبالغہ آمیز اشعار ملاحظہ ہوں:

جست میں برق ہے، اڑنے میں پری، گشت میں چرخ ۔۔۔ پھر سبک رو صفتِ بوئے بہارِ گلشن

نہ بندھے اسپ فلک سیرِ فلک سے ہرگز ۔۔۔ گر بنے قوسِ قزح اس کی پچھاڑی کی رسن

ہاتھی کی تعریف میں داغ نے خوبصورت تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ ہاتھی کے دانتوں کے سنہری چُوڑوں (وہ بڑی چوڑیاں جو ہاتھی کے دانتوں میں سجاوٹ کے واسطے پہنادیتے تھے) اور زرد عماری (ہودج) کے لیے تشبیہیں ملاحظہ ہوں:

ہیں ترے فیل کے دانتوں پہ سنہری، چوڑے ۔۔۔ یا سرِ طور پہ کافور کی شمعیں روشن

یوں سرِ فیلِ سیہ، زرد عماری تاباں ۔۔۔ شب کو جس طرح سے ہو چرخ پہ مہ جلوہ فگن

ڈر کے رکھتا ہے قدم برجِ اسد میں خورشید ۔۔۔ دیکھ کر فیلِ شکاری کو ترے شیرِ فگن

داغ نے دو اشعار ممدوح کی فوج کی تعریف میں بھی لکھے ہیں، جن میں وہ کہتے ہیں کہ تیری فوج بڑی شان وشوکت اور ٹھاٹھ باٹھ والی ہے، فوجی ہمہ وقت سجے دھجے اور چاق و چوبند رہتے ہیں۔ تیری فوج میں دکنی، عربی، کابلی اور پنجابی سبھی علاقوں کے لوگ ہیں، لیکن وہ سب بہادری میں یکساں ہیں رشکِ بیژن تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بیژن ایران کے ایک مشہور پہلوان کا نام ہے جو گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا:

طمطراق اور تری فوج کا وہ زرق و برق ۔۔۔ لیس ہر طرح سے ہر ایک رسالہ پلٹن

دکنی و عربی، کابلی و پنجابی ۔۔۔ ہر سپاہی ترے لشکر کا ہے رشکِ بیژن

داغ قصیدے کے خاتمے پر دعا کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دعائیہ اشعار میں بھی داغ نے جدّت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہاں وہ سودا کے لامیہ قصیدے کے دعائیہ طرز کی تقلید کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ سودا نے لامیہ قصیدے کے آخر کے سولہ اشعار میں خدا کی بارگاہ میں جس انداز میں دعائیں کی ہیں، داغ بھی اس قصیدے کے دعائیہ اشعار میں اسی طرز کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔

دعائیہ حصے کی ابتدا داغ نے ان شعروں سے کی ہے:

داغ مدّاح و ثنا خوان و ستائش پیرا ۔۔۔ اس دعا پر تری کرتا ہے بس اب ختمِ سخن

جب تک آفاق میں ہو دولت وثروت کی نمود ۔۔۔ جب تک افلاک پہ ہوں اختر و انجم روشن

جب تک آوازۂ اقبال ہو آویزۂ گوش ۔۔۔ جب تک اندازۂ عشرت ہو بہ اندازِ حسن

جب تک انجام کو پہنچے فلکِ پیر کی عمر
جب تک اسلام کا ہے نام جہاں میں قائم
تو سلامت رہے، آباد رہے، شاد رہے
تیری اولاد کی کثرت ہو تری نسل سے یوں
سرخ رو داغ ہو یوں خلقِ کرم سے تیرے

جب تک آفت سے ہوں محفوظ زمیں اور زمن
جب تک اس نام سے آباد ہے یہ دیرِ کہن
زار ہو، خوار ہو، ناچار ہو تیرا دشمن
جیسے اک دانے سے پیدا ہوں ہزاروں خرمن
پرتوِ مہر سے جس طرح بنے لعلِ یمن

آخری شعر کا حسنِ طلب بھی دادطلب ہے۔

●

حواشی

1۔ داغ نے اعلیٰ پیمانے کے دو شہر آشوب بھی لکھے ہیں، یہ دونوں شہر آشوب ''شہر آشوب'' مرتبہ، ڈاکٹر نعیم احمد میں، ص۔240-246 پر موجود ہیں، پہلا شہر آشوب مخمس کی ہیئت میں ہے، جب کہ دوسرا غزل کی ہیئت میں۔

2۔ نگار، داغ نمبر، ص۔84

3۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص۔403

4۔ اردو میں قصیدہ نگاری، ص۔236-237

5۔ ایضاً، ص۔239

6۔ اردو میں قصیدہ نگاری۔ ص۔238

7۔ اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ص۔403

8۔ ''داغ'' از تمکین کاظمی، ص۔98

9۔ تزکِ محبوبیہ، جلد دوم، ص۔33، بحوالہ، داغ دہلوی حیات و کارنامے، ص۔45

10۔ اردو میں قصیدہ نگاری، ص۔237

11۔ ایضاً، ص۔237-38

12۔ اردو میں قصیدہ نگاری۔ ص۔239

●●●

C/o :- Prof. S.M. Hashim
Deptt. of Urdu
AMU. Aligarh (U.P.)
Pin - 202002

Registered with the registrar of News Paper for India RNI No.69302/98

Quarterly **Fikr-O-Tahqeeq** New Delhi

Vol. 9 October, November, December 2006 Issue-4 ☎:26103381

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Secondary and Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India, West Block - 1, R.K. Puram, New Delhi

Printed, Edited and Published by Director, National Council for Promotion of Urdu Language at J.K. Offset Printers, Delhi- 110006. and published from West Block I, R.K. Puram New Delhi. Owner NCPUL, Deppt. of Secondary and Higher Education M/o HRD. Government of India